یادگارِ جشنِ صدمین سالِ تاسیسِ دانشکدۂ خاورشناسی دانشگاہِ پنجاب

مقالاتِ منتخبہ

اورینٹل کالج میگزین

وضمیمہ

ومجلّۂ انجمنِ عربی و فارسی دانشگاہِ پنجاب

۱۹۲۵ء تا ۱۹۷۰ء

اردو

باہتمام

سیّد وقار عظیم

لاہور، ۱۹۷۰ میلادی

توضیح

اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں انجمن عربی و فارسی دانشگاہ پنجاب کا مجلہ، ضمیمۂ اورینٹل کالج میگزین کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا۔ آنیس سال بعد جب راقم نے اس کے فرائض ادارت سنبھالے تو نومبر ۱۹۵۷ء میں اس کا نام بدل کر مجلۂ انجمن عربی و فارسی دانشگاہ پنجاب رکھ دیا گیا۔ اور تا دم تحریر یہ اسی نام سے شایع ہو رہا ہے۔

گذشتہ کئی سالوں سے ان دونوں مجلات کے آن شماروں کے لئے تقاضا ہو رہا ہے جو اب ناپید ہیں۔ لہذا اس موقع پر آن ضروری اور مفید مضامین کو دوبارہ شایع کیا جا رہا ہے جو گذشتہ ۴۵ سالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ منتخبات کی زیر نظر جلد میں اردو سے متعلق مقالات شایع کئے جا رہے ہیں، جن کا انتخاب ایک کمیٹی نے سید وقار عظیم صاحب کی سربراہی میں کیا ہے۔ ان مضامین کی طباعت کی تمام تفاصیل اور جزئیات کے انصرام کی زحمت بھی سید صاحب موصوف نے برداشت کی ہے، جس کے لئے راقم آن کا بے حد ممنون ہے۔

ہر ایک مقالے کے آغاز میں مقالہ نگار کا نام اور آخر میں پہلی اشاعت کی تاریخ درج کر دی گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگاروں کی دستیاب ہونے والی تصاویر بھی پیش خدمت ہیں۔

محمد باقر

فہرست مندرجات

فہرست تصاویر

روبروی صفحہ

توضیح

اوریئنٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں انجمن عربی و فارسی دانشگاہ پنجاب کا مجلہ ضمیمۂ اوریئنٹل کالج میگزین کے نام سے شایع ہونا شروع ہوا۔ آنیس سال بعد جب راقم نے اس کے فرائض ادارت سنبھالے تو نومبر ۱۹۵۷ء میں اس کا نام بدل کر مجلۂ انجمن عربی و فارسی دانشگاہ پنجاب رکھ دیا گیا۔ اور تا دم تحریر یہ اسی نام سے شایع ہو رہا ہے۔

گذشتہ کئی سالوں سے ان دونوں مجلات کے آن شماروں کے لئے تقاضا ہو رہا ہے جو اب ناپید ہیں۔ لہذا اس موقع پر آن ضروری اور مفید مضامین کو دوبارہ شایع کیا جا رہا ہے جو گذشتہ ۴۵ سالوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ منتخبات کی زیر نظر جلد میں اردو سے متعلق مقالات شایع کئے جا رہے ہیں، جن کا انتخاب ایک کمیٹی نے سید وقار عظیم صاحب کی سربراہی میں کیا ہے۔ ان مضامین کی طباعت کی تمام تفاصیل اور جزئیات کے انصرام کی زحمت بھی سید صاحب موصوف نے برداشت کی ہے، جس کے لئے راقم آن کا بے حد ممنون ہے۔

ہر ایک مقالے کے آغاز میں مقالہ نگار کا نام اور آخر میں پہلی اشاعت کی تاریخ درج کر دی گئی ہے۔ فاضل مقالہ نگاروں کی دستیاب ہونے والی تصاویر بھی پیش خدمت ہیں۔

محمد باقر

فہرست مندرجات

فہرست تصاویر

روبروی صفحہ



مولوی محمد شفیع

مولوی محمد شفیع

مثنوی سحرالبیان
کا
ایک پرانا دیباچہ

چند دن ہوئے ایک عزیز مثنوی سحرالبیان کا مصور قلمی نسخہ میرے پاس لائے ۔ جس کے آخر میں میرزا قتیل اور مصحفی کی تاریخوں کے بعد لکھا ہے ۔ "تمام شد بوقت عصر در مسجد(۱) وزیر خان بحصار لاہور این مثنوی سحرالبیان من تصنیف میر حسن دہلوی بحسب فرمائش...... " ۔ اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔ یہ دیباچہ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کی تحریر ہے ۔ مگر دیباچہ نگار نے اپنا نام کہیں نہیں لکھا ۔ یا کم از کم اس نسخہ میں اس کا نام نہیں ملا ۔ گارساں دی تاسی نے تاریخ ادبیات ہند (طبع پیرس ۱۸۳۹ء) ج ۱: ۱۹۷ ببعد پراسی دیباچہ سے لے کر میر حسن کا حال لکھا ہے اور حاشیہ (۲ ص۱۹۷) میں لکھا ہے کہ یہ دیباچہ سحرالبیان کے مطبوعہ

---

(۱) ظاہرا کاتب کتاب وقف نامہ مسجد کی شرائط کے مطابق مسجد میں صحافت کا کام کر رہا تھا ۔ سید عبداللطیف نے اپنی کتاب "لاہور" کے ص۲۱۸ ببعد پر وقف نامہ مسجد وزیر خان نقل کیا ہے ۔ اس میں ایک شرط یہ ہے کہ : و نیز شرط کرد کہ بیست قطعہ دکاکین بیرون دروازہ شرق و بالاخانۂ آنہا محض برای نشستن صحافان کتب اسلامیہ بی کرایہ باشد علے سبیل الدوام"

نسخه میں موجود ہے پھر صفحه ۲۰۰ پر بتایا ہے که یه مثنوی ۱۸۰۵ء میں کلکته میں طبع ہوئی(۱)۔ غرض ان بیانات سے قیاس کیا جاسکتا ہے که مذکورہ بالا قلمی نسخه کلکته والے مطبوعه ایڈیشن سے لاہور میں نقل ہوا ۔

دیباچه نگار کا ذکر گارساں دی تاسی نے بھی اس طرح کیا ہے که گویا اس کو معلوم نہیں که وہ کون ہے ۔ البته خود دیباچه سے اتنا معلوم ہوتا ہے که میر حسن کے ساتھ دیباچه نگار کے دوستانه تعلقات تھے ۔ ایک ہی سرکار میں دونوں نوکر اور ایک ہی صاحبزادے کے ہمنشین تھے اور دس برس تک دن رات ایک جگه پر رہے ''بلکه اکثر آپس میں غزلیں طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں لیکن نه بطور استفادہ کے جیسا که نواب علی ابراہیم خان مغفور نے اپنے تذکرہ(۲) میں لکھا ہے ۔ صاف معلوم ہوتا ہے که میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے ۔ اگر یه بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نه تھا ہرگاہ حقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے(۳) الخ،، دیباچه کے آخر میں مؤلف نے لکھا ہے که دیباچه جان گلکرسٹ کی فرمائش سے تحریر ہوا اور مثنوی کے ساتھ ملحق کیا گیا ۔

اس عبارت سے پته چلتا ہے که نگارندہ میر شیر علی افسوس ہے چنانچه ملاحظه ہو لطف کے تذکرہ گلشن ہند (لاہور ۱۹۰۶ء)

(۱) اس ایڈیشن کی تقطیع چھوٹی اور صفحے ۱۶۶ تھے ۔ (گارساں دی تاسی) ۔

(۲) یعنی تذکرہ گلزار ابراہیم میں جو ۱۱۹۵-۹۶ھ میں تالیف ہوا (دیکھو فہرست مخطوطات اودھ مؤلفه سپرنگر ص ۱۸۱)

(۳) دیکھو ص ۶ سطر ۲ (۴) دیکھو ص ۷ س ۱۶

ص ۴۸ کی یہ عبارت (ذیل ترجمہ افسوس) : اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے اور علی ابراہیم خان مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی،، لطف نے یہ بھی لکھا ہے کہ افسوس گیارہ برس تک میرزا نوازش علی خان ولد نواب سالار جنگ کی خدمت میں ملازم رہے۔ اور گلکرسٹ صاحب اور افسوس کا تعلق تو معلوم ہی ہے۔ ان بیانات کو ملا کر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سحرالبیان کا دیباچہ **افسوس** نے گلکرسٹ صاحب کی فرمائش سے لکھا۔ اور وہ کلکتہ ایڈیشن میں طبع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سحرالبیان کی بعض ایڈیشنوں میں جو بعد میں طبع ہوئیں۔ میرحسن کا حال اسی ماخذ سے لیا گیا ہے(۱)۔ اب ہم حمد و نعت کے حصے کو حذف کرکے اس دیباچہ کو درج کرتے ہیں :

بعد اس حمد و نعت کے مثنوی سحرالبیان اسم بامسمی ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لبھانے کو موہنی منتر ہے اور ہر داستان اس کی سحر سامری کا ایک دفتر، جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طبائع کی مقبول و مرغوب ہوتی ہے راست ہے کہ اندازہ اسکا سراپا اعجاز ہے اور وہ ہر ایک صاحب طبیعت کی دمساز، تعریف اسکی جہاں تک کیجئے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی و یا اس کی بندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کی اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اس لئے کہ جہاں

(۱) مثلاً مطبع فیض مہدی لکھنؤ کی ایڈیشن میں جو اس وقت میرے سامنے ہے لیکن اس پر سن طباعت درج نہیں۔

ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بقلت شمار میں نہیں آتا اور تعرض اس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا بقول شخصے دریں مصرع:

شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست

صلے کا اس کے ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم نے ایک دوشالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچی میں نکلوا کر مصنف کو عنایت کیا ۔ رتبہ تو اس کا بڑھا پہ دل کھٹ گیا اس لیئے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا لیکن یہ کھونٹ صرف طالع کی ہے ۔ کیونکہ مال کھرا خریدار اتنا بڑا ہویا اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا بلکہ گھاٹا آیا ۔

یی چند سطرین مصنف کے حسب نسب اور احوال میں

مصنف اس کا میر حسن دہلوی متخلص بحسن خلف میر غلام حسین ضاحک کا وطن اجداد شہر ہرات، قوم سادات، گردش فلکی سے انہوں نے شہر مذکور کو چھوڑا اور دلی میں آ کر پرانے شہر کا رہنا اختیار کیا ۔ وہیں یہ بزرگ پیدا ہوا بلکہ سن تمیز کو پہنچا ۔ دادا اس عالی‌قدر کا سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا لیکن باپ او (کو؟) فضیلت نہ تھی مگر طالب‌العلمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا ۔ پر فارسی میں استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا ۔ چنانچہ یہ رباعی طبع زاد اس کی زبانی راقم نے سنی ہے

فریاد دلا کہ غمگساران رفتند
سیمیں بدنان و گلعذاران رفتند

چون بوی گل آمدند بر باد سوار
در خاک چو قطرهای باران رفتند

۲ قصیدہ بھی ایک اور اس مغفور کا رتبہ دار دیکھا ہے، لیکن هزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا (کذا) غزل کہنی ترک کی تھی قیامت هنسوڑ اور ٹھٹھول تھا ۔ تخلص اس کا اس پر دال ہی، بر ظاهر نہایت ثقہ اور متشرع، اکثر عمامہ عربی سبز سر پر بندھا رہتا تھا اور جامہ کم گھیرا مل پہتے (کذا) کاکلی میں ڈاڑھی متوسط، لبیں لی هوبں ۔ قد میانہ گندم گون لیکن میر حسن ڈاڑھی منڈواتے تھے پرجامہ نیمہ اس کا ویسا هی تھا اور پگڑی کی بندش
۵ قدیم هندوستان زادون کی سی، قد لنبا اور رنگ گندمی ۔ هر چند وضع تو ایسی تھی پر شوخ مزاج و لطیفہ گو وسی (وهبی؟) بھی تھے نہ هزل و فحاش، سوائے اس کے بردباری اور ملنساری اس کی خلقت میں تھی ۔ کسی کو میں نے اس عزیز سے شاکی نہیں پایا اور بیزار نہیں دیکھا، لیکن طبیعت اس کی موزون طفولیت میں (کذا) تھی ۔ شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا ۔ اکثر خواجہ میر درد کی صحبت سی مستفید شاہجہاناباد مین اڑکائی کے بیچ هوا ہے ۔ بعد برهم هونے سلطنت کے شہر مذکور سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبہ اودہ میں آیا اور سکونت فیض آباد میں اختیار کی ۔ علاقہ روزگار کا نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہنچایا مصاحب مرزا نوازش علی خان بہادر جنگ دام ثروتہ کا هوا ۔ مرزا موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے خدا اسے سلامت رکھے کہ اشعار سی اسے رغبت اور شعرا سے محبت ہے ۔ چنانکہ میر مذکور کو اسنے اپنا جلیس و انیس کیا تھا ۔ اور تھا بھی اسی لائق ۔ اگرچہ علم عربی مطلق اسے نہ تھا هاں

فارسیت تھی بلک جستہ جستہ شعریا کوئی رباعی کبھو کہہ بھی لیتا تھا لیکن علم مجلس میں بی بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا۔ مشق سخن اس نے اسی ملک میں میر ضیاؤالدین ضیا تخلص سے کہ ہم مشق مرزا رفیع السودا اور میر تقی کے تھے۔ سوائے ان کے میرزا مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح لی تھی چنانکہ اس کا اقرار راقم کے سامنی کیا ہے، غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے غزل رباعی مثنوی مرثیہ میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا تھا بلک سوائے قصیدہ ہے ہر قسم کی نظم پر قادر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ادا بندی کا حق آتنے خوب ادا کیا اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا، خدایش بیامرزاد۔ راقم کو اسّے دوستی دلی تھی کبھو رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں میں بھی نوکر اور اسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا، دس برس تک دن رات ایک جگہ پر رہے بلک اکثر آپس میں غزلیں طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں لیکن نہ بطور استفادہ کے جیسا کہ نواب علی ابراہیم خن مغفور نی ہے اپنی تذکرہ ہیں لکھا ہے۔ صف اسّے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا ۔ حقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے باوجود اس کے کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی - پھر کس لئے اس بات کا انکار کرتا ؟ قاعدہ بھی ہے ؟ کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں۔ لیکن جھوٹی بات پر اقرار بھی نہیں کیا جاتا اور سچی سے انکار نہیں ہوسکتا۔ آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈالا، اتفاقاً میرا روزگار سن گیارہ سی ننانوے میں صاحب عالم

مرزا جوان بخت کی سرکار میں ہوا میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا، بعد اس کے اس بزرگ کو آخری ذی حج (کذا) سن بارہ سے ہجری میں مرض الموت لاحق ہوا۔ ندان غرہ محرم کو کہ سن بارہ سو ایک شروع(۱) ہو چکے تھے اس دار فانی سے اس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خان بہادر دام ظلہ کے باغ کے بیچ مدفون ہوا۔ خداء کریم اس کو یہاں دارالسلام عطا کر دے اور وہاں قصر جنت کا اپنے فضل سے بخشے

عدم سے مسافر جو آیا ہے یاں
مقرر وہ جاویگا اک روز واں

رہے جگ میں ہرچند وہ ہر کہیں
پھر اس کا ٹھکانا ہے زیر زمیں

(اگست ۱۹۲۶ء)

---

(۱) یعنی اکتوبر ۱۷۸۶ء۔ لطف نے گلشن ہند(ص ۹۲) پر میر حسن کی وفات ۱۲۰۵ھ میں بتائی ہے۔ لیکن افسوس کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس مقام پر گارساں دی تاسی لکھتا ہے کہ تاریخوں کے معاملے میں لطف کے بیانات دوسرے تذکرہ نویسوں سے نہیں ملتے۔

اردو زبان
اور
اس کے مختلف نام

(۱) اُردو

لفظ اُردو قرن سابع ہجری کے خونین واقعات کی یاد ہمارے دل میں تازہ کر دیتا ہے۔ جب ۶۱۷ھ میں چنگیزی لشکروں نے قراقرم سے خروج کر کے اور مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر دنیا کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان میں سے ایک دستہ نے بسرکردگی چنگیز خان ترکستان۔ خراسان اور افغانستان کو تسخیر کر لیا۔ دوسرا دستہ مغرب کی طرف بڑھا۔ اور آذربائیجان، آرمینیہ و گرجستان فتح کرتا ہوا جنوبی روس میں جا کر تھما۔ تیسرے دستہ نے مشرق کا رخ کیا۔ ممالک چین ان کی تاخت و تاراج کی جولانگاہ تھے۔ اور عنقریب بعد سلطنت فغفوری ان کے زیرنگین آ گئی۔

ان وحشیوں نے اپنے خروج اور سلسلۂ فتوحات کے دوران میں انسانی خونریزی اور بلاد و امصار کی تباہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آباد شہروں کو ویران کیا۔ اور ان کے باشندوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اور ممالک کے مقابلہ میں ایران خصوصیت کے ساتھ ان کے بے پناہ غیظ و غضب کا شکار بنا۔ اس کے عظیم الشان اور



حافظ محمود شیرانی

آباد شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی - ان کی عمارات کو زمین کے برابر پست کر دیا گیا اور ان کی آبادی سپرد تیغ ہوئی ، سمرقند ، بخارا ، بلخ ، طوس ، ہرات ، نیشاپور اور خوارزم وغیرہ صرف چند مثالیں ہیں جہاں یہ خونیں واقعات انتہائی شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

یہ اس قیامت عظمیٰ کی بنا پر ہے جو نسل انسانی کی تاریخ کا سب سے زیادہ خونیں واقع ہے کہ لفظ اردو ایشیا اور یورپ کی مختلف زبانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے - یعنی اوردا اوروہ - اروہ - اوردو - اور اردو جس کے معنی فرودگاہ لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر و حصۂ لشکر ہیں - اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ، بازار لشکر، حرم گاہ - محل و محلسرائے شاہی(۱) و قلعہ(۲) پر بھی ہوتا ہے۔ اقوام مغول کسی شہری اور مدنی زندگی کی پابند نہیں تھیں - ان کو بسا اوقات جدید سبزہزاروں و چشمہ ساروں کی تلاش میں یا بضرورت جنگ و پیکار یا بغرض تاخت و غنیمت ایک مقام سے دوسرے مقام پر نقل مکان کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی- وہ اپنے گاوں اور مویشیوں کے ساتھ گاڑیوں میں سفر کرتے اور ان کے سفر کی محرک صحرائی جانوروں اور طیور کی آوازیں ہوتی تھیں جن سے شگونوں کی روشنی میں وہ اپنے خیمے برپا کرتے اور ایک مقام پر آباد ہو جاتے یا وہاں سے ترک سکونت کرتے - ہر

---

۱ - نورالابصار قلمی نوشتۂ عہد محمد شاہی مملوکۂ پروفیسر محمد شفیع،

۲ - ہابسن جابسن ص ۶۴۰ ،

خاندان کا خیمہ جداگانہ ہوتا تھا جس کو ان کی اصطلاح میں 'یورت' کہا جاتا تھا۔ یہ یورت اُون کے بنے ہوتے تھے۔ متعدد یورت کا مجموعہ دراصل 'اردو' یا 'اول' کہلاتا تھا۔ یہی اردو یا اول ان کی غیر متمدن زندگی کے مرجع و مرکز تھے۔ یہی ان کے قلعے تھے اور یہی ان کے شہر۔ سردار کا خیمہ بغرض امتیاز 'سراوردہ' یعنی اردوی مطلا کے نام سے منسوب ہوتا تھا (۱)۔

آردو کا لفظ غالباً سب سے پہلے بشکل اردا مقدسی (تقریباً۳۷۵ھ) کے ہاں ملتا ہے۔ جو ترکستان کے کسی شہر کا نام ہے(۲)۔ آردو کے نام پر ایک ترکی قبیلہ بھی ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں اس نام سے مشہور ہوا۔ اس قبیلہ کے اجداد چنگیز خان اور اس کے جانشین سلاطین کے مقابر کی تولیت سے ممتاز تھے۔ یہ مقبرے چونکہ چنگیز خان کے زمستانی اردو میں واقع تھے اس لئے ان مغولوں کی اولاد اردو کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ترکیبی حالت میں اردو قند اور آردو بالیغ دو شہروں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں اردو قند کاشغر کا مغولی نام ہے۔ آردو بالیغ، اس شہر کی بنیاد اوگتائی قاآن نے رکھی تھی۔ بعد میں قراقرم کے نام سے مشہور ہوا ۳۔ لیکن 'کدس اوردو' ان سے زیادہ قدیم نام ہے۔ جو ہماری تاریخوں میں بلاساغون کے نام سے مذکور ہے (۴)۔

۱۔ تاریخ مغول انگریزی از ہاورتھ ص ۱۰۴ جلد اول ۱۸۷۸ء

۲۔ ببلیو تھیکا جیوگر یفورم عرابیکورم جلد سوم ص۲۷۵

۳۔ جہانکشای جوینی ص ۴۰ جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو بالیغ ہی قدیم نام تھا۔

۴۔ برتھالڈ ص ۲۱۴ء

چنگیزی طوفان کے ختم ہونے پر جب ایران میں مغلی حکومت قائم ہو گئی ایرانی مورخین و مصنفین لفظ آردو فارسی زبان میں اختیار کر لیتے ہیں ۔ ان میں غالباً سب سے سابق علاء الدین عطا ملک جوینی ہیں۔ ان کی تصنیف جہانکشا میں یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے ۔ میں یہاں ایک مثال عرض کرتا ہوں :

''وخان هر وقت که عزیمت شکار بزرگ کند و وقت آن دخول زمستان باشد فرمان رساند تا لشکرها که بر مدار محط رحال و جوار اردوها باشند مستعد شکار گردند (جلد اول ص۱۹)''

اس کے بعد یہ لفظ عام ہوجاتا ہے ۔ اور جامع التواریخ ، بناکتی وصاف ، روضتہ الصفا و حبیب السیر وغیرہ میں عام طور پر ملتا ہے

یورپ میں اس لفظ کا داخلہ باتو خان بن جوجی بن چنگیز خان کے حملہ مغرب سے تعلق رکھتا ہے جس کی فتوحات مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئی تھیں ۔ اس کا صدر مقام شہر سرائے دریائے والگا پر واقع تھا اور اس کی فرودگاہ اردوی مطلا کے نام سے معروف ہوئی ۔ اردوئے مطلا کے زیر عنوان جوجی کے تمام فرزند اور مطیع قبایل شامل ہیں ۔ جن کا رسمی سردار جوجی کا خلف اکبر اوردا تھا ۔ وہ اردوی مطلا کے دست چپ کا حکمران تھا ۔ جس کو آق اوردا، یا اردوی بیضا کہتے تھے ۔ اس سے دست راست کو ممیز کرنے کے لئے جس کا افسر باتو خان تھا قق اوردایا اردوی ازرق کہتے تھے۔ لیکن باتو خان حقیقت میں اس تمام اردو کا حاکم اعلیٰ تھا ۔

ممالک مغرب میں یہ لفظ پولینڈ کے راستہ سے پہنچتا ہے ۔ اس ملک میں اوردا کے ابتدائی 'الف' کو 'ہے' کے ساتھ تبدیل

کر دیا گیا اور ہوردا بنا لیا ۔ اس شکل میں یہ لفظ یورپ کے مختلف ملکوں میں پہنچا ۔ چنانچہ جرمنی میں ہوردے ۔ سویڈن میں ہورد ۔ اطالیہ میں اوردا اندلس و پرتگال میں ہوردا ۔ فرانس میں ہوردے ۔ انگلستان میں ہورڈ بولا جاتا ہے ۔

شویلر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی اقوام فی‌زماننا اس لفظ کا استعمال بحیثیت کلمۂ تحقیر ایشیائی اقوام کے لئے کرتی ہے(۱) ۔

انگریزی زبان میں سب سے پہلا استعمال ۱۵۵۵ء ایڈن کی تصنیف ڈکیڈز میں ہوتا ہے ۔ بعد کی مثال جینکنس کے سفرنامۂ مطبوعہ ۱۵۶۰ء میں موجود ہے ۔

سر زمین ہندوستان میں اس کا رواج ظہیر الدین محمد بابر ۹۳۲ھ - ۹۳۷ھ کے زمانے سے متصور ہونا چاہئے ۔ اس عہد کی تلمیح خود اس بادشاہ کی ترکی توزک میں ملتی ہے ، اور جلال الدین اکبر کے عہد ۹۶۳ھ-۱۰۱۴ھ سے تو ہمارے مصنفین عام طور پر اس کا استعمال کو رہے ہیں ۔

لیکن طبقات ناصری مصنفۂ قاضی منہاج سراج نوشتۂ ۶۵۸ھ میں ایک‌مقام پر اور تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف میں جو تیموری حملہ کے عنقریب بعد یعنی ۸۰۱ھ کے گرد و پیش میں لکھی گئی ہے ۔ ایک ہی صفحہ میں دو مقام پر یہ لفظ نظر آتا ہے ۔ طبقات کی عبارت حسب ذیل ہے ۔

---

(۱) ترکستان جلد اول ص ۳۰ ،

''ملک شیر خان از آنجا عزیمت ترکستان کرد و بطرف اردوی مغل رفت (ص۲۷۷ طبع ایشیاٹک سوسائٹی بنگال)

لیکن طبقات کے فاضل مترجم میجر راورٹی نے اسی جملہ کے متعلق ایک حاشیہ دیا ہے - جس کا مطلب ذیل میں درج ہے -

''یہ سارا جملہ تمام نسخوں میں ناقص ہے - مشکل سے دو نسخوں میں بھی یکساں نہیں ملتا - ایک نسخہ میں لفظ ترکستان کے بعد کسی قدر مزید عبارت بھی ہے یعنی ''وہ لاہور کی طرف بڑھا - اور جس نے اسے دیکھا مرعوب ہو کر اس کے سامنے سجدہ میں جھکا [در سجدہ افتاد] (انگریزی ترجمۂ طبقات ص۷۹۳-۲)

میرے پاس طبقات کا جو نسخہ ہے اس میں یہی عبارت یوں ہے - ''ملک شیر خان ازانجاعزیمت ترکستان کرد و بطرف لوھورو و این حوالی رسید با ملک جلال الدین مسعود شاہ بن السلطان پیوست،، (ورق ۳۷۵)

اس شہادت کی رو سے عبارت بالا میں اردو کا استعمال بہت کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر عہد اکبری میں جبکہ قدیم تاریخوں میں دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے - ایک ناقص جملہ کو معنی پہنانے کے لئے کسی قدر ترمیم کر دی گئی ہو - تاریخ فیروز شاہی میں ایک جملہ یوں ہے -

''باوازۂ بذل و عطا از ہر چہار جانب خلق متوجہ اردوی او گردید،، (ص۵۳ تاریخ فیروز شاہی طبع ایشیاٹک سوسائٹی)

لیکن ایڈیٹر نے اس کا اختلافی نسخہ بھی لکھا ہے جو اس جملہ میں خلق کے بعد سے شروع ہوتاہے - یعنی

''(۳)ن - خلق تازید چاکر می شد،، ص۵۳

میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ متن کی عبارت کے مقابلے میں زیادہ چسپاں اور موزوں ہے ۔

اسی تاریخ میں اسی صفحہ پر ذیل کا جملہ بھی ملتا ہے ۔

''در هر دو لشکر اخبار مختلف مذکور می شد که خواجۂ جهان برآن قرار داده که چون لشکر سلطانی بدهلی رسد امرا که در اردوی ظفر قرین اند اتباع آنهارا دیده در پلۂ منجنیق نهاده خواهد انداخت'' ص ۵۳-۵۴

ہندوستان میں ان ایام میں اردو کے لفظ سے شناسائی ہونے کے متعلق کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئیے ۔ کیونکہ اس ملک پر مغلوں کے بار بار حملوں سے ان کے متعلق معلومات حاصل کرنیکا اشتیاق ضرور رہا ہوگا ۔ چنانچہ طبقات ناصری میں مغلوں اور ان کے مراسم و اوضاع کے مفصل حالات درج ہیں ۔ لیکن جو امر لفظ اردو کے استعمال کے متعلق ہمارے شبہ کو زیادہ تقویت دیتا ہے یہ ہے کہ ان تاریخوں کے سوا باقی تاریخوں میں یہ لفظ کہیں نظر نہیں آتا ۔ مثلاً امیر خسرو اور ضیاء برنی کے ہاں نہیں ملتا ۔ اگر رائج تھا تو ہر تاریخ میں ملتا یا جن تاریخوں میں موجود ہے ان میں عام طور پر ملتا ۔ اس لفظ کا ندرت کے ساتھ استعمال بہت کچھ اس کے خلاف ہے ۔ ''اردوی ظفر قرین'' کی ترکیب تو ایسی ہے جس کا نویں صدی کی ابتدا میں رائج ہونا قرین قیاس نہیں ۔ البتہ اکبر کے عہد میں اصطلاح کا حکم رکھتی ہے ۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا

عہد اکبری میں بلاشک و شبہ یہ لفظ ہندوستان میں عام طور پر رواج پا چکا ہے اور اس عہد کے تمام مورخ بالعموم

اس کا استعمال کرتے ہیں ۔ اکثر اوقات ترکیبی حالت میں ملتا ہے ۔ مثلاً اردوی علیا ، اردوی معلیٰ ، اردوی لشکر ، اردوی حضرت اردوی ظفر قرین ، اردوی عالی ، اردوی بزرگ وغیرہ جس سے ان کا مقصد شاہی فرودگاہ ہے ۔

تمثیلاً بعض جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں جو صرف منتخب التواریخ بدایونی و طبقات اکبری سے ماخوذ ہیں ۔

(۱) و ہر شب جمعی از لشکر او جدا شدہ نزد حضرت پادشاہ میرفتند و اردوی علیا کوچ کردہ در نیم کروہی لشکر میرزا کامران نزول فرمودند و درین شب اکثر لشکریان میرزا کامران گریختہ باردوی حضرت آمدند (ص۲۱۲ طبقات اکبری طبع نولکشور)

(۲) کابل را بمیرزا بخشیدہ و اردو را گذاشتہ بایلغار بجلال آباد کہ اردوی بزرگ بخدمت شاہزادۂ بزرگ در آنجا بود معاودت می نمایند (ص۲۳۶ منتخب التواریخ بدایونی طبع نولکشور)

(۳) شنیدہ ام کہ دران ایام کہ شاہم بیگ از اردوی معلیٰ بجونپور رفت (ص۱۳۷ منتخب)

(۴) چون حوالی موضع ہالی کہکر مقام نزول اردوی عالی گردید (ص۱۸۰ طبقات)

(۵) فرمان شد کہ دولت خان و ذریات اورا امان دادہ اموالش بقلم آوردہ بسپاہیان اردوی ظفرقرین قسمت نمایند (۱۸۳ طبقات)

(۶) برادران مشفق و یاران موافق خواہی نخواہی او را گاہی بہ نصیحت و گاہی بزجر و تہدید و ملامت و سرزنش نگاہ

میداشتند تا آنکه اردوی ظفرقرین بمستقر سلطنت رسید
(ص ۱۷۱ منتخب)

(۷) و بعد از فتح کس باردوی لشکر که در قندهار بود رفت
(۲۱۲ طبقات)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردوی ظفرقرین کا ایک مختصر بیان جس سے ہماری مراد اکبر کا لشکر بوقت کوچ و مقام ہے یہاں دیدیا جائے۔ یہ بیان آئین اکبری سے ماخوذ ہے۔

در فرود آمدن اردو

ایک ہموار قطعہ زمین جس کا طول ۱۵۳۰ گز ہوتا تھا۔ مقام شاہی و حرم سرائے شاہی کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ سب سے مقدم گلال باڑ ایک قلہ نما صدور صد گز احاطہ یا چوبیں سرا پردہ ہے جو دیوار خرگاہ کے مشابہ ہے۔ وہ سرخ پارچہ کا بنا ہے۔ نواڑ کی گوٹ لگی ہے۔ مضبوطی کی غرض سے جگہ جگہ تسمے لگے ہیں۔ آسانی کے ساتھ طے ہوسکتا ہے۔ اس کے دروازے مضبوط اور تالے کنجی سے لیس ہیں۔ اس کے پورب میں ایک دوسرغہ(۱) بارگاہ ہے جس کے ۵۴ حصے ہیں۔ ہرحصہ ۲۴×۱۴ گز طول و عرض میں ہے۔ وسط میں ایک بڑی چوبیں راوٹی(۲) ہے۔ جس کے دس ستون ہیں۔ اور چاروں طرف سراپردے لگے ہیں۔ اس سے

(۱) دو سرغہ یعنی دو چوبہ جس کے صرف دوستون ہیں

(۲) اس میں چوکیوں کا فرش ہوتا تھا۔ دس ستون اور دو دروازے ہوتے تھے۔

ملحق ایک دو آشیانہ چوبیں محل(۱) ہے جس میں بادشاہ سلامت صبح کے وقت عبادت کرتے نظر آتے ہیں ۔ محل کی عورتیں بغیر اجازت اس میں داخل نہیں ہوسکتیں ۔ زاں بعد چوبیس چوبی راوٹیاں ۱۰×٦ گز کے طول و عرض میں کھڑی ہیں ۔ جو قناتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں ۔ ان میں حرم شاہی کی مخدرات رہتی ہیں ۔ ان کے علاوہ متعدد خیمے اور تنبو اور ہیں جو خاص خاص بیگمات کے لئے معین ہیں ۔ زردوزی مخمل کے ان کے سائبان ہیں ۔ ان سے متصل ٦۰ گز طول و عرض کا ایک گلیم سرا پردہ ملتا ہے ۔ جس میں مختلف خیمے لگے ہیں یہاں اردو بیگیاں (اردا بیگنیاں) اور دیگر ملازم عورتیں رہتی سہتی ہیں یہاں سے لے کر دولت خانۂ خاص تک ڈیڑھ سو گز کے طول اور سو گز کے عرض میں ایک فراخ میدان ہے ، جس کا نام مہتابی ہے ۔ اس کے دونوں طرف پردے تن رہے ہیں جنکے ساتھ دو دو گز کے فاصلے پر چھ چھ گز لمبے بانس جو گز گز بھر زمین میں گڑے ہیں ، پیوست ہیں ۔ بانسوں کے سرے پر برنجی لٹو یا قبے لگے ہیں ۔ بانس باہر اور بھیتر سے ڈوریوں سے بندھے ہیں اور پہرے والے متعین ہیں ۔ مہتابی کے وسط میں ایک بڑا چبوترہ ہے ۔ جس پر چار چوبہ نمگیرہ(۲) کا سائبان ہے ۔ بادشاہ سلامت

(۱) اس کی دو منزلیں ہوتی تھیں ۔ پہلی منزل کے چھ چھ گز لمبے ۱۸ ستون ہوتے تھے ۔ اس کی ہئیت مجموعی بارہ دری سے ملتی جلتی ہے ۔ بالائی منزل کے ستون صرف چار چار گز لمبے تھے ۔ اس کی شکل چوبیں راوٹی سے ملتی ہے ۔ دوسری منزل پر جانیکے لئے سیڑھی لگی ہوتی تھی ۔

(۲) نمگیرہ شامیانہ کی طرح ہے اور چار چوب پر قائم ہے ۔ دائیں اور بائیں طرف سے دو دو ڈوریوں سے چوبیں بندھی ہیں ۔

شام کے وقت یہاں تشریف لاتے ہیں اور خاص خاص لوگوں کو سلام کی اجازت ہوتی ہے ۔ گلال باڑ سے ملحق ایک اور احاطہ ہے جو بارہ حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ ۳۰ گز طول میں ہے ۔ مزید براں دہ گزی چوبین راوٹی اور چالیس زمین دوز کمرے ہیں جن پر دوازدہ گزی بارہ شامیانے سایہ کئے ہیں اور قناتوں کے ذریعے سے جدا جدا ہیں ۔ اس احاطے کا نام ایچکی ہے ۔ ہر کمرے سے ملحق 'صحت خانہ، ہے ۔ بادشاہ سلامت نےطہارت خانہ کے لئے یہ نام تجویز کیا ہے ۔ ایچکی کے ساتھ ایک سرا پردہ ہے جو ایک سو پچاس گز عرض و طول میں ہے اور حسب معمول چوب اور قبوں سے مزین ہے ۔ اس کے وسط میں بارگاہ بزرگ ایستادہ ہے جس کو ایک ہزار فراش کھڑا کرتے ہیں ۔ اس کے بہتّر در ہیں اور اس میں دس ہزار آدمیوں کی نشست کی گنجائش ہے ۔ بارگاہ کی چوب پندرہ گز بلند ہے ۔ اس کے گرد و پیش میں ایک خیمہ نما قلندری محیط ہے ۔ جو موم جامہ کی بنی ہے تاکہ بارش اور دھوپ سے بارگاہ کا کپڑا خراب نہ ہو ۔ بارگاہ کے گردا گرد دوازدہ گزی پچاس شامیانے سایہ انداز ہیں ۔ اس بارگاہ کا نام دولت خانۂ خاص ہے ۔ اس کے بھی دروازے اور پٹ موجود ہیں ۔ یہاں جلیل القدر امرا اور افسران سپاہ حسب الحکم سلام کو حاضر ہوتے ہیں ۔ ہر ماہ اس کے متعلق تجدیدی احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ بارگاہ اندر باہر سے خوبصورت اور رنگین فرش و فروش سے آراستہ ہے ۔ اور باغ سدا بہار کا حکم رکھتی ہے ۔ بارگاہ سے علیحدہ ۳۵۰ گز کے طول میں ایک اور احاطہ ہے جس کے گرد ڈوریاں کھنچی ہیں اور تین تین گز کے فاصلے سے چوبیں گڑی ہیں ۔ احاطے کے گرد سپاہی

پھرے پر کھڑے ہیں ۔ اس کا نام دیوان خانۂ عام ہے ۔ دیوان خانۂ عام کے خاتمے پر شصت گزی، بارہ طناب کے فاصلے پر نقار خانہ ہے ۔ اور اس وسیع میدان کے وسط میں آکاس دیا ایک بہت بڑی فانوس کی شکل میں ۴۰ گز بلند ستون پر جل رہا ہے ۔

محولۂ بالا بیان بادشاہی دولت سرا اور حرم سرا سے تعلق رکھتا ہے، جس کے ساتھ مہتابی و دیوان خاص و عام شامل ہیں ۔ اس کیمپ کی تین طرف یعنی عقب، دست راست و دست چپ میں ۳۶۰ گز زمین خالی چھوڑ دی گئی ہے، جس پر چوکیداروں کے سوا کوئی غیر شخص قدم نہیں رکھ سکتا ۔ یہاں سو گز کے فاصلے پر جانب قول مریم مکانی، گلبدن بیگم دیگر شہزادیوں اورشہزادہ دانیال کے خیمے نظر آتے ہیں ۔ دست راست پر شہزادہ سلطان سلیم اور دست چپ پر شہزادہ سلطان مراد کے خیمے لگے ہیں ۔ شاہی فرودگاہ کے متوازی دونوں بازوؤں پر شاہزادہ سلیم کے دست راست و شہزادہ مراد کے دست چپ پر بیوتات پھیلے ہوئے ہیں ۔ حویج خانہ، نان با خانہ ۔ مطبخ، رکاب خانہ، میوہ خانہ، تنبول خانہ، شربت خانہ اور آبدار خانہ، سلیم کی طرف ہیں اور آفتابچی خانہ، خوشبو خانہ، توشک خانہ، خیاط خانہ، کراکراق خانہ، چراغ خانہ اور مشعل خانہ، مراد کی سمت میں ہیں ۔ نقار خانہ کے ایک طرف دفتر خانہ اور دوسری جانب زین خانہ ہیں ۔ شاہی کیمپ کے چاروں گوشوں سے چار بازار شروع ہوتے ہیں ۔ دست چپ کے گوشے والے بازار کے متوازی اندرونی جانب اصطبل، داروغۂ اسپاں، مشرف اسپاں وغیرہ کے ڈیرے ہیں ۔ دست راست کے گوشے والے بازار کے بالمقابل اندرونی سمت میں سکھ پال، بہل خانہ، توپ خانہ اور چھتہ خانہ ہیں ۔ سب سے آخر میں، بجانب قول، چوکیداران پنجشنبہ

و جمعہ و شنبہ ہیں ۔ دست راست پر چوکیداران یک شنبہ و دوشنبہ اور دست چپ پر چوکیداران سہ شنبہ و چہار شنبہ ہیں ۔ ان سے بعد علی قدر مراتب، امرا کے خیمے شروع ہوتے ہیں، جو اپنے متبعین اور حشم کے ساتھ مقیم ہیں ۔ یہ متحرک شہر جو درحقیقت کئی میلوں میں بسا ہوا ہے، شہنشاہ اکبر کا اردوئی ظفر قرین ہے ۔

اس امر کی دلیل کہ اکبر نے اپنے لشکر کا نام اردوئی ظفرقرین رکھا تھا، ہمارے پاس یہ ہے کہ اس نے اپنے لشکر کی ٹکسال کا نام اردوئی ظفر قرین رکھا تھا ۔ ذیل میں اس کا بیان دیا جاتا ہے :

اردوی ٔ ظفرقرین

ہندوستان میں سفری ٹکسال سے سکہ لگانے کی رسم ظہیر الدین بابر کے عہد سے وجود میں آئی ۔ بابر اپنی لشکری ٹکسال کو 'اردو' کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اس ٹکسال کا ایک نقرئی درم، ضرب ۹۳۷ھ، لاہور میوزیم میں محفوظ ہے جس پر عبارت ذیل منقوش ہے :

''السلطان الاعظم و الخاقان المکرم ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ ضرب اردو،،(۱)

میں نے صرف دوسرے رخ کی عبارت نقل کی ہے ۔ پہلے رخ پر حسب معمول کلمہ ہے ۔

(۱) فہرست مسکوکات شاہان مغلیہ مخزونہ پبلک میوزیم لاہور ص ۳، جلد دوم،

اکبر کی لشکری ٹکسال ''اردو ظفرقرین،، یا ''اردوی'' ظفرقرین ، جو خال خال موقعوں پر 'اردو، بھی کہلائی ہے ، سونے چاندی اور تانبے کے سکے ضرب کرتی رہی ہے ۔ ان میں سب سے قدیم ایک مدور طلائی مہر ہے جس کی تاریخ ۹۸۴ھ ہے ۔ اشرفی ھذا انڈین میوزیم کلکتہ کے قبضے میں ہے اور میوزیم کی فہرست مسکوکات جلد سوم (۱) ص ۱۴ پر بذیل ۱۰۰ مذکور ہے ۔ اس کی عبارت بخط نستعلیق(۲) حسب ذیل ہے ۔

رخ اول : لاالہ‌الااللہ محمدرسول‌اللہ (وسط میں) بصدق ابی بکر بعدل‌عمر، بحیاے عثمان ، بعلم علی۹۸۴ (ہر چہار جانب)

رخ دوم : جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی ۔ ضرب اردوی ظفرقرین ۔

اس ٹکسال کے اکثر ایسے سکے ہیں جن پر تاریخ 'الف، یعنی ایک ہزار مرقوم ہے ۔ اس سے مراد سال ھجرت نہیں ہے بلکہ وہ ھزار سالہ مدت مراد ہے جو شیوع اسلام سے لیکر ۹۹۰ھ پر ختم ہوتی ہے ۔ گویا اس میں رسالت کی وہ مدت شامل کر لی گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے مدینے کی طرف ھجرت کرنے سے

---

(۱) فہرست مسکوکات انڈین میوزیم کلکتہ جلد سوم (سلاطین مغل) از نکلسن رائٹ ۔

(۲) ھندوستان میں مسکوکات پر خط نستعلیق کا رواج اسی عہد سے تصور کرنا چاھئے ۔ اس لحاظ سے بھی یہ اشرفی غالباً قدیم ثابت ہوگی ۔ اکبر کے الٰہی سکوں پر جو ۳۰ھ جلوس سے چلتے ہیں، نستعلیق بالالتزام ملتا ہے ۔' لیکن کامران مرزا والیٔ کابل، سب سے پہلا شخص ہے جس کے سکوں پر نستعلیق کو سب سے اول جگہ ملتی ہے ۔

قبل مکے میں گذاری ہے۔ اس رسالت کی مدت دس سال ہے۔ اس لئے اگر ۹۹۰ھ کے ساتھ جو الفی سکوں کی ضرب کا سال ہے، رسالت مکہ کے دس سال جمع کر لئے جائیں تو کل مدت اشاعت اسلام اس وقت تک ایک ہزار سال ہو جاتی ہے۔ اور لفظ 'الف، یہی مدت ظاہر کر رہا ہے۔ اس زمانے میں بقول بدایونی، شہنشاہ اکبر نے ان لوگوں کے اثرات میں جو اس کے عبادت خانے میں شامل ہوتے تھے اور جو اس کو ایک جدید مذہب کی ترویج پر مائل کر رہے تھے، مذہب اسلام سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ یہ اس شہنشاہ کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ ایک ہزار سال کے اختتام پر دین اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے اکبر نے اپنے جلوس کے اٹھائیسویں سال کی ابتدا میں جو ۱۵ صفر ۹۹۰ھ کے مطابق ہے، جشن نوروز و سال نو منانے کے بعد جو اٹھارہ روز تک رہا، سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ سکوں پر تاریخ الف بغرض اظہار خاتمۂ دین اسلام لکھی جایا کرے۔

میرا یہ بیان بدایونی کے ذیل کے بیانات پر مبنی ہے:

''و چون در زعم خویش مقرر ساختند کہ ہزار سال از بعثت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ مدت بقائے این دین بود، تمام شد و ہیچ موانعے برائے اظہار دواعی خفیہ کہ در دل داشتند، نماند و بساط از مشایخ و علما کہ صلابت و مہابت داشتند و ملاحظۂ تمام ازانہا بایستی نمود، خالی ماند، بفراغ خاطر در صدد دواعی ابطال احکام و ارکان اسلام و بر بست ضوابط و قواعد نو مہمل و مختل و ترویج بازار افساد اعتقاد در آمدہ، اول حکمی کہ فرمودند این بود: در سکہ تاریخ الف نویسند،،
(ص ۱۳۸۔ منتخب التواریخ)

بدایونی کا دوسرا بیان حسب ذیل ہے:

و تاریخ هجری عربی را تغیر داده ابتداء آن از سال جلوس گرفتند که نهصد و شصت و سه بود و ماهها را بر رسم ملوک عجم که در کتاب نصاب مذکور است اعتبار کردند و عیدها نیز موافق اعیاد زردشتیان در سالے چهارده قرار داده شد و عیدهای مسلمانان و رونق آن شکست مگر برای خاطر خطبهٔ جمعه که پیران مفلوک ناشناس رفته باشند و آن را سال و ماه الهی نامیدند و در تنکها و مهرها تاریخ الف(۱) نوشتند باین اعتبار که مشعر باشد

(۱) یہاں بدایونی کو کسی قدر سہو ہو گیا ہے ۔ الفی سکوں کا اجرا اور سنہ الہی کی ترویج ایک ہی وقت کے واقعے نہیں ہیں بلکہ مقدم و موخر ہیں ۔ الفی سکوں کی اشاعت کے وقت اکبر دین اسلام سے برگشتہ نہیں ہوا تھا ۔ کیونکہ اس کے تمام سکوں میں جن میں الفی سکے بھی شامل ہیں ، کلمہ شریف و اسمائے اصحاب اربعہ بدستور درج ہیں ۔ البتہ الہی سکوں کی ضرب کے وقت جو غالباً سال بتیس جلوس میں جاری ہوتے ہیں ، یہ انقلاب پیش آتا ہے کہ سکوں کی عبارت بالکل بدل دی جاتی ہے ۔

الفی سکے اکبر کے سب سے آخری سکے ہیں جن میں کلمہ موجود ہے اور شاید عوام الناس میں یہ سکے اسی بنا پر زیادہ مقبول رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کثرت سے ساتھ ملتے ہیں ۔ لوگ انھیں تبرک کے طور پر رکھتے ہیں اور ان کی نسبت عجیب و غریب خواص مانتے ہیں ۔ مثلاً مریضوں کو ان کا پانی پلایا جاتا ہے ۔ عورتوں کو درد زہ کی شدت کے وقت بھی یہی پانی دیا جاتا ہے ۔ ہندو اور مسلمان اس عقیدے میں شریک ہیں بلکہ ہندو زیادہ مانتے ہیں ۔ عوام میں یہ سکے کلمہ کے روپیوں کے نام سے مشہور ہیں ۔ یہ مقبولیت دیکھ کر بلوچیوں نے اچھی خاصی تجارت قائم کر لی ہے ۔ یہ لوگ ہر سال ہزاروں سکے بناتے ہیں اور ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں بیچ آتے ہیں ۔ ناواقف کلمہ کا روپیہ سمجھ کر

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴ پر دیکھئے)

از انقراض دین محمدی صلی‌اللہ علیہ وسلم کہ بیش از ہزار سال نخواہد بود و عربی خواندن و دانستن آن عیب شد (ص ۲۷۰ منتخب التواریخ ، نولکشور)

گویا اس ماحول میں الفی سکے رواج پاتے ہیں اور چونکہ کثرت کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں ، اس لئے گمان گزرتا ہے کہ تاریخ الف کے سکے کئی سال تک برابر ضرب ہوتے رہے جو اردوی ظفر قرین کی ٹکسال کا نتیجہ ہیں ۔ کیونکہ اکبر کی باقی ٹکسالیں جو تعداد میں ساٹھ سے بھی زیادہ ہیں ، بدستور سال ہجری اپنے اپنے سکوں پر دکھا رہی ہیں ۔

طلائی اور نقرئی سکے بالعموم مربع ہوا کرتے ہیں اور عبارت ذیل ان پر منقوش ہوتی ہے ۔

رخ اول : لاالہ الااللہ محمد رسول‌اللہ ۔ بصدق ابوبکر ، بعدل عمر، بحیای عثمان، بعلم علی ۔

رخ دوم : جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد‌اللہ تعالی ملکہ ضرب اردو ظفر قرین ۔

دیکھو نمونہ نمبر ۱ طلائی و نمبر ۲، ۳، ۴ نقرئی و ۵ ربع روپیہ ۔ مسی سکوں پر جو 'دام' کہلاتے تھے یہ یہ الفاظ مکتوب تھے :—

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳)

خرید لیتے ہیں ۔ کلمہ کے سکے اکبر کی اور ٹکسالوں کے بھی موجود ہیں اور دیگر سلاطین کے بھی لیکن یہ احترام صرف الفی سکوں کو حاصل ہے گویا یہ جواب ہے اکبر کی دہریت کا جو اس کی رعیت نے دیا ہے ۔ کیونکہ ان سکوں کی حرمت قدیم سے چلی آتی ہے ۔

رخ اول : ''فلوس الف ضرب''

رخ دوم : ''اردو ظفر قرین''

سنہ الٰہی کی ترویج کے بعد یہ عبارت ہوتی تھی -

دام ضرب سن ۳۶ الٰہی -

رخ اول : ''فلوس اردو'' -

رخ دوم : ''ظفر قرین ۳۶ الٰہی'' - دیکھو نمونہ نمبر ۱۰

دام ضرب سن ۳۸ الٰہی -

رخ اول : ''ضرب فلوس اردو'' -

رخ دوم : ''ظفر قرین سن ۳۸ الٰہی'' دیکھو نمونہ نمبر ۱۱

دام ضرب سن ۳۹ الٰہی -

رخ اول : ''ضرب فلوس اردوی'' -

رخ دوم : ''ظفر قرین سن ۳۹ الٰہی'' دیکھو نمونہ نمبر ۱۲ -

اکبری دام ایک تولہ آٹھ ماشہ اور سات سرخ وزن میں ہوتا تھا - اس کا مضاعف تنکہ کہلاتا تھا - چنانچہ ٹکا اب بھی دو پیسوں کے لئے بولا جاتا ہے - دام کی پھر مختلف تقسیمیں تھیں - مثلاً پون دام - نصف - ربع اور ہشتم حصہ جس کو دمڑی بھی کہا جاتا تھا - دمڑی دام کی سب سے چھوٹی تقسیم تھی - اس پر عبارت ذیل ہوتی تھی -

رخ اول : ''ضرب فلوس'' -

رخ دوم : ''ظفر قرین'' - ملاحظہ ہو نمبر ۱۳ و نمبر ۱۴ -

اردو ظفر قرین کے ایسے طلائی اور نقرئی سکے بھی موجود ہیں جن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے - ان کی عبارت الفی سکوں

کے مطابق ھے - صرف یہ فرق ھے کہ ان میں لفظ 'الف' داخل نہیں ھے (ملاحظہ ھو نمبر ۱۵ و نمبر ۱۶) انھیں میں ایک مدور نصف روپیہ قابل ذکر ھے جس کے رخ اول پر حسب معمول کلمہ وغیرہ ھے اور دوم پر یہ الفاظ ھیں :

جلال‌الدین محمد اکبر بادشاہ غازی - اردو ظفر قرین (ملاحظہ ھو نمبر ۱۷) -

یہ یاد رھے کہ اردو ظفر قرین ایک سفری ٹکسال ھے اور اس کا کام اسی وقت جاری ھوتا ھے جب کہ بادشاہ سفر میں ھو - جہاں سفر ختم ھوا اور باشاہ سلامت دارالسلطنت پہنچ گئے، اس ٹکسال کا کام بند ھوگیا -

اکبر کے جانشین نورالدین جہانگیر ۱۰۱۴ھ و ۱۰۳۷ھ کے عہد میں یہ ٹکسال موجود تھی اور خالی آردو کے نام سے یاد کی جاتی تھی - لیکن یہ سکے بے حد نادر ھیں - اب تک صرف دو سکے دریافت ھوئے ھیں - جہانگیر کا شوق، فنون لطیفہ و شعر کے ساتھ اس کے سکوں سے بھی نمایاں ھے - اس کے اکثر مسکوکات پر اشعار درج ھیں - چنانچہ ان دونوں سکوں پر بھی شعر موجود ھیں -

ان میں پہلا سکہ ایک روپیہ ھے جو ۱۰۲۵ھ مطابق سن ۱۱ جلوس کا ھے اور لکھنؤ میوزیم میں موجود ھے - شعر ذیل اس پر نقش ھے :

به آردو سکه در راه دکن زد شاه بحر و بر
شهنشاه جهان شاه جهانگیر این‌شاه اکبر (۱)

---

۱ - انگریزی فہرست مسکوکات پبلک میوزیم لکھنؤ جلد دوم (سکہ جہانگیری نمبر ۱۲۸۰) -

دوسرا سکہ ایک اشرفی ہے جو برج حمل (۱) کی تصویر کی حامل ہے اور سال ۱۰۳۶ھ موافق سال بست و دوم جلوس کی ضرب ہے - مسٹر نیلسن رائٹ کے قبضے میں ہے - یہی اشرفی برلن میوزیم میں بھی ہے - یہ شعر اس پر منقوش ہے :

باد رواں تاکہ بود مہر و ماہ
سکۂ اردوی جہانگیر شاہ(۲)

شاہجہان ۱۰۳۷ھ و ۱۰۶۸ھ کا صرف ایک نثار(۳) ضرب ''اردوی ظفر قرین،، معلوم ہے جس کا ذکر فہرست پبلک میوزیم لاہور میں (ص-لط) ملتا ہے -

اورنگ‌زیب عالمگیر ۱۰۶۸ھ و ۱۱۱۸ھ کا اکثر حصۂ عمر

---

۱ - جہانگیری سکوں کا یہ سلسلہ جس میں دوازدہ بروج کی تصویریں ہوا کرتی تھیں ، سکہ شناسان ہند کی رائے میں ہندوستانی مسکوکات میں سب سے بہتر اور خوبصورت مانا گیا ہے - یہ سلسلہ زیادہ تر آگرہ اور احمد آباد کی ٹکسالوں کا مشہور ہے جس میں طلائی و نقرئی سکے شامل ہیں - باقی ٹکسالوں کے نمونے کم ملتے ہیں -

۲ - نیومسمٹک سپلیمنٹ حصہ اول - ص - ۵۰۳ - ۱۹۰۴ء -

۳ - نثار اگرچہ شکل میں سکّے کی طرح ہوتا ہے لیکن سکہ رائج کی فہرست میں داخل نہیں تھا - وہ سلاطین کی آمد کی تقریب پر مسکوک ہوتا تھا اور شہر میں سواری کے داخلہ کے وقت نثار کر دیا جاتا تھا - فقرا و مساکین اس کو لوٹ لیا کرتے تھے - نثار پر لفظ ''نثار،، نام پادشاہ و تاریخ و نام شہر نقش ہوتا تھا - بڑے نثار روپیہ، کے برابر ہوتے تھے - چھوٹے اس کے نصف یا ربع ہوتے تھے - جہانگیر، شاہجہان، عالمگیر و فرخ سیر کے نثار مختلف میوزیموں میں موجود ہیں -

اردو میں گزرا ہے مگر اس کی اردو ٹکسال کا کوئی سکہ اب تک دریافت نہیں ہوا ۔ اس لئے ہم خیال کرتے ہیں کہ اس عہد میں اردو ٹکسال کا رواج ترک ہو چکا تھا ۔

لفظ اردو لشکر کا عام خطاب ہونے کی بنا پر بوجوہ کثرت استعمال کئی مرکب الفاظ کی ایجاد کا باعث بنتا ہے ۔ مثلاً قاضی اردو، اردو بیگی ، اردو کا مندر اور اردو بازار وغیرہ ۔

قاضی آردو

پرانا نام قاضی العسکر یا قاضی لشکر ہے ۔ اسلام میں قضاء عسکر ایک قدیم منصب ہے ۔ صلاح الدین ایوبی ۵۶۴ھ و ۵۸۹ھ کے عہد میں یہ منصب موجود تھا ۔ اس کے قاضی عسکر کا نام بہاء الدین تھا ۔ عہد اکبری میں یہ عہدہ دار قاضی اردو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔ اس قاضی کے فرائض میں اور امور کے علاوہ جنگ و غنیمت کے موقعوں پر لشکر کے طرز عمل کی نگہداشت بھی شامل تھی ۔ خلاف شرع کاروائیوں پر وہ روکتا اور ٹوکتا تھا ۔ حتیٰ کہ بشرط دیانت و تقویٰ خود پادشاہ کے مخالف شرع احکام پر بھی اعتراض کرتا تھا ۔ عبارت ذیل میں قاضی اردو قاضی طوایسی کی موقوفی کا ذکر ہے ۔ اس موقوفی کا باعث قاضی کا وہ احتجاج ہے جو اس نے بعض اسیران جنگ کے بارہ میں کیا تھا ، جن کے لئے شہنشاہ اکبر نے گردن مارنے کا حکم دیا تھا ۔ اور قاضی مذکور نے بادشاہ کے اس حکم کو غیر شرعی بیان کیا تھا ۔

”و در واقعۂ قتل اسیران مردم خان‌زمان چون قاضی طوایسی[۱]

---

۱ ۔ طوایس من توابعات خراسان (منتخب التواریخ ص ۳۰۶ نولکشور ۱۸۶۸ء) ۔

قاضی اردو که بصفت دیانت و حق‌گوئی و امانت اتصاف داشت، بعرض رسانیده بود که کشتن این جماعه بعد از جنگ و تصرف در اموال ایشان حسب شرع شریف جائز نیست ۔ از وی رنجیدند و قاضی یعقوب ساکن کڑہ را که بعلم فقه و اصول فقه مشهور و داماد قاضی فضیلت شیر شاهی که او را قاضی فضیحت می گفتند و با این همه خالی از مطائبه و هزلے نبود انتخاب کرده بجای قاضی طوایسی نصب کردند ۔ (منتخب التواریخ ص ۵-۱۶۶ نولکشور) ۔

اردو بیگی یا اورده بیگی

همیں اردو بیگی یا اورده بیگی کے منصب کی اصلی کیفیت سے قرار واقعی اطلاع نہیں ہے ۔ میرزا حیدر دوغلت اپنی تاریخ رشیدی میں قراپاشا میرزا ایک امیر کو خاندان اردو بیگی کا سرپرست بیان کرتا ہے(۱) ۔ آئین اکبری سے مفہوم ہوتا ہے کہ اردو بیگی شاہی محل سرا میں ایک اونچی قسم کی ملازمه ہوتی تھی ۔ چنانچه فقرۂ ذیل میں یه نام ملتا ہے ۔

”و پیوست آن بطول و عرض شصت‌گز کلیم سرا پرده ایستاده کنند و خیمۂ چند در آن ترتیب یابد ۔ اردو بیگیان و دیگر زنان پارسا را آرامش‌جا باشد(۲)“ ۔

---

۱ ۔ انگریزی ترجمۂ تاریخ رشیدی از ڈاکٹر ڈینی سن راس ص ۳۰۷ ۔

۲ ۔ آئین اکبری مرتبۂ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ صدر امین ضلع بجنور ص ۳۲ مطبع اسماعیلی واقع دهلی ۱۲۷۲ھ ۔

فرہنگ نورالابصار میں مرقوم ہے :

''اوردہ بمعنی خانہ و خانۂ بادشاہ آمدہ و ازان است اطلاق اوردہ بیگی بر زنانے کہ در خانۂ بادشاہ اہتمام دارند'' ۔(۱)

گذشتہ صدی یعنی مغلوں کے آخر فرمانرواؤں کے دور میں دیکھا جاتا ہے کہ اوردہ بیگی مردانہ لباس میں ہوتی تھی ۔ سر پر پگڑی، کمر مین پٹکا یا سیلا باندھتی اور جریب ہاتھ میں رکھتی تھی ۔ محلسراؤں میں بادشاہ اور بیگموں کی چاکری بجا لاتی تھی۔ اردو زبان میں اوردہ بیگی کا اردا بیگنی بنا لیا گیا تھا ۔ جن کی جمع اردا بیگنیاں ہے ۔ جمع کی حالت میں اس لفظ کا زیادہ رواج ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس نام کا اطلاق ایک جماعت پر ہوتا تھا۔ یہاں بزم آخر سے ایک مثال نقل ہے :

''کہاریاں ہوا دار لائیں ۔ بادشاہ سوار ہوئے ۔ اردا بیگنیاں مردانے کپڑے پہنے ، سر پر پگڑی ، کمر میں دوپٹے باندھے جریب ہاتھ میں لئے اور حبشنیاں ، ترکنیاں ، قلماقنیاں جریب پکڑے تخت کے ساتھ ساتھ ہیں'' ۔ (۲)

فرہنگ آصفیہ میں اس کی تشریح میں لکھا ہے :

''مردانہ لباس کی ہتیار بند عورت جو شاہی محلوں میں پہرا چوکی دیتی ہے'' ۔

اردو کا مندر

اس موقعے پر جینی فرقے کے ایک مندر کا ذکر کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے جس کا نام اردو کا مندر ہے ۔ اور قلعۂ دہلی کے

۱ ۔ نسخۂ قلمی مملوکہ پروفیسر محمد شفیع ۔

لاهوری دروازه کے قریب واقع ہے ۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شاهجہان بادشاہ کے عہد میں تیار ہوا تھا اور دهلی میں جینیوں کے مندروں میں سب سے قدیم ہے ۔ بروایت مشہور یہ مندر ان جینی سپاہیوں نے تعمیر کیا تھا، جو شاهجہاں کی فوج میں ملازم تھے ۔ گویا خود مندر کا نام، اس کے بانیوں کا تعلق اردوی شاهجہانی(۱) سے ظاہر کر رہا ہے ۔ اس عمارت کے بابت یہ قصہ شہرت حاصل کر چکا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ عالمگیر نے اس مندر میں نوبت بجانے کی ممانعت کر دی ۔ جینیوں نے شاہی حکم کی تعمیل میں نوبت موقوف کر دی ۔ لیکن یہ ساز بغیر انسانی هاتھ کے لگے ایک حیرت خیز طریقے سے خود بخود بجتا رہا ۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع بادشاہ کے گوش گزار کردی گئی ۔ عالمگیر کو یقین نہیں آیا اور اصل واقعہ کی تفتیش کی غرض سے بذات خود موقعے پر آیا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نوبت بغیر کسی انسانی هاتھ کی امداد کے آپ سے آپ بج رہی تھی ۔ یہ فوق‌العادت معرکہ دیکھ کر بادشاہ نے اپنا امتناعی حکم واپس لے لیا ۔ اور پجاریوں کو نوبت بجانے کی اجازت دے دی (۲) ۔

اردو بازار

بازار هر عہد میں مشرق لشکروں کا ایک ضروری عنصر تھا۔

---

۱ ۔ ایسا معلوم هوتا ہے کہ اردو بازار یا اس کے قریب میں واقع هونے کی بنا پر اردو کا مندر کہلایا ۔

۲ ۔ واقعات دارالحکومت دهلی از بشیرالدین احمد جلد دوم ص ۲۰۶ ۔ ۱۹۱۹ء ۔

ایک پرانا حوالہ لطائف الطوائف میں سلطان سنجر اور رشید وطواط کے قصے میں ملتا ہے، جو حسب ذیل ہے:

"سلطان فرمود که رشید را پیدا کنند۔ بعد از تفحص بلیغ اورادر گوشۂ یافتند و خبر بسلطان آوردند ۔ حکم کرد او را بر سر اوردوی بازار برند و ہفت پاره کنند"۔

ایک مغربی حوالہ ۱۵۶۰ء کا ھابسن جابسن میں ص ۶۳۰ پرٹیزیرو کی تصنیف سے منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

یہ لوگ اس مقام (یا پڑاؤ) کو اوردو بازار کہتے ہیں۔ (طبع ۱۸۲۹ء باب ہفدہم ص ۳۵)

ھندوستان میں یہ اصطلاح مغلوں کے عہد سے رائج ہے اگرچہ کوئی قدیم تحریری سند مجھ کو معلوم نہیں ہے۔ نورالابصار میں جو عہد محمد شاہی کی ایک فرہنگ ہے، 'اوردو' کی تشریح میں بیان ذیل ملتا ہے:

"بازاریکه نزدیک بخیمۂ بادشاهی همراه باشد بنا بر قرب خیمه اطلاق کنند"

اس عہد کی ایک اور سند جو نادرشاہ (۱۱۴۸ھ و ۱۱۶۰ھ) کے لشکر سے متعلق ہے اور اردو بازار اور افسر بازار کی مجمل کیفیت پر روشنی ڈالتی ہے، ایک انگریز تاجر سیاح ایران کی تالیف میں ملتی ہے ۔ ذیل میں اس کا ترجمہ ھدیۂ ناظرین ہے:

"لشکر کا وہ حصہ جو ترکی زبان میں اردو بازار یا بازار لشکر کہلاتا ہے ۔ چوکی خانہ کے سامنے والے چوک

سے شروع ہوتا ہے اور طول میں نصف میل تک پھیلا ہوا ہے ۔ یہ بازار ایک گلی کی طرح خیموں کی دو طرفہ قطار پر شامل ہے اور بخط مستقیم سیدھا چلا گیا ہے ۔ جہاں تک کہ زمین کی حالت اجازت دیتی ہے ، اس کی نگہداشت ایک افسر کے سپرد ہے جو ''اردو بازاری'' کہلاتا ہے ۔ بغرض امن دن میں کئی مرتبہ وہ بازار کی گشت لگاتا ہے ۔ جہاں کہیں جھگڑا فساد ہوتا دیکھتا ہے۔ فریقین کو داروغہ بازار کی خدمت میں بھجوا دیتا ہے'' ۔

اسی صدی کی ایک اور مثال ہیر وارث شاہ میں بصورت ''اردو بازار'' ملتی ہے :

''ترا طور کچھ ہور دا ہور جاپے خوار خجلاں دا چشم چاردانی
وارث شاہ کچھ رخت وہاج لیئے ہوما ہے کھلا اردبازار دانی(۱)''

''ارد بازار'' اصل میں اردو بازار ہے جو اس تصنیف میں کئی موقعوں پر مستعمل ہوا ہے ۔

۱۰۵۸ھ میں شاھجہان بادشاہ نے نئی دھلی تعمیر کی ۔ اس کی تاریخ اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے :

شد شاھجہان آباد از شاھجہاں آباد

اس سے پیشتر سال گذشتہ میں قلعۂ دھلی تیار ہوچکا تھا ۔ قلعۂ دھلی کا مغربی دروازہ جو چاندنی چوک کو جھانکتا ہے اور شہر پناہ کا مغربی دروازہ (جو تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک

(۱) ہیروارث شاہ ص ۱۸۲ طبع شیخ برکت علی شوکت علی کشیری بازار لاھور ۱۹۲۶ء۔

دوسرے سے ہیں) دہلی اور لاہور کی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے لاہوری دروازہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے - ان دروازوں کے مابین شہر کا بازار خاص واقع تھا جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شروع ہو کر سارے شہر کو چیرتا ہوا شہر کے مغربی دروازۂ لاہوری پر ختم ہوتا تھا - زمانۂ حال میں اس بازار کے مختلف حصے مختلف ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں - مثلاً کوتوالی ، گھنٹہ گھر ، چاندنی چوک ، فتح پوری اور کھاری باولی - اس بازار کا قلعے کی طرف والا حصہ گذشتہ صدی کے وسط میں اردو بازار کے نام سے موسوم تھا - اس کے متعلق سر سید احمد خاں اپنی تصنیف آثار الصنادید میں تحریر فرماتے ہیں :

"اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں - مگر اگلے زمانہ میں یہ بازار لاہوری بازار یا اردو بازار کہلاتا تھا . . . . یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازہ سے فتح پوری تک ہے - اس بازار کے پہلے حصہ کو تو اردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے ، وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے . . . . اور اس کے آگے فتح پوری کا یہ بازار ہے - چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز ادھر - بیچ میں سر تا سر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے دو دستہ درخت لگے ہوئے ہیں" -

لیکن اکبر شاہ ثانی ۱۲۲۱ھ و ۱۲۵۳ھ کے عہد کی ایک

تصنیف سے جس کے ایک نسخہ نوشتہ ۱۲۲۶ھ کے چند اوراق میرے پاس ہیں اور جوشہر دہلی کی عمارات و کتبات و شوارع کے ذکر پر مشتمل ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ اردو بازار سارے بازار کا نام تھا ۔ اس کی عبارت یہ ہے :

"بازار اردو کہ پیش دروازۂ مرقوم قلعۂ مبارک است از لاہوری دروازۂ قلعہ تا لاہوری دروازۂ شہر پناہ" ۔

یہ نامعلوم مصنف پورے بازار کی اکثر مگر چیدہ چیدہ عمارات کا ذکر کرتا ہے ۔ پہلے بازار کے شمالی بازو کو تفصیلاً بیان کرتا ہے ۔ پھر جنوبی بازو کو لیتا ہے ۔ اس بازار کا مفصل حال جیسا کہ ۱۲۳۶ھ میں وہ تھا ، یہاں بیان کرنا اگرچہ خالی از دلچسپی نہیں ہے لیکن میں بخوف طوالت اس سے دستکش ہوتا ہوں اور صرف دو ایک امور کا ذکر کرتا ہوں ۔

مصنف کے بیان کے مطابق کوتوالی چبوترہ کے سامنے ایک اونچا لکڑا گڑا تھا، جس کا نام "لعل خان لکڑ" تھا ۔ مجرموں کو اس کے ساتھ باندھ کر پیٹا جاتا تھا ۔ کچھ عرصہ قبل تک یہاں ایک چرخ یا شکنجہ بھی تھا ، جس کے ذریعے سے خونیوں کو سزا ملتی تھی ۔ بازار کے جنوبی سمت میرزا اشرف بیگ کا شیش محل تھا جس کے قریب اسی میرزا کا گھڑیال تھا ۔ چاندنی چوک کے وسط میں حوض فیض نہر تھا جو اب گھنٹہ گھر کا محل وقوع ہے ۔

گذشتہ صدی کے پہلے ربع میں اگرچہ تمام بازار اردو بازار کے نام سے موسوم تھا لیکن شاہجہاں کے اواخر عہد کے ایک کتبے سے جو کٹرۂ میدہ‌گراں کے دروازے پر مزید پارچہ کے قریب کھاری باولی

میں نصب تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا سارے بازار پر اس وقت اطلاق نہیں ہوتا تھا ۔ یہ کتبہ جو خاصہ دراز ہے، درحقیقت محمد معروف المخاطب بہ خواص خان کا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے خان موصوف نے اپنی تمام جائداد یعنی چند منزل کٹڑے، حویلیاں، دکانیں، حمام، چند قطعات باغ اور زمین مع پندرہ منزل دیگر دکانات کے اپنی بہن کے نواسے، محمد اسماعیل کی تولیت میں، برائے مصارف آثار شریف و تبرکات و عرس مولود نبی کریم و درس علوم دینی و مسجد جامع و خانقاہ مبارک، وقف کر دی تھی ۔ اس کتبے میں کھاری باؤلی کو ''گزر لاہوری دروازہ'' کے نام سے عبارت ذیل میں یاد کیا گیا ہے ۔ چنانچہ :

''واقع اندرون شہر پناہ گزر لاہوری دروازہ نزدیک مزید پارچہ مقرر کرد'' ۔

اس سے یہ امر تو صاف ظاہر ہے کہ اس عہد میں اس بازار کا کوئی خاص نام نہیں تھا ۔ علی ہذا محمد وارث جو عہد شاہجہانی کا مورخ ہے اور اپنی تاریخ میں اس بازار اور اس کے دونوں چوکوں کا ذکر کر رہا ہے اور کسی قدر اس کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے، کسی خاص نام سے اس کو یاد نہیں کرتا ۔ اس لئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو بازار کا استعمال خواہ تمام بازار کے لئے خواہ اس کے ایک حصے کے واسطے، اس عہد سے بعد کا معاملہ ہے جو عالمگیر کے عہد میں کسی وقت ظہور میں آتا ہے ۔ اس زمانے کی ایک سند ہمیں تاریخ منتخب اللباب خافی خان میں ملتی ہے، جو ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے :

''تاآنکہ روزے بادشاہ بنماز جمعہ تشریف می آوردند از در

قلعۂ مبارک تا مسجد جامع آن قدر ہنود فراہم آمدہ بقصد استغاثہ سر راہ خلد مکان گرفتند و اژدہام نمودند کہ راہ تردد مردم مسدود گردید و صرافان و بزازان و کل کاسبان اردو بازار و جمیع اہل حرفۂ شہر ترک کسب و پیشہ نمودہ بمرتبۂ مابین راہ جمع آمدند کہ بعد سوار شدن بادشاہ باوجود فرمودن اہتمام از روی زجر کہ سر و دست و پای جمعے شکست رسیدند، سواری خاص تا مسجد متعذر گردید،،
(ص ۲۵۵) -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ''اردو بازار،، پورے بازار کے لئے مستعمل تھا - بعد میں اس حصۂ بازار کے لئے مخصوص ہو گیا جو قلعے کی جانب سے شروع ہو کر خونی دروازہ پر ختم ہوتا ہے - مسٹر کار اسٹیفن اپنی تالیف مونیومینٹل ریمینز آف ڈیہلی (یادگار اثریات دہلی) میں لکھتے ہیں ، جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

> ''بازار کا وہ حصہ جو قلعے کے لاہوری دروازہ اور دریبہ کے دروازہ معروف بہ خونی دروازہ کے مابین واقع ہے، اردو بازار یا لشکر کا بازار کہلاتا ہے غالباً اس بنا پر کہ قلعے کی مقامی فوج کا ایک دستہ کسی وقت وہاں مقیم رہ چکا ہے(۱) - ،،

یہ بازار یا اس کا اکثر حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تباہ ہو گیا ہے - اس کے متعلق ایک تلمیح میرزا اسداللہخاں غالب

(۱) ص ۲۳۶ ، ۱۸۷۶ء -

کے ایک خط میں جو میر مہدی کے نام ہے مذکور ہے اور تلمیحی فقرہ یہ ہے :

”واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں، دلی کہاں ؟ واللہ اب شہر نہیں کمپ ہے چھاؤنی ہے،،(۱) ۔

میں نے اس بازار کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر مصنفین اس بازار کے نام پر ہماری زبان کا نام آردو رکھ رہے ہیں جو بظاہرایک بے قرینہ اور ناموزوں بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں لشکر کی بنا پر جس کو اردو بھی کہا جاتا تھا ، زبان کا نام اردو کہا جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور بعض بزرگوں کی رائے بھی یہی ہے ۔ لیکن اکثریت اس کے خلاف ہے ۔ ان کےنزدیک بازار کی بنا پر زبان کا نام آردو رکھا گیا ۔ اس بارے میں ہر مصنف کی رائے مختلف ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ اردو بازار دہلی کی وجہ سے یہ نام ملا ۔ بعض نے اس میں تعمیم کر دی ہے اور بازار لشکر پر قناعت کی ہے ۔ پھر ایک گروہ ایسا ہے جو شاہجہانی لشکر کے ساتھ زبان کی ایجاد منسوب کرتا ہے ۔ میں بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ ان مختلف رایوں کو ذیل میں درج کردوں۔ سب سے پیشتر، صاحب ظہیر الانشا کی رائے نقل کرتا ہوں جس میں زبان اردو کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے :

”چون بازار را در ترکی و فارسی اردو گویند، ضرورت استعمال این زبان مرکب در بازارہا ضرور تر شد خصوصاً در بازار

(۱) اردوی معلیٰ غالب طبع اکمل المطابع ۱۸۸۴ء۔

خاص بادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوئے معلیٰ قرار یافت۔ تا این کہ بانقراض ازمنہ آن تخصیص آداب شاہی باقی نماند، آن التزام لفظ معلیٰ ہم نماند۔ فقط اردو باقی ماند۔ پس وجہ تسمیۂ اردو ہمین است (منقول از جلوۂ خضر)،۔

اس بیان کی رو سے اردو بازار تعظیماً اردوی معلیٰ کہلاتا تھا۔ لیکن اردو بازار کے بیان میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی۔ لشکر کے لئے اردوے معلیٰ کا خطاب اکبر کے عہد سے مستعمل رہا ہے۔ لیکن میر امن بھی اس بازار کو اردوے معلیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ :

''جب حضرت شاہجہان صاحب قران ثانی نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اورشہر پناہ تعمیر کروایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا ، تب شاہجہان آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جدی ہے۔ وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔ اور وہاں کے بازار کو اردوی‌معلیٰ خطاب دیا۔ (باغ و بہار ص۳)،،۔

سر سید احمد خاں کتاب آثارالصنادید میں لکھتے ہیں :

''اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے۔ گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان کا نام اردو پڑ گیا،،۔

میرزا قادر بخش صابری اپنے تذکرۂ گلستان سخن میں کہتے ہیں :

''جو کہ یہ لوگ اردوے معلیٰ سلاطین کے متعلقین سے تھے، اہل ہند ان الفاظ کو زبان اردو کہتے تھے - یعنی یہ الفاظ جو ہماری زبان میں مل گئے ہیں، سلاطین اردو کی بولی ہیں - لیکن رفتہ رفتہ یہ زبان تازہ کہ مجموع الفاظ ہندی و لغات السنۂ مختلفہ سے باہم پہنچے تھے، زبان اردو کے اسم سے مسمیٰ ہوگئی - ''

(ص ۶۵ تذکرۂ گلستان سخن طبع ۱۲۷۱ھ = ۱۸۵۴ء)

عبدالغفور خان بہادر نسّاخ، رسالہ در تحقیق زبان اردوی معلیٰ موسوم بنام تاریخی زبان ریختہ، میں یوں رقم طراز ہیں :

''معلوم ہو کہ زبان اردو کو اردو کیوں کہتے ہیں - اس کی وجہ تسمیہ کو بعضوں نے اس طرح پر لکھا ہے کہ زبان فارسی و ترکی میں اردو لشکر کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ زبان لشکری و حضوری، ایستادگان پائے تخت شاہی کی زبان پر جاری ہوئی اس لئے اس زبان کا نام آردو پڑ گیا - '' (ص ۲ - زبان ریختہ - طبع نولکشور ۱۲۷۳ھ)

خزینۃالعلوم فی متعلقات المنظوم میں منشی درگاہ پرشاد گویا ہیں :

''حتّیٰ کہ شاہجہان کے عہد دولت میں اردو بازار کی جو قلعہ کے نیچے تھا ، اردو زبان مقرر ہوئی'' - (خزینۃالعلوم ص ۵۲ طبع منشی گلاب سنگھ ۱۸۷۹ء)

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی رائے آبحیات میں یہ ہے :

''ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں - اردوی شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے - وہاں کی بولی

کا نام اردو ہوگیا ۔ اسے فقط شاہجہان کا اقبال کہنا چاہیے
کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب
مشہور ہوگئی۔،، (آب حیات ص ۲۰—۲۱، ۱۸۸۱ء)

زبان اردو کی تاریخ میں منشی چرنجی لال کا خیال ہے :

''چونکہ لشکر کے بازار کو اردو کہتے تھے اس وجہ سے
اس بازار کی بولی کا نام بھی آردو ہوگیا،،۔
(ص ۳۶ مطبع رضوی دہلی ستمبر ۱۸۸۳ء)

سید احمد مصنف فرہنگ آصفیہ کا عقیدہ ذیل میں درج ہے :

''چونکہ اول اول شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی لہذا اس
کا نام بھی اردو پڑ گیا۔ قلعۂ معلیٰ کے لاہوری دروازے کے
سامنے اردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا
جو بلاق بیگم کے کوچے اور چاندنی چوک کی سڑک کے
جنوبی پہلو پر واقع تھا۔،، (دیباچۂ فرہنگ آصفیہ)

ایک امر قابل لحاظ ہے کہ بارھویں صدی ہجری میں یعنی
محمد شاہ (۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ) کے دور میں اردوی معلیٰ خاص معنوں
میں مستعمل ہو رہا ہے ۔ اس کے ذیل میں نہ صرف لشکر داخل
ہے بلکہ درباری لوگ و دیگر اراکین و ملازمین شاہی بھی
شامل ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اہل سیف و اہل قلم کی جماعتیں
اس میں محسوب ہیں ۔ خان آرزو غرایب اللغات میں جو اردو الفاظ
پر ایک رسالہ ہے، اور عبدالواسع ہانسوی کے رسالۂ ہندی لغات
کی ایک اضافہ شدہ و اصلاح یافتہ اشاعت ہے ، لفظ چھنال کی تشریح
میں کہتے ہیں :

''چھنال در رسالہ زنے کہ سر از خانہ بیرون کند و چون

کسی بیند باز پس شود ۔ لیکن چھنال معلوم نیست کہ لغت کجاست ۔ ما مردم کہ از اہل ہندیم و در اردوی معلیٰ می باشیم نشنیدہایم و ظاہرا چھنال بمعنی مطلق زن بدکار آمدہ،، ۔

اردوے معلیٰ سے خان صاحب کی مراد غالباً شہر دہلی کی آبادی کا وہ حصہ ہے جو قلعۂ معلیٰ کے قرب و جوار میں، بوجوہ ملازمت شاہی، زیادہ آباد ہے اور جس میں فوجی و منصبدار و درباری و دیگر ملازمین و شاگرد پیشہ شامل ہیں ۔ یہ لوگ شہر کے دیگر محلوں اور آبادی کے مقابلے میں زیادہ شستہ و مہذّب تھے اور ظاہر ہے کہ اس طبقے کی زبان زیادہ صاف اور ستھری ہوگی ۔

سید انشاء اللہ خاں اپنی تالیف دریاے لطافت میں قریب قریب اسی رائے کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ :

،،بعد تامل بقدر سلیقہ و فہم این ہیچ مدان چنیں معلوم میشود و غالب کہ راست باشد کہ زبان شاہجہان آباد، زبان اشخاص قابل، مصاحبت پشیہ، دربار رس و گویائی زنان پری پیکر و کلام اہل حرفہ از مسلمانان و گفتگوی شہدہہا و الفاظ خدم و تبع از قبیل شاگرد پیشۂ امرا است تا خاکروب ہم داخل ہمین جماعت باشد ۔ این مجمع ہرجا کہ برسد اولاد آنہا دلی وال گفتہ شوند و محلۂ ایشان محلۂ اہل دہلی و اگر تمام شہر را فراگیرند، آن شہر را آردو نامند لیکن جمع شدن این حضرات در ہیچ شہری سوای لکھنؤ نزد فقیر ثابت نیست ۔ گو باشندگان مرشد آباد و عظیم آباد بزعم خود خود را اردو دان و شہر خود را اردو دانند زیرا کہ شاہجہان آبادیان

بقدر یک محله در عظیم آباد جمع باشند و در وقت نواب صادق علی خان عرف میرن و نواب قاسم علی خان عالیجاه همین قدر در مرشد آباد یا زیاده،، ۔

(ص ۷۰–۷۱ دریاے لطافت انجمن ترقی اردو)

یا اردوی معلی سے مقصد محض لشکر ہے کیونکہ زبان اردو سے مراد زبان لشکر ہے ۔ وارستہ جو بہار اور خان آرزو کا معاصر ہے اپنی کتاب مطلع السعدین تصنیف ۱۱۶۸ھ میں مجدالدین علی قوسی شوستری کے حوالہ سے لکھتا ہے :

''لهذا مجد الدین قوسی شوستری در کتاب لغت(۱) خود که مسوده آن بخط خودش بنظر این بے سواد رسید ''پهلوی از عالم زبانے که در اردوی معلی بادشاهی بدان متکلم باشند،، نوشته، بل گروهے برین رفته اند که پهلوی و دری یکے است چه دری زبان مردم درگاه ملوک است و پهلوی زبان اردو،، ۔

بهر حال لشکر یا بازار یا خدم و حشم شاہی کی بنا پر یہ زبان ابتدا میں اردوی معلی کہلائی ۔ لیکن یہ خیال کہ شاہجہان کے عہد سے اس زبان نے رواج پایا قرین قیاس نہیں ۔ کیونکہ یہ شاہجہان کے عہد سے قبل موجود تھی ۔ اور اردو کا استعمال زبان

(۱) مجدالدین قوسی کی تصنیف سے مراد فرہنگ قوسی ہے ۔ اس کتاب کی تاریخ تالیف سے ہم ناواقف ہیں ۔ لیکن اس کے حوالے کتاب عین عطا تالیف ۱۱۶۲ھ و سراج اللغتہ خان آرزو تالیف ۱۱۴۷ھ میں ملتے ہیں ۔ بلاخمین اپنے مضمون فارسی لغات میں (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۶۸ء ص ۲۶ اس کا ذکر کرتا ہے۔

کے تعلق میں شاھجہان کے عہد سے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اور سید محمد تقی میر، شاعر مشہور، پہلے شخص ہیں جو اس لفظ کا استعمال بمعنی زبان ریختہ کرتے ہیں۔ تذکرۂ نکات الشعراء میں جو بقول شروانی(۱)عہد احمد شاہ (۱۱۶۱ھ و ۱۱۶۸ھ) کی تالیف ہے۔ میر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوی معلیٰ شاھجہان آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نشدہ،، ۔ (ص ۱ نکات الشعراء سلسلہ انجمن ترقی اردو)

میر صاحب کے بعد محمد حسین عطا خان تحسین المخاطب بہ مرصع رقم ہیں ۔ جب وہ فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوئے تو ایک روز انہوں نے امیر خسرو کی چار درویش فارسی کے مجوزہ ترجمے کا ایک حصہ نواب وزیر کو سنایا ۔ اس نے بہت پسند کیا اور کتاب کی تکمیل کی فرمائش کی ۔ مؤلف نے ہمہ تن مصروف ہو کر اس کام کو سر انجام دیا ۔ یہ کتاب جس کا نام نو طرز مرصع تھا، نواب کی خدمت میں پیش ہونے والی تھی کہ ۱۱۸۸ھ میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا ۔ تحسین کچھ عرصہ خاموش رہا، بعد میں دیباچۂ کتاب میں ایک قصیدہ بمدح نواب آصف الدولہ داخل کر کے کتاب مذکور نواب کی خدمت میں پیش کی(۲) ۔ یہ واقعہ ظاہر ہے کہ

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ نکات الشعرا از حبیب الرحمان شروانی ص ۲

(۲) پروفیسر بلوم ہارٹ،فہرست مخطوطات ھندوستانی،(انڈیا آفس لائبریری) میں کتاب پیش کرنے کا سال ۱۷۸۰ء ۱۱۹۳ھ خیال کرتے ہیں ۔

آصف الدولہ کی نوابی کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہوگا۔ نو طرز مرصع کا فقرہ جس میں ''زبان اردوی معلیٰ'' مذکور ہے حسب ذیل ہے:

''اور یہ کہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوی معلیٰ کا رکھتا ہو مطالعہ اس گلدستۂ بہارین کے سے ہوش و شعور فحوای کلام کا حاصل کرے''۔

اس عہد کے اکثر مصنفین زیادہ تر اردوی معلیٰ لکھنے کے عادی ہیں۔ یہاں چند اور حوالے ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں:

''بعد از چندے باسعادت علی نام سیدے کہ از امروھہ بود بر خوردم۔ آن عزیز مرا تکلیف موزون کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوی معلیٰ پادشاہ ہندوستان و در آن وقت رواج داشت، کرد۔ خود کشی کردم و مشق خود بمرتبۂ رسانیدم کہ موزونان شہر را مستند شدم''۔

(ذکر میر تالیف ۱۱۹۶ھ ص ۶۷، طبع انجمن ترقی اردو)

''کہ شما زبان دکنی را گذاشتہ، ریختہ را موافق اردوی معلیٰ شاھجہان آباد، موزون بکنید''۔ (قدرت)

''محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا، ماخذ طوطی نامہ ضیاءالدین بخشی ہے۔ زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوی معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطی نامہ رکھا''۔

(سید حیدر بخش حیدری از طوطا کہانی تالیف و طبع ۱۲۱۵ھ)

''اور اب اس عصر میں شاہ عالم بادشاہ کے مطابق سن بارہ سے پندرہ اور اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خان نے جو

متخلص بہ اشک ہے ۔ بموجب خواہش مسٹر گلکرائسٹ صاحب عالیشان والا مناقب کے واسطے نو آموزن زبان ہندی کے اس قصے کو زبان میں اردوے معلیٰ کے لکھا تاکہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے۔ (داستان امیر حمزہ از خلیل علی خاں)

بعد کے اردو نگار لفظ معلیٰ ترک کرکے صرف 'زبان اردو' لکھتے ہیں ان میں سب سے مقدم شیخ غلام ہمدانی مصحفی، شاعر مشہور، ہیں ۔ ذیل میں ان کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں ۔

(۱) البتہ مصحفی کو ہے ریختے میں دعوی\
یعنی کہ ہے زباندان اردو کی وہ زبان کا

(۲) خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی\
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس موقعے پر ہمیں لاہور کے پیروں کے خاندان کے ایک فرد، پیر مراد شاہ کا تذکرہ کرنا چاہئے ۔ یہ اپنے والد ماجد، پیر کرم شاہ کی معیت میں ۱۱۹۶ھ میں ہندوستان گئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام کیا ۔ والد کی وفات کے بعد پیر مراد شاہ نے ایک منظوم خط ۱۲۰۳ھ میں یاران وطن کے نام ارسال کیا ہے اس خط سے دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں :

برائے تحفۂ یاران آن سو\
گہرہا آرم از بازار اردو

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے\
کہ جس کا قائل اب سارا جہان ہے

باقی حوالے بقید تاریخ یہاں عرض کئے جاتے ہیں :۔

۱۲۱۵ھ ۔ "ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا

کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر،، (باغ اردو از میر شیر علی افسوس ۱۲۱۵ھ)

۱۲۱۷ھ ۔''حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے،، (باغ و بہار میر امن ص۴)

۱۲۲۰ھ ۔''ختم شد اردو ترجمہ تاریخ شیر شاہی بہ تاریخ ۵ جمادی‌الاول ۱۲۲۰ھ،،

۱۲۲۱ھ ۔''اپنے رتبے میں گو ہر ایک زبان
حسن ترتیب سے رکھے ہے شان
ان میں سے ہر زبان اردو کی
ہے لطافت میں معدن خوبی،،

(صرف اردو منظوم از مولوی امانت اللہ) ۔

۱۲۱۳ھ ۔''بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و برجی وغیرآن،، (دریائے لطافت از انشا)

۱۲۳۵ھ ۔''رسالۂ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرہ میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں،،۔

مغربی مصنفین میں مسٹر گلکرائسٹ پہلے شخص ہیں جو اپنی انگریزی تالیف قواعد زبان ہندوستانی، طبع ۱۷۹۶ء (مطابق ۱۲۱۰ھ) میں اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے کا ترجمہ یہ ہے:۔

''ریختہ وہ مخلوط زبان جس کو اوردو یا دربار کی شستہ زبان بھی کہتے ہیں،،۔ (ص ۲۶۱)

اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ لفظ عام رواج میں آجاتا ہے اور زبان کے دوسرے پرانے نام مثلاً ہندی و ریختہ متروک الاستعمال

ہونے لگتے ہیں ۔

قبل اس کے کہ یہ مضمون اختتام تک پہنچایا جائے، میں ایک اس کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جناب حکیم شمس اللہ قادری لفظ اردو (بمعنی زبان) کے لئے رسالۂ اردوی' قدیم میں ایک بڑی قدامت کے مدعی ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ مغلوں کی آمد سے قبل یہ لفظ بمعنی لشکر و زبان ہندوستان میں استعمال ہورہا ہے ۔ اپنے بیان کی تائید میں حکیم صاحب نے مؤید الفضلا کے ایک فقرے سے استناد کیا ہے ۔ میں انہی کے الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں :

''مؤید الفضلا سے (جوفارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اسلامی لشکرگاہیں اردو کہلاتی تھیں اور زبان اردو کو اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ کتاب مذکور میں ایک مقام پر تحریر ہے :-

''در زبان اہل اردو خون خرابا نامند،،

بقول بلاخمین کتاب موید الفضلا ۹۲۹ھ میں تالیف ہوتی ہے۔ حکیم صاحب نے جو فقرہ نقل کیا ہے نولکشور کی مطبوعہ مؤید الفضلا ۱۸۹۹ء سے ماخوذ ہے ۔ لیکن نولکشوری نسخہ ایک ایسے نسخے پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ ۔ ۱۰۱۴ھ) کے عہد کے بعد بظاہر تیار ہوا ہے ۔ اس میں سینکڑوں ایسے الفاظ موجود ہیں جو قلمی نسخوں میں نہیں ملتے ۔ اگرچہ نولکشوری نسخے کے مرتبوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا نسخہ مصنف علیہ الرحمتہ کے مسودۂ خاص سے تیار ہوا ہے ۔

''علی الخصوص از نسخۂ کہ خاص مسودۂ مصنف مذکور بود،،
(ص ۵٦٦ جلد اول مؤیدّ الفضلا)

تاہم دیکھا جاتا ہے کہ مؤیدّ کی جلد اول میں لفظ برسم کی تشریح کے سلسلے میں یہ عبارت مرقوم ہے :

''و فقیر گوید کہ این لغت را از مجوسے کہ در دین خود بغایت فاضل بود و ارد شیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہندوستان آمدہ بود، تحقیق نمودم،، (ص ۱۵۹)

یہ بیان مصنف مؤیدّ الفضلا کا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکبر کے عہد کے بعد تک اس کا زندہ رہنا قرین قیاس نہیں ہے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ نولکشور نے ایک نسخہ طبع کیا ہے جس میں کسی نامعلوم شخص نے عہد اکبری کے بعد بہت کچھ اضافے کئے ہیں ۔

لیکن سب سے اہم یہ امر ہے کہ حکیم صاحب کا منقولہ فقرہ ''در زبان اہل اردو خون خرابا گویند،، مجھ کو قلمی نسخوں میں نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہو ۔

(   )

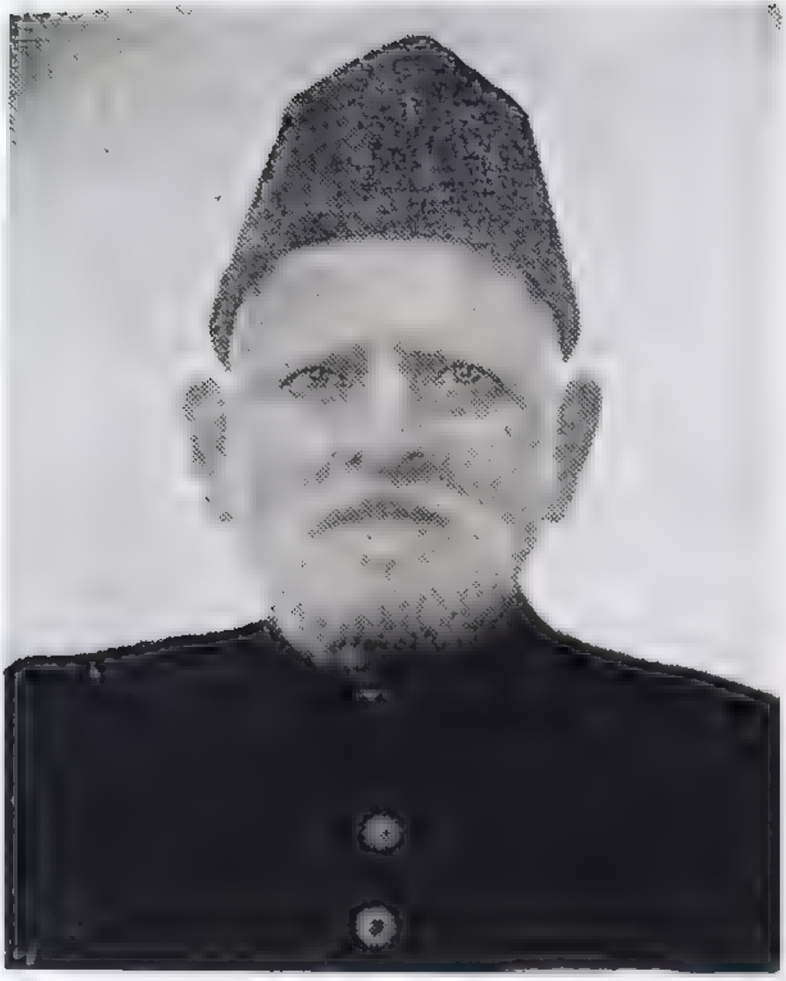
مذہب غالب

جناب الطاف حسین صاحب حالی مرحوم نے یادگار غالب میں مذہب حضرت غالب کے بارے میں عجیب اختلاف خیالی سے کام لیا ہے جس سے ناظر کتاب عجب غلط مبحث میں پھنس کر سخت پریشان ہو جاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آخر غالب کس مذہب کے معتقد تھے۔

یادگار غالب مطبوعہ کریمی پریس لاہور (۱۹۳۰) کے صفحہ ۶۷ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن جانتے تھے..... انہوں نے تمام عبادات و فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک تو توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت۔ اور اسی کو وسیلۂ نجات سمجھتے تھے''۔

محبت اہل بیت کا وسیلۂ نجات ہونا اہل تسنن کا عقیدہ نہیں۔ پھر اسی کتاب کے صفحہ ۶۸ میں لکھتے ہیں:



سید اولاد حسین شادان بلگرامی

"غدر کے بعد جبکہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی، پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب، مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا: تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار۔ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کر لیا"۔

اس جملے سے حضرت غالب اپنے آپ کو اسلام ہی سے خارج قرار دیتے ہیں مگر جناب حالی کے ارشاد کے موافق صرف ایک لطیفہ ہے اور بس۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

"اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔"

صلح کل تو قانون معاشرت و اخلاق و سلوک کا نام ہے، مذہب یا اعتقاد نہیں۔ اور تشیع کے میلان کا لفظ، اعتقاد تشیع میں کمی پیدا کرتا ہے۔ یہ تینوں صورتیں غالب کے شیعہ ہونے سے انکار کرتی ہیں۔ اسی صفحہ ۶۸ میں پھر لکھتے ہیں:

"ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں جن میں رفض و تشیع سے تحاشی کی ہے۔ ان میں سے ایک جو مجھے یاد رہ گئی، بہت لطیف ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دھری کیونکر ہو جو کہ ہوئے صوفی
شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

اس رباعی سے خود غالب کا انکار تشیع واضح ہے۔ مگر اس توہم کو جناب حالی مرحوم ان الفاظ میں رفع کرتے ہیں:

''جو لوگ مرزا کے طرز مزاج اور طرز کلام سے ناآشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں بادشاہ کے خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔''

اس عبارت سے گو پایۂ تشیع کی تنوبت پہنچ جاتی ہے پھر بھی دوسروں کا کچھ سمجھنا کسی کے مذہب کو ثابت نہیں کرتا۔ لہٰذا حسب بیان جناب حالی رباعی سے سنی ہونا اور اہل دربار کے سمجھنے سے شیعہ ہونا ثابت نہ ہوا۔ صفحہ ۹۰ میں تحت عنوان نماز جنازہ یوں رقمطراز ہیں:

''مرزا کے جنازے پر جبکہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی راقم موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خان، نواب محمد مصطفیٰ خان، حکیم احسن اللہ خان وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خان نے نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم سے کہا کہ میرزا صاحب شیعہ تھے، ہم

کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں ۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیے گئے ۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا ۔

اس آخری جملے سے ظاہر ہے کہ جناب حالی مرحوم، حضرت غالب کو خالص سنی ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ پھر صفحہ ۲۵۶ پر غالب کی یہ رباعی فارسی :

شرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم
خیزد بعد از نبی امام معصوم

ز اجماع چہ گوئی بہ علی باز گرای
مہ جای نشین مہر باشد نہ نجوم

لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر کیونکہ خلفائے ثلاثہ پر نجوم کا اطلاق اہل تشیع نہیں کرتے ۔

یہ رباعی اگرچہ پورے طور پر غالب کے شیعہ ہونے پر دال ہے مگر نہیں معلوم کہ کس بات نے صرف لفظ نجوم کی طرف توجہ دلائی اور دوسرے اہم الفاظ نظر انداز کرا دیے ۔

اولاً بالاتفاق ائمہ اثنا عشر کو اہل تسنن امام نہیں مانتے ۔ پھر ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ تو ہے ہی نہیں ۔ دوسرے، اہل تسنن خلافت کو اجماعی مانتے ہیں اور اہل تشیع امامت کو وہبی ۔ غالب عقیدۂ اجماع کی تغلیط یا تحقیر مصرع ثالث رباعی میں یوں کرتے ہیں :

زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرای

پھر لفظ نجوم سے جناب حالی جو استدلال کرتے ہیں اور جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ بھی بظاہر درست نہیں بلکہ اس لفظ میں غالب نے جو نکتہ صرف کیا ہے اس کی طرف جناب حالی کی توجہ نہ ہوئی۔

اہل تسنن کی کل اصحاب نبوی کے بارے میں یہ حدیث ہے: صحابی کالنجوم بای اقتدیتم اھتدیتم۔ جناب غالب خلفائے ثلاثہ کے لئے لفظ نجوم نہیں صرف کر رہے ہیں بلکہ کل صحابہ کے لئے۔ لہذا اس مصرعے کا مطلب یہ ہوا کہ سوائے علی کوئی بھی صحابہ میں سے جانشین نبی نہیں۔ مزید برآں یہ لفظ ''نجوم،، غالب کے عقیدے پر دال نہیں بلکہ حدیث مسلمۂ اہل تسنن سے اقتباس کیا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ رباعی غالب کے عقیدۂ تشیع پر برہان قطعی ہے۔

پھر حضرت حالی اسی کتاب یادگار غالب کے صفحہ ۱۶۲ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ کثرت اخراجات سے تنگ آ کر بعضے ضروری خرچ بند کر دیے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت مرزا صاحب کو حافظ کا یہ شعر لکھا ہے:

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو
رندی و خراباتی در عہد شباب اولی

اس کا جواب تنگی خرچ کا ذکر کرنے کے بعد یوں لکھتے ہیں:

"بھائی کو سلام کہنا ..... آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گذارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں۔ کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرج چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ (اللہ میاں) نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہ گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا،خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی و بحالی پوچھی تھی ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور بعد سلام و دعا کہنا۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیکھا، ہم کو یوں پلاتے ہیں!دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھانا اور مولوی مشہور ہو جانا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں؟۔ مشرک وہ ہیں جو

تو مسلموں (یہ اشارہ خلفا کی طرف ہے جو مسلمات اہل تسنن
کے خلاف اور توہین آمیز ہے) کو ابوالائمہ (حضرت علی)
کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ انہی لوگوں کے واسطے ہے۔ میں
موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لاالہ الا اللہ کہتا
ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ ، لامؤثر فی‌الوجود الا اللہ
سمجھا ہوا ہوں ۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت
میں سب مفترض الطاعہ تھے ۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم
ہوئی۔ وہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع (اختتام)
نبوت کا مطلع (آغاز) امامت اورامامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ
(وہبی خلاف عقیدۂ اہل تسنن) ہے اور امام من اللہ علی علیہ
السلام ہے ثم حسن ثم حسین، اسی طرح تا مہدی علیہ السلام،
برین ز یستم ہم برین بگزرم،،

یہی تو عقائد شیعہ ہیں، نہ عقائد اہل تسنن ۔ اس خط کو نقل
فرمانے کے بعد تو کوئی شبہ غالب کے شیعہ ہونے میں نہیں رہتا۔
پھر نہ معلوم الفاظ ''میلان تشیع ، تفضیلی ، اس میں شک نہیں
کہ نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی
خیالات سے واقف نہیں ہو سکتا تھا،، کیوں جناب حالی کے قلم
سے نکلے ؟

آخری عبارت اس خط کی جناب حالی مرحوم نے اس طرح نقل
فرمائی ہے :

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور
شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو
دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں
دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ
مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

یہ الفاظ ''مشرکین امامت مرتضوی،، بھی قابل غور ہیں۔ جوش عقیدت میں مسلک صلح کل بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ فقرہ اور الفاظ ''نو مسلم،، ایک حد تک ایک گروہ کے لئے دل آزار الفاظ ہو سکتے ہیں جو مسلک صلح کل پر ایک داغ کا کام کر رہے ہیں۔

''سنو! مولوی صاحب تم نے کے فقروں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا: چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ۔ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار اس کے مخالف ہیں۔،،

(مئی ۱۹۳۲ء)

(سر) شیخ عبدالقادر

مغرب کا اثر ادب اردو پر

[حال ھی میں ایک انگریزی کتاب ''موڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ،، کے نام سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ھے جس میں جدید ھندوستان کے متعلق جغرافیائی، تاریخی، اجتماعی، اقتصادی اور تعلیمی موضوعات پر مختلف اصحاب نے مختلف ابواب لکھے ھیں۔

ان میں ''ادبیات،، کے باب میں شعبۂ اردو پر جو مضمون ھے وہ ھمارے مخدوم و مکرم جناب شیخ سر عبدالقادر مدظلہ کے قلم کا مرھون ھے ۔ موصوف نے ھمیں اس کا ترجمہ اورئینٹل کالج میگزین میں شائع کرنے کی اجازت دے کر ھماری جو حوصلہ افزائی فرمائی ھے، اس کے لئے ھم ان کے تہ دل سے ممنون ھیں ۔

یہ ترجمہ ھماری درخواست پر ڈاکٹر سید عبداللہ لیکچرر اردو پنجاب یونیورسٹی نے کیا ھے جس کے لئے وہ ھمارے دلی شکریے کے مستحق ھیں]

اڈیٹر



شیخ سر عبدالقادر

اردو ہندوستان کی ملکی زبانوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے - یہ شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقوں اور جنوب کے بعض خطوں میں (جن میں حیدر آباد دکن بھی شامل ہے) بولی جاتی ہے - اور ملک کے باقی حصوں میں عموماً لیکن بڑے بڑے شہروں میں خاص طور پر سمجھی جاتی ہے - لہذا اردو ادب کا دائرہ مقبولیت بہت وسیع ہے اور جوں جوں ادبیات اردو میں مختلف علوم و فنون کا ذخیرہ فراہم ہوتا جاتا ہے توں توں اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے -

اردو ادب اگرچہ کچھ زیادہ قدیم نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو زبان خاصی پرانی ہے -

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زبان اردو نے شاہجہان کے اردوے معلیٰ میں جنم لیا - لیکن یہ خیال صحیح نہیں - گو ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ اس کی وجہ تسمیہ میں اردو یا 'شاہی لشکر گاہ' کا تصور ضرور موجود ہے(۱) - اردو کی پیدائش کے متعلق بہت سے نظریے ہیں(۲) - ان میں سے کون سا نظریہ آخری ، قطعی اور مسلم قرار پائے گا ، میں اس سے قطع نظر کرتے ہوئے سردست تاریخ ادب اردو کے مصنف مسٹر رام بابو سکسینہ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں - مصنف مذکور کا بیان ہے کہ :

---

(۱) اردو ایک ترکی لفظ ہے - جس کے معنی لشکرگاہ کے ہیں

(۲) ایک نظریہ یہ کہ دہلی میں پہنچنے سے پہلے زبان اردو نے دکن میں ترقی حاصل کی - دوسرا نظریہ پروفیسر محمود شیرانی (اورینٹل کالج لاہور) کا ہے کہ زبان اردو پنجاب میں پیدا ہو کر دہلی پہنچی -

اردو اپنی اصل کے اعتبار سے مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ یہ وہ بولی ہے جو صدیوں سے دھلی اور میرٹھ کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔

یہ بلاواسطہ سوارسینی پراکرت سے نکلی ہے اور بعد میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ غرض اردو کی بنیاد اسی پراکرت پر رکھی گئی ہے جس کی بنیادی خصوصیات، قواعد، محاورات اور بے شمار ہندی الفاظ اب بھی اس کی اصل کا پتہ دیتے ہیں۔

فارسی مسلمان سلاطین کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ علی الخصوص شاہان مغلیہ نے اس کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کو ہندی کے ساتھ پیوند دینے سے ایک عجیب و غریب لسانی آمیزہ تیار ہوا۔ اور جب ہندوستان کا مغربی اقوام سے اختلاط ہوا تو اردو پر مغرب کے افکار و ادبیات کا خوشگوار اثر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اردو آج نہایت لطیف اور عمدہ عناصر کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے ساتھ مغربی اقوام کے تعلقات کی ابتدا پرتگیزوں سے ہوئی۔ ان کے بعد فرانسیس آئے۔ چنانچہ ان دونوں کی زبانوں کے بے شمار الفاظ جو آج عام طور پر استعمال ہورہے ہیں، اسی دور کی یادگار ہیں۔ مثلاً الماری، میز، پستول، نیلام وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بہت سے فرنچ الفاظ مثلاً چاند ماری *(Champ de Mars.)* ایڈی کانگ *(Aide-de-Camp.)* قمیص *(Chemise.)* صابون *(Savon.)* اور بوتام *(Bouton)* آج ہماری زبان کا جزو بن کر عہد قدیم میں فرانسیسوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی یاد تازہ کررہے ہیں۔

ان کے بعد انگریز آئے۔ ان کے دور میں ہندوستان اور مغرب کے درمیان جو اختلاط اور تعلق ظہور میں آیا وہ فرنچ اور

پرتگیزی اثر کی نسبت بدرجہا زیادہ گہرا او دیرپا ثابت ہوا ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو میں انگریزی کے سینکڑوں الفاظ مل جل گئے ہیں ۔ ان الفاظ کی صحیح تعداد تو معین نہیں کی جا سکتی لیکن بعض حضرات نے اردو میں انگریزی عنصر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً مرحوم پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں کم و بیش انگریزی کے ٥٠٠ الفاظ موجود ہیں ۔ لیکن فرہنگ آصفیہ ایک پرانی کتاب ہے اور پروفیسر وحید الدین سلیم کے مذکورہ بالا مضمون سے تیس سال قبل مرتب ہوچکی تھی ۔ اس کی تالیف کے بعد انگریزی کے بہت سے نئے الفاظ ذخیرۂ اردو میں شامل ہوئے ہیں ۔ اس لئے میرے خیال میں پروفیسر سلیم کا اندازہ قرین صحت نہیں ۔ اس معاملے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی مرتبہ (New Urdu Dictionary.) شاید بہتر رہنمائی کرسکے ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق ان مؤرّد الفاظ کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ ہوگی ۔ ان میں سے بہت الفاظ ہماری معمولی ضروریات زندگی سے متعلق ہیں ۔ مثلاً سکول، کمپنی، ڈاکٹر، ریل، ٹکٹ وغیرہ وغیرہ ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو سائنس کی جدید ایجادات سے متعلق ہیں ۔ جن کے لئے ہماری زبان کے اصلی ذخیرے میں سرے سے الفاظ موجود ہی نہ تھے ۔ بعض اوقات ان کی جگہ ترجمے کے ذریعے (خالص اردو، عربی یا فارسی) الفاظ گھڑنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن ایسی کوششیں اکثر ناکام ہی ثابت ہوتی ہیں اور ایسے نوتراشیدہ الفاظ قبول عام نہیں پاسکتے ۔ ان مؤرّد اور دخیل الفاظ کی فہرست میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جن کا تعلق سیاسی نظاموں یا شہری اداروں سے ہے ۔ مثلاً کونسل، پارلیمنٹ،

پریزیڈنٹ، ووٹ، بیلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ ہندوستانی رسائل و اخبارات میں نیز مقرروں کی تقریروں میں بڑی کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

انگریزی کا اثر صرف ذخیرۂ الفاظ کی توسیع سے ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اظہار خیال کے اسالیب اور پیرایہ ہای بیان میں بھی خاص طور پر نمایاں ہے۔ یہ شاید انگریزی اثر ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اردو میں زاویۂ نظر، نقطۂ نگاہ، طریق بحث و استدلال اور اسی طرح کی بے شمار نئی ترکیبوں کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی تراکیب بیشتر انگریزی کے ترجمے ہوتے ہیں جن سے پیرایہ ہای بیان میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے ترجموں میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے۔ کیونکہ اردو میں انگریزی الفاظ و تراکیب کا ترجمے کے ذریعے اندھا دھند استعمال بعض اوقات سلاست اور لطافت بیان کے منافی ہوتا ہے۔

میں نے اردو میں انگریزی الفاظ کے داخل ہونے کے ذکر کو اس لئے مقدم رکھا ہے کہ اردو پر انگریزی اثرات کے ظہور کی پہلی شکل یہی ہے۔ لیکن درحقیقت اس سے بہت زیادہ قوی اور لائق توجہ اثر وہ ہے جو اردو نثر اور اس کے مختلف اسالیب، اردو کی شاعری اور ڈراما پر پڑا جس کا مختصر ذکر کیاجاتا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل اردو میں کوئی خاص نثری سرمایہ موجود نہ تھا۔ نثر کی ابتدائی کتابیں یاتو مذہبی مضامین سے متعلق تھیں یا قدیم قصے کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ انیسویں صدی کے اواسط میں فسانۂ عجائب، باغ و بہار، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا اور بوستان خیال شائع ہوئیں۔ پہلی دو کتابیں ایک عرصے

تک ان انگریز افسروں کے نصاب تعلیم میں شامل رہیں جو زبان اردو کی تحصیل کے متمنی تھے - باقی تین طویل و ضخیم قصے ہیں جو محض تفریح اور تفنن طبع کے لئے لکھے گئے تھے - ان میں خیالی کارنامے بیان ہوئے ہیں، ان بہادروں کے جو دیووں اور جنوں کو شکست دیتے تھے - جنوں اور پریوں کے قلعوں کو مسخر کرتے تھے اور سحر و طلسم کے بڑے بڑے حصاروں کو سر کر سکتے تھے - اس میں شک نہیں کہ جدید معیار کے مطابق ان کتابوں کے طرز بیان میں تصنع اور طمطراق کے سوا کچھ نہیں تاہم سچ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تصانیف ہمیں اچھا خاصا کارنامہ معلوم ہوتی ہیں - یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو نثر کو ترقی اور فروغ دینے کا خیال سب سے پہلے بلدۂ کلکتہ میں پیدا ہوا - تعجب اس لئے ہے کہ یہ شہر اردو کے دو اہم مراکز یعنی دہلی اور لکھنؤ سے خاصا دور ہے - یہاں ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل تھے، اردو کی ترقی کا کام شروع کیا - یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ انہیں بابائے نثر اردو کہہ کر پکارتے ہیں - موصوف اس پر افتخار لقب کے مستحق ہوں یا نہ ہوں ، اس قدر ضرور صحیح ہے کہ انہوں نے زبان اردو کی اہمیت اور اس کے روشن مستقبل کا پہلے سے ہی اندازہ لگایا اور اس کی ترقی کے لئے وسائل پیدا کیے - انہوں نے ایک اردو لغت تیار کیا - اس کے علاوہ انگریز طلبہ کے فائدے کے لئے ایک ہندوستانی گرامر بھی مرتب کی - انہی کے مقناطیسی اثر سے دہلی اور شمال مغربی صوبوں (یعنی صوبجات اودھ وغیرہ) سے علما و فضلا بڑی تعداد میں کھچے ہوئے کلکتہ پہنچے جن کے اجتماع سے کلکتہ میں اردو

کا ایک نیا مرکز قائم ہوگیا ۔ ان علما و ادبا میں میر امن دہلوی بھی تھے ۔ انہوں نے باغ و بہار لکھی جو در اصل امیر خسرو دہلوی کی 'چہار درویش' کا ترجمہ ہے ۔ فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ اور ان کے جانشینوں کے زیر سایہ ہندو مسلم فضلا و ادبا نے فارسی اور دوسری زبانوں سے عمدہ ترجمے کیے جس سے نثر اردو کا معقول ذخیرہ پیدا ہوگیا ۔ مگر ان سب کوششوں کے باوجود، یہ کہنا پڑتا ہے کہ معیاری اردو نثر کے سلسلے میں بعد میں جو کچھ ہوا ، اس کے لحاظ سے فورٹ ولیم کا دور نثر اردو کا ابتدائی اور تعمیری زمانہ تھا ۔

جدید معیاری نثر اردو کی ابتدا مرزا غالب سے ہوتی ہے ۔ مگر اس کی تکمیل ایک طرف تو سرسید احمد خان اور ان کے رفقا مثلاً نذیر احمد، حالی، شبلی وغیرہ کے ہاتھوں سے ہوئی (جو دبستان دہلی سے متعلق ہیں) اور دوسری طرف دبستان لکھنؤ کے دو ممتاز ادیبوں یعنی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر کی کوششوں سے ۔ سچ یہ ہے کہ مرزا غالب پہلے شخص تھے جنہوں نے نثر اردو کے محاسن اور اس کی دلکشی کا صحیح اندازہ کیا ۔ جیسا کہ اس زمانے کی شائستہ سوسائٹی کا قاعدہ تھا، مرزا غالب بڑی مدت تک فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے ۔ لیکن انیسوین صدی کے وسط میں انہوں نے اردو میں مراسلت اختیار کرلی اور مکاتبت میں مکالمے کا رنگ پیدا کیا ۔ خوش قسمتی سے ان کے یہ قابل قدر خطوط آج بھی محفوظ ہیں اور ''اردوئے معلی'' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں (۱) ۔ بے نظیر اسلوب بیان کے اعتبار سے نیز

(۱) دوسرے مجموعے کا نام 'عودهندی' ہے ۔ ایک اور مجموعہ رامپور سے 'مکاتیب غالب' کے نام سے شایع ہوا ہے (مترجم)

اس لحاظ سے ان سے مصنف کی سیرت اور نفسیات کے گہرے اسرار پر مفید روشنی پڑتی ہے ۔ یہ خطوط بڑی وقعت اور قدر کے لائق ہیں ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرزا غالب کی نثر مغربی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں لیکن ان کے بعد آنے والے نثر نگاروں پر یہ بات صادق نہیں آتی ۔ مثلاً سید احمد خاں پر ان کا رابطہ و تعلق انگریزوں کے ساتھ بہت گہرا اور استوار تھا ۔ مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی مہم شروع کرنے سے پہلے وہ حکومت انگریزی کے عہدہ دار تھے ۔ جب انہوں نے علی گڑھ کالج (جو اب یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ چکا ہے) کی بنیاد رکھی تو اس کے لئے انہوں نے بہت سے انگریزوں کی خدمات حاصل کیں مثلاً مسٹر بیک سر تھیوڈور ماریسن اور سر ٹامس آرنلڈ ۔

ان لوگوں کے خیالات و تصورات سے سید صاحب بہت متأثر ہوئے ۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ یہ انگریز صاحبان بھی سید صاحب کی عظمت اور شخصیت سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئے ۔ یہ شاید انہی اثرات کا نتیجہ ہے کہ سید صاحب کی تحریر سلاست، صفائی اور سادگی کے اوصاف کی حامل اور مبالغہ اور عبارت آرائی کے تکلفات سے خالی نظر آتی ہے ۔ ان کے نزدیک معقول پیرایۂ بیان اور موضوع کی جزالت، بیکار بلاغت اور بدیع و معانی کی فضول آرایشوں سے کہیں زیادہ تاثیر اور اثر پیدا کر سکتی ہے ۔

رسالہ تہذیب الاخلاق میں سید صاحب اور ان کے رفقا کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہے جن کا ان کے معاصرین کے قلب و دماغ پر بڑا اثر ہوا ۔ اس ادبی و علمی کام میں سید صاحب کا

ھاتھ بٹانے والے لوگ بہت سے تھے جن میں نواب محسن الملک مرحوم کا نام خاص امتیاز رکھتا ھے ۔ نواب صاحب نہایت فصیح البیان اور خوش کلام مقرر بھی تھے ۔ ان کی تقریریں سن کر یہ ثابت ھوتا تھا کہ اردو زبان میں خطیبانہ جوھر کے اظہار کی کس قدر گنجائش موجود ھے اور اگر مقرر زبان پر قدرت رکھتا ھو اور فن میں مہارت ھو تو اردو زبان اس بارۂ خاص میں بھی دنیا کی بلند پایہ زبانوں کا مقابلہ کر سکتی ھے ۔ نواب محسن الملک مرحوم اگرچہ انگریزی نہ جانتے تھے لیکن آخری عمر میں انھوں نے اس حد تک شدبد پیدا کر لی تھی کہ اخبار کو سن کر اس کا مطلب سمجھ سکتے تھے ۔

رفقای سر سید میں مولوی الطاف حسین حالی کا نام خاص طور پر ذکر کے لایق ھے ۔ حالی مرزا غالب کے شاگرد تھے اور اگرچہ آپ کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کی شاعری پر ھے ، پھر بھی آپ موثر اور سادہ نثر نگاری کے لحاظ سے نثر نگاران اردو میں نہایت بلند مقام رکھتے ھیں ۔ ان کے دیوان کا مقدمہ ادبی تنقید اور اردو شعر و شاعری کی اصلاح کے اصولوں پر مشتمل ھے جس سے کچھ کچھ اس امر کا سراغ ملتا ھے کہ مولانا حالی نے مقدمہ لکھنے سے پہلے میتھیو آرنلڈ کی (*Essays on Criticism*) کا مطالعہ ضرور کیا ھوگا ۔ حیات جاوید اور یادگار غالب بھی مولانا حالی کی تصانیف ھیں ۔ ان سے بھی یہ معلوم ھوتا ھے کہ مولانا حالی کو انگریزی زبان سے واقفیت نہ ھونے کے باوجود مغربی ادب کے اصول سے روشناسی ضرور تھی ۔ شبلی بھی سر سید احمد خاں کے ساتھیوں میں سے تھے ۔ وہ بھی بہت حد تک سید صاحب ھی کی تحریک اور ترغیب سے ادب کے میدان مین آئے ۔ شبلی علی گڑھ کالج میں

پروفیسر تھے۔ یہاں سر طامس آرنلڈ سے ان کی ملاقات ہوئی (جن کے روابط و تعلقات کا ان کی ادبی زندگی میں بڑا اثر نظر آتا ہے)۔ شبلی کا محبوب اور مرغوب مضمون ''فن سیرت،، تھا۔ سیرۃالنبی ان کی بہترین تصنیف ہے۔ جس کی تالیف و تدوین میں انہوں نے تحقیق و تدقیق کے مغربی طریقوں اور اصولوں سے بڑا کام لیا۔ شعرالعجم اردو زبان میں فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تنقید و تحقیق کے مغربی نظریوں سے خاص واقفیت بہم پنچا لی تھی۔ مگر یہ معلومات انہوں نے براہ راست حاصل نہ کی تھیں بلکہ کچھ تو مغربی کتابوں کے ترجموں کی وساطت سے اور کسی حد تک یورپین علما و فضلا سے اختلاط کے ذریعے۔

اردو کے دوسرے مرکز (لکھنؤ) کا ذکر کرنے سے پہلے میں دبستان دھلی کے ایک اور نامور فاضل مولوی نذیر احمد خاں کی تصانیف کا تذکرہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ مولوی نذیر احمد ایک بلند مرتبہ مصنف اور خوش بیان مقرر تھے۔ زبان اردو پر ان کو مسلمہ قدرت حاصل تھی اور ان کے کمالات میں یہ بات خاص طور پر شمار کے لایق ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں دھلی کی ٹھیٹھ بیگماتی زبان اور روزمرہ کا استعمال کیا ہے۔ مولوی صاحب انگریزی جانتے تھے اسی لئے انہوں نے انگریزی ادب سے کچھ نہ کچھ خیالات ضرور لئے ہوں گے۔ مگر اس بات پر ضرور تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تحریر کو بقدر امکان خارجی عناصر سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کی کتابوں میں انگریزی الفاظ اور جملے شاذ ہیں۔ انہوں نے اکثر کتابیں خواتین کے فائدے کی لکھیں اور اس طبقے میں بہت مقبول بھی ہوئیں۔ مگر مردوں

میں بھی ان کا کچھ کم چرچا نہیں اور سبھی لوگ ان کی تصانیف کو شوق سے پڑھتے ھیں ۔ ان میں مرآۃالعروس کو بہت قبول عام نصیب ھوا ۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ھو چکا ھے جو مسٹر وارڈ (آئی ۔سی ۔ایس) کے قلم سے ھے ۔

لکھنؤ کے نثرنگاروں میں رتن ناتھ سرشار اور مولوی عبدالحکیم شرر کے نام سب سے ممتاز ھیں ۔ یہ دونوں حضرات ناول نگار تھے ۔ اور ان دونوں نے ادبیات اردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ھیں ۔ شرر اور سرشار دونو انگریزی سے واقف تھے ۔ ان کی تصانیف میں مغربی اثرات کے نقوش صاف صاف نظر آتے ھیں ۔ سرشار کشمیری برھمن تھے ۔ انھوں نے بہت سے ناول لکھے ھیں ۔ جن میں فسانۂ آزاد سب سے زیادہ مقبول ھوا ۔ سرشار کی شہرت کا دارومدار بھی بیشتر اسی طویل قصے پر ھے ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ھے ۔ آزاد اس افسانے کا ھیرو ھے ۔ فسانۂ آزاد کے سلسلے میں سرشار پرڈ کنس (*Dickens*) کا پر تو نظر آتا ھے ۔ اس قصے میں ھمارا اردو ناول نگار، ڈ کنس (*Dickens*) کی طرح عوام کی زبان میں لکھنے کی کوشش کرتا ھے ۔ وھی غلط تلفظ! وھی نادرست محاورے! وھی زبان و بیان کی خامیاں! وھی بے قاعدگیاں! وھی غلطیاں!ــــــ بڑی کامیابی کے ساتھ عامۃالناس کی بول چال کو اپنی عبارتوں میں منعکس کیا ھے ۔

اسی طرح آزاد اور اس کے خوجی کو(*Don Quixoto* اور *Sancho Panzo*) کے ساتھ جو مماثلت ھے وہ محتاج بیان نہیں ۔ سرشار کا ایک وصف خاص یہ ھے کہ ان کی تحریریں بذلہ و ظرافت سے پر ھوتی ھیں ۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے قصہ نویسی میں جو راستہ اختیار کیا وہ سرشار کی شاهراہ سے مختلف هے - انھوں نے سر والٹر سکاٹ کی مثال پر عمل کرتے هوئے ''تاریخی ناول،، لکھے - ان کے بہترین ناولوں میں سے ایک صلیبی لڑائیوں کے زمانے سے متعلق هے جس میں ایک عیسائی شہزادی اور مسلم جانباز کی داستان عشق و محبت بیان کی هے -

حکیم محمد علی طبیب لکھنوی، شرر کے پیرؤوں میں سے هیں - انھوں نے بہت سے ناول شرر کی طرز پر لکھے -

مرزا محمد هادی رسوا کریسچن کالج لکھنو کے پروفیسر تھے - انھوں نے بھی چند عمدہ ناول لکھے هیں -

یہ عجیب بات هے کہ ناول اکثر و بیشتر لکھنؤ میں لکھے گئے - اس کے برخلاف دهلی کے مصنفین نے اخلاقی قصے لکھے هیں - نذیر احمد کے قصوں میں گرمئی هنگامہ بالکل نہیں بلکہ ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا واضح اور معین مقصد هے - مولوی راشدالخیری نے مولوی نذیر احمد کے طرز کی پیروی کی - لیکن انھوں نے غم و الم کی تصویر و تشریح کو اپنا خاص موضوع بنایا - یہی وجہ هے کہ انہیں مصور غم کے لقب سے یاد کیا جاتا هے - دهلی کے انشاء پردازوں میں خواجہ حسن نظامی جو بفضلہ زندہ و سلامت هیں ، بڑی دلکش اور مؤثر نثر لکھتے هیں - ان کی نثر میں مغربی رنگ خاصا هے - اور یہ دیکھ کر کہ انھوں نے جدید طرز کے کسی سکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی اور (سوائے اس کے کہ ترجموں کے واسطے سے یا انگریزی داں دوستوں کے ذریعے انگریزی خیالات سے کچھ آگاهی حاصل کر لی هو)

انگریزی ادب سے روشناس نہ تھے ، ان مغربی اثرات کی موجودگی تعجب سے خالی نہیں معلوم ہوتی ۔

مولوی محمد حسین آزاد بھی ان مشہور مصنفین اردو میں سے ہیں جن کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی ۔ لیکن ان کی تصانیف میں مغرب کے اثرات بہت روشن نظر آتے ہیں ۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا لیکن ان کی تصنیفی زندگی کا غالب حصہ لاہور میں گزرا جہاں انھوں نے ادب اردو کا ایک نیا دبستان قائم کیا جو اب (دہلی اور لکھنؤ کی طرح) زبان اردو کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے ۔ جس زمانے میں کرنل ہالرائڈ محکمۂ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر تھے ، مولوی محمد حسین آزاد بھی محکمۂ تعلیم کے ملازم تھے ۔ کرنل ہالرائڈ کی تشویق اور حوصلہ افزائی سے آزاد کو بہت مدد ملی جن کے زیر اثر آزاد نے ادب اردو کو مغربی خیالات اور افکار سے روشناس کیا ۔ ان کی کتاب نیرنگ خیال ایک عمدہ تمثیل ہے اور قصص ہند، تاریخ ہند سے متعلق کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ ہے ۔ ایک اور کتاب دربار اکبری ہے جس میں جلال الدین اکبر کے امرائے دربار کے مرقعے کھینچے ہیں ۔ آزاد کی کتابیں جس طرز میں لکھی گئی ہیں وہ بے مثل اور بے نظیر ہے ۔ یہ طرز (بہت بڑی حد تک) مغربی ادبا اور فضلا سے میل جول کا نتیجہ ہے ۔ بایں ہمہ، یہ آزاد کی خاص خوبی ہے کہ ان کی تحریریں بے حد شستہ، رواں اور صاف ہیں اور نامناسب آمیزش سے بالکل پاک ہیں ۔ ادبیات اردو کے ذخیرے میں انگریزی کتابوں کے ترجموں کے ذریعے اچھا خاصا اضافہ ہوا ۔ ان ترجموں میں بہت سی کتابیں افسانہ وغیرہ سے متعلق ہیں ۔ لیکن ان کے علاوہ علمی

طرز کی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ مترجمین میں مولوی ظفر علی خاں اور مسٹر عنایت اللہ خاں دہلوی کو بڑی مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی۔ مولوی ظفر علی خاں نے ڈریپر کی کتاب (Conflict of Religion and science)(۱) کرزن کی کتاب (Persia)(۲) اور کپلنگ کی کتاب (The Jungle Book)(۳) کا ترجمہ کیا۔ مولوی عنایت اللہ کئی سال تک حیدر آباد میں دارالترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی) کے صدر یا ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بطور جملہ معترضہ، عثمانیہ یونیورسٹی وہ تعلیمی ادارہ ہے جہاں عرصے سے فلسفہ اور سائنس اور دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم غیر معمولی کامیابی کے ساتھ اردو ہی میں دی جا رہی ہے۔

اردو میں جن مغربی افسانہ نگاروں کے ناولوں کے ترجمے ہوئے ان میں سکاٹ، لٹن ڈکنز، اور ھیگرڈ قابل ذکر ہیں۔ طالسطائی کے بعض قصے بھی اردو کا لباس پہن چکے ہیں۔ اسی طرح کچھ فرانسیسی افسانے بھی براہ راست فرنچ سے یا کسی دوسری زبان کی وساطت سے، اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ فرانسیسی ناولوں سے سید سجاد حیدر یلدرم سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ ترکی ترجموں کے ذریعے ــــ! سید صاحب ترکی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور اس زبان کے ادب کی خوبیوں کے دلدادہ اور معترف ہیں۔ سید علی بلگرامی نے لیبان کی کتاب (Civilisation dese Arabs) کا براہ راست فرنچ زبان سے ترجمہ کیا جس کا نام تمدن عرب رکھا۔ باوجودیکہ اس کتاب کی قیمت زیادہ

---

(۱) معرکۂ مذہب و سائنس۔ (۲) خیابان فارس۔
(۳) جنگل میں منگل۔

ہوی پھر بھی اس کی فروخت توقع سے زیادہ ہوئی ۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سے ایک ارزاں ایڈیشن بھی شایع ہوا ۔

کچھ عرصے سے یورپ کے جدید ترین تصورات اور عقائد سے متعلق کتابون مثلاً نطشہ، کانٹ، برگسان، کارل مارکس، وغیرہ کی تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف خاص توجہ ہو رہی ہے ۔ ان مغربی مصنفوں اور مفکروں کی زندگی کے حالات بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں ۔ خصوصاً نوجوان طبقہ ان کے افکار و خیالات سے گہری دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے ۔ ان مغربی علما و حکما کا نوجوانوں کے ذہن و فکر پر عمیق اثر موجود ہے ۔ اس کے علاوہ جرائم اور جاسوسی کے ناولوں اور قصوں کی طرف بڑی رغبت ہے ۔ ایسے بہت قصوں کا انگریزی سے ترجمہ ہوا ہے مگر بعض اوریجنل اور طبع زاد ہیں ۔ افسانہ نگاری (*Short Stories*) بطور فن کے بڑی ترقی کر رہی ہے اور گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں نوجوانوں میں بعض ایسے قابل اور ہونہار افسانہ نگر پیدا ہوئے ہیں جن سے مستقبل مین بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ۔

مغرب کے زیر اثر سب سے زیادہ جس فن کو ترقی نصیف ہوئی ہے وہ صحافت ہے ۔ ہندوستان میں اخبارات اور جرائد صرف عہد جدید کی پیداوار ہیں ۔ مطبع جو حقیقتاً ہماری ترقی کے بڑے اسباب میں سے ہے، یورپ کے طفیل ہندوستان میں رواج پذیر ہوا ۔ صحافت اور طباعت لازم و ملزوم ہیں ۔ مطبع کے رواج پاتے ہی صحافت کا بھی آغاز ہوا ۔ وہ آج ترقی کی منزلین طے کرکے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ ہم اسے قوت، اثر اور طاقت کا ایک مؤثر

سرچشمہ قرار دے سکتے ہیں۔ انگریزی میں بھی بعض ایسے اخبارات موجود ہیں جن کے ایڈیٹر ہندوستانی حضرات ہیں۔ یہ اخبارات حکومت پر اثر اور دباؤ ڈالنے کے معاملے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ لیکن ان کا دائرہ اثر محدود ہے۔ ان کے مقابلے میں اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے اخبارات، پراپاگنڈہ اور رائے عامہ کو ابھارنے کے معاملہ میں بدرجہا زیادہ موثر ہیں اور اثر اور اشاعت کے لحاظ سے روز افزوں ترقی کر رہے ہیں۔ چند مستثنیات سے قطع نظر، زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ان اخبارات میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے مقالہ نگار بے سوچے سمجھے اور بے ضرورت اپنی تحریروں میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے ایسے الفاظ اور محاورات ٹھونس دیتے ہیں جو اردو کے خمیر اور فطرت سے کسی طرح کا لگاؤ نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ اگر زبان اردو کے حسن اور خوبصورتی کو قایم رکھنا منظور ہے تو یہ دخیل الفاظ اور جملے جس قدر کم تعداد میں اور جس قدر زیادہ احتیاط سے استعمال کئے جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔

اردو کے رسالوں اور معیادی جریدوں سے بھی نثر اردو کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں دلگداز، معارف، مخزن، زمانہ، ادیب، نگار، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ہمایوں، اور شاہکار کے نام لایق ذکر ہیں۔ ان میں سے دو تین تو اب بند ہو چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جس مقصد کو اپنے سامنے رکھا تھا وہ اب بھی بڑے جوش اور قوت کے ساتھ جاری ہے۔ آج کل جو رسالے شایع ہو رہے ہیں ان میں سے بعض مصور ہیں اور ظاہری دلکشی اور محاسن کے اعتبار سے مغربی ممالک کے اکثر رسالوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے سالانہ نمبر بھی نکلتے ہیں جو ظاہری خوبی،

مضامین کی عمدگی اور معلومات کے لحاظ سے بہت پسند کئے جاتے ہیں ۔

اردو رسالوں کے ضمن میں چند زنانہ پرچوں کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ تہذیب نسوان (لاہور) جس نے عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسے میں بڑی شائستہ خدمات انجام دی ہیں، شاید سب سے پرانا زنانہ پرچہ ہے ۔ اس کے بعد خاتون (علی گڑھ) اور عصمت (دہلی) جاری ہوئے ۔ ان کے ذریعے بھی تعلیم نسواں کے مقصد کو بڑی ترقی ہوئی ۔ ''خاتون،، نام کا ایک رسالہ بمبئی سے بھی شائع ہوتا ہے ۔ یہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہے کہ اس کے ذریعے احاطہ بمبئی میں اردو کی ترویج ہو رہی ہے ۔ حال ہی میں ''انیس نسواں،، کے نام سے ایک زنانہ رسالہ دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جو امید ہے کہ اچھا کام کرے گا ۔

ہندوستان میں بچوں کے رسالوں کا رواج بھی یورپ کے تتبع میں ہوا ۔ چنانچہ اردو کے یہ پرچے جب نکلے تو عام طور پر ان کا ڈھنگ یورپ کے رسالوں کا سا تھا ۔ ''بچوں کا اخبار،، لاہور شاید اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ تھا ۔ اس کے بعد چند اور رسالے بھی شائع ہوئے ، جن میں ''پھول،، سب سے پرانا اور مقبول ترین ہے اور اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے ۔

جدید طرز کا فن مزاحیہ نگاری بھی ہمارے چمنستان ادب کا ایک گلبن شاداب ہے ۔ لکھنؤ کا ''اودھ پنچ،، جو منشی سجاد حسین کی ادارت میں نکلتا تھا، اسی حیثیت سے ممتاز تھا ۔ منشی سجاد حسین بڑے بلند پائے کے مزاحیہ نگار تھے ۔ ان کے اکثر رفقا انھی کے انداز پر لکھتے تھے اور بڑی شہرت رکھتے تھے ۔

یہ اخبار کئی برس تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا ۔ افسوس ہے کہ اب اس کی اشاعت بند ہو چکی ہے ۔ لیکن اس کا اثر اس لحاظ سے اب تک باقی ہے کہ لوگوں کو اب مزاحیہ تحریروں کی خاص چاٹ لگ گئی ہے ۔ چنانچہ اسی کا تقاضا ہے کہ اب اکثر روزنامہ اخبارات میں ایک کالم مطائبہ و ظرافت کے لئے مخصوص ہوتا ہے ۔

اردو نثر پر مغربی اثرات کا اجمالی ذکر ہو چکا ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری مغرب سے کہاں تک متأثر ہوئی ۔ اس اثر کی ابتدا بھی نثر کی طرح انیسویں صدی کے اواسط سے ہوتی ہے ۔ سطور بالا میں کرنل ہالرائڈ اور انجمن پنجاب (لاہور) کا تذکرہ آچکا ہے ۔ اس انجمن کے اجلاسوں میں آزاد اور حالی نے جدید طرز کی اولین نظمیں پڑھیں ۔ حالی جو کچھ دیر محکمۂ تعلیم پنجاب کے ملازم رہے اس انجمن کے رکن تھے ۔ ان کے علاوہ دوسرے ارکان بھی مناظر قدرت یا دوسرے معاشرتی اور مجلسی مسائل کے متعلق نظمیں لکھا کرتے تھے ۔ غالب نے ''تنگنائے غزل'' سے نکل کر اظہار اور ترجمانی کے لئے جن وسعتوں کی ضرورت محسوس کی تھی، افسوس ہے کہ وہ خود تو ان کو نہ پاسکے لیکن ان کے شاگرد حالی اور ذوق کے شاگرد آزاد کو قدرت نے ان کے پا لینے کی توفیق عطا فرمائی ۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے آزاد اور حالی کے شروع کیے ہوئے کام کو کچھ اور بڑھایا ۔ وہ انگریزی کی تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے ۔ چنانچہ اس ذریعے سے انہوں نے بہت سے جدید مغربی خیالات و تصورات اخذ کیے لیکن انہوں نے ان مغربی معلومات کو قدیم مشرقی روح تمدن کے ابقا اور احیاء کے لئے استعمال کیا ۔ اکبر مادی ترقی کو روحانی فضیلت پر ترجیح

نہیں دیتے، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے ملک والوں کو تلقین کی کہ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہ ہوں اور ان شاندار اور قیمتی روایات کو جو انہیں مشرقی حکیموں اور رشیوں سے ورثے میں ملی ہیں، اپنے سینے سے لگائے رکھیں ۔ اکبر بذلہ و ظرافت کے دلدادہ تھے ۔ انھوں نے اپنی ہجویہ اور طنزیہ قوت کو بڑی شدت کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف استعمال کیا جو مغرب کی اندھادھند تقلید اور پیروی پر مصر ہیں ۔ اردو شعر میں انگریزی الفاظ کو بڑی عمدگی اور خوبی کے ساتھ کھپا سکتے تھے ۔ بعض لوگوں نے اس معاملے میں ان کا تتبع کرنا چاہا ہے ۔لیکن اکبر کی سی قابلیت کہاں سے لاتے ۔ لہٰذا انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ اکبر کو زبان اردو پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ اس کی تائید میں ہم وہ نظم جس کا عنوان ''آب لوڈور،، ہے اور جو سودے کی ایگریزی نظم کا ترجمہ ہے پیش کر سکتے ہیں (جو یہ ثابت کرتی ہے کہ اکبر کا ذخیرہ الفاظ کتنا وسیع اور وافر تھا) ۔

مشرق و مغرب کے باہمی میل جول کے اہم ترین نتائج ہمیں سر محمد اقبال کی ذات مستجمع الصفات میں ملتے ہیں ۔ وہ اسلامی علوم و فنون کے غیر معمولی تجربے کے ساتھ ساتھ مغربی ادب و حکمت کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے ۔ انھوں نے فارسی میں بھی بہت سی نظمیں (کتابیں) لکھی ہیں جن کی بنا پر انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ۔ اس مضمون میں ان کی فارسی شاعری پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا مگر خوش قسمتی سے ان کے اولین مجموعۂ کلام اردو یعنی بانگ درا میں بھی ہمیں ان خیالات و تصورات کے مدھم نقوش ملتے ہیں، جنہیں بعد میں

انھوں نے اپنے فارسی کلام میں ایک مربوط و مبسوط شکل میں پیش کیا - پھر اردو کی جو کتابیں ان کی فارسی تصانیف کے بعد شائع ہوئیں ان میں بھی کم و بیش انھی خیالات کا اعادہ ہے جو فارسی تصانیف میں ظاہر کیے جا چکے ہیں - پس اگر ہم علامہ کی اردو کتابوں سے ان کے اہم افکار کا سراغ لگانا چاہیں تو فارسی تصانیف کی مدد کے بغیر کسی حد تک ہم اس میں کامیاب ہوسکتے ہیں -

علامہ اقبال کے نظام فکر کے چند اہم مسائل یہ ہیں :

۱ - فرد کی اہمیت اور خودی کی تربیت کی ضرورت -

۲ - نظام عالم میں انسان کا مقام بلند اور اس کے استعمال کے وسیع اور لامحدود امکانات -

۳ - مادی ترقی کی کوششوں میں تزکیہ روحانی کی ضرورت جس کے بغیر مادی ترقی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے -

۴ - اقوام یورپ کو یہ پیغام عبرت، کہ اگر وہ روحانیت سے بیزار ہو کر، ''این جہانی،، تصور حیات پر مصر رہیں گے تو ان کی تہذیب تباہ ہو کر رہے گی -

۵ - اقوام مشرق علی‌الخصوص مسلم اقوام مشرق میں روحانی فضیلت اور برتری کا از سر نو احساس پیدا کرنا - (یہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مسائل ہیں جو اقبال کی شاعری کا خلاصہ ہیں) ان ٹھوس حقیقتوں کو اقبال نے شعر و شاعری کے لطیف و نازک قالب میں ڈھالا ہے - اس کوشش میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ان کے شاعرانہ کمال پر دال ہے - اقبال نے فلسفہ

و حکمت کے علاوہ حسن وعشق اور مناظر قدرت سے متعلق مضامین بھی بڑی خوبی سے باندھے ھیں ۔

اقبال کے لئے مغربی اثرات کا واحد سرچشمہ صرف انگریزی علم و ادب ھی نہ تھا بلکہ مغربی دنیا کے بعض اور ملکوں سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا ۔ وہ جرمن زبان جانتے تھے ۔ پھر جرمنی میں قیام کی وجہ سے انھیں اس زبان کے ادب اور علوم سے روشناس ھونے کا موقعہ ملا ۔ اس کے علاوہ فرانس، اٹلی اور سپین کی سیاحت بھی کی ۔ ان کے افکار میں نطشہ اور برگسان کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ھے ۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ھمیں یہ نہ بھولنا چاھئے کہ وہ اصولاً ایک صوفی تھے جن کے افکار میں ایرانی (اسلامی) تصوف اور فقرو طریقت کے خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ھیں ۔ ان کا پیغام مغرب کی مادیت کے خلاف ایک پرزور احتجاج ھے ۔

جدید نوجوان شاعروں میں بیشتر اردو ادب میں قابل قدر اضافے کررھے ھیں مگر ان اوراق کی تنگ دامنی ان کے رحجانات اور میلانات پر تبصرہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی ۔ پھر بھی ایک دو حضرات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ھوتا ھے جو اس وقت مغربی اثرات کے ماتحت، دو خاص طرزوں کی نمایندگی کررھے ھیں ۔ ان میں سے ایک تو حفیظ جالندھری ھیں ۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ھندوستانی زندگی اور معاشرت کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں کھینچی ھے ۔ ان کے شعروں کی موسیقیت ، ترنم اور روانی کا سامعین و قارئین کے دل پر سحر اور جادو کا سا اثر ھوتا ھے ۔ وہ اپنی نظمیں جب مشاعروں میں پڑھنے کے لئے آتے ھیں تو ان

کے منہ سے ان کا کلام سننے کے لئے لوگ بڑی کثرت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس لایق ذکر ہے کہ حفیظ نے انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی۔ انہوں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۸ء میں انگلستان اور فرانس کا سفر کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے انگریزی میں کچھ بول چال سیکھی اور مغربی ممالک سے براہ راست ان کا رابطہ ہوا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ اس سے بہت قبل، اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے ذریعے، مغربی خیالات سے روشناس ہو چکے تھے۔

جوش ملیح آبادی کا وطن لکھنؤ ہے لیکن اب دہلی میں مقیم ہیں۔ وہ انگریزی ادب سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے قلم میں بڑا زور ہے۔ اقبال کی طرح ان کی شاعری بھی مغرب کے خلاف، علی الخصوص مغرب کے سیاسی استیلا کے خلاف، احتجاجی ذہن کی نمایندگی کرتی ہے۔ جوش زبردست وطن پرور اور وطن دوست شخص ہیں۔ وہ اکثر ملوکیت، استعمار اور سرمایہ‌داری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کی آخری نظموں میں مذھب اور دین کی بھی سخت مخالفت پائی جاتی ہے۔ اردو ڈراما کے ذکر سے پہلے بلینک ورس (بے قافیہ کی نظم) کی طرف بھی کچھ اشارات کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ یہ طرز خالصتاً مغربی اثرات کی پیداوار ہے۔ اس کے رواج دینے کی کوششیں بارہا ہو چکی ہیں لیکن اس معاملے میں کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے دلگداز میں اس طرز کی کچھ نظمیں شائع کی تھیں۔ لیکن انھیں قبول عام نصیب نہ ہوا اور اب تک ہندوستان میں قدیم طرز کی مقفیٰ شاعری کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

ڈراما ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ۔ قدیم یونان کی طرح قدیم ہندوستان میں بھی راجاؤں کے درباروں میں ناٹک ہوا کرتے تھے ۔ لیکن زمانے کے نشیب و فراز، حکومتوں کے مدوجزر، نیز سیاسی انقلاب اور پے بہ پے بیرونی حملوں کی وجہ سے ڈرامے کا رواج جاتا رہا اوربالاخر معاشرتی زندگی میں اس کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی ۔ نئے خیالات اور طریقوں کے آنے سے پہلے ڈرامے کی صرف اسی قدر بگڑی ہوئی شکل رہ گئی تھی کہ بازیگر اور ناچنے والوں کی ٹولیاں شہر بہ شہر پھرا کرتی تھیں جس کو ''رہس ہرس،، کہا کرتے تھے ۔ یا پھر ہر سال دسہرے کے موقعہ پر رام چندر جی اور لچھمن کے واقعات کے سوانگ بھرے جاتے تھے ۔

ڈرامائی ادب اور کھیلوں کا ذوق اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کے زمانے میں پھر زندہ ہوا ۔ ۱۸۵۱ء کے قریب امانت نے اندر سبھا کے نام سے ایک کہانی لکھی ۔ یہ ایک فرضی راجہ (راجہ اندر) کے دربار کی کہانی ہے جس میں پریوں کے ناچ گانے ہوتے تھے ۔ کوہ پیکر دیو اس کے اکھاڑے کی حفاظت کیا کرتے تھے اور کسی آدم زاد کو اس کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی ۔ یہ کھیل واجد علی شاہ کی نگرانی میں لکھنؤ میں دکھایا گیا ۔ کہتے ہیں کہ خود واجد علی شاہ نے گلفام شاہزادہ کا پارٹ کیا ۔ (یہ اس آدم زاد شاہزادہ کا نام ہے جس پر ایک پری عاشق ہوگئی تھی ۔ اس کی بدولت اس شہزادے کو راجہ اندر کے اکھاڑے میں گھس آنے کا موقعہ ملا تھا)

امانت ہندوستان میں جدید ڈرامے کی ابتدا کرنے والا ہے ۔ کم از کم اردو کا جہاں تک تعلق ہے اس کی اولیت کا سہرا

اسی کے سر ہے - بمبئی ہندوستان میں ڈرامے کی ترقی اور فروغ کا سب سے بڑا مرکز ہے - سب سے پہلے امانت کا ڈرامہ اسی شہر میں سٹیج پر دکھایا گیا - ہندوستانی سٹیج کی ترقی میں بمبئی کے پارسیوں نے بڑا حصہ لیا ، جن کی کمپنیوں نے اپنے سرمایے اور محنت سے اس فن کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا - انھوں نے شمالی ہندوستان سے نامور ہندو اور مسلم شعرا کو بلا کر ان سے انگریزی ڈراموں کے ترجمے کروائے اور نئے ڈرامے لکھوائے مثلاً رونق بنارسی اور ظریف وغیرہ - ان کے بعد سید مہدی حسن (احسن) لکھنوی اور ونائک پرشاد طالب بنارسی نے اس میدان میں قدم رکھا - انھوں نے اردو ڈرامے کی زبان میں بڑی اصلاح کی لیکن اردو ڈرامے کی دنیا میں جس شخص کو بقائے دوام حاصل ہوگا وہ آغا حشر کاشمیری تھا، جسے اس کے قدر دان اور رتبہ شناس، انڈین شکسپیئر کے پرافتخار لقب سے یاد کرتے تھے - حشر نے انگریزی کے بہت سے ڈراموں کا ترجمہ کیا مگر بہت سے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے -

یہ امر ضرور ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اردو ڈرامے نے زیادہ تر اوپیرا (غنائی تمثیل) کے انداز پر ترقی کی ہے ، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اندر سبھا ایک غنائی تمثیل تھی - جن لوگوں نے پہلے پہل کھیل تیار کیے انھوں نے یہ خیال کیا کہ گانے ہندوستانی پبلک کے لئے بڑی کشش کا باعث ہوں گے - محولہ بالا مصنفوں کے ڈراموں میں نظم اور نثر دونوں ہیں مگر نثر مقفیٰ اور مسجّع ہوتی ہے، جس کو پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مختلف اشخاص قصہ کے درمیان کوئی حقیقی اور واقعی گفتگو ہو رہی ہے - باقی رہیں نظمیں سو وہ گانے

بجانے کے لئے ہیں۔ پھر عام رواج کے مطابق (جو اب تک قائم ہے) عموماً ہر کھیل میں ایک مسخرہ بھی ہوتا ہے، جس کی حرکتیں اور باتیں لوگوں کو ہنسانے کے لئے ہوتی ہیں ۔ مسخرہ عام طور پر سٹیج پر اس وقت آتا ہے جب کھیل کا کوئی مضطرب یا متاثر کرنے والا حصہ دکھایا جا چکتا ہے اور لوگوں کو تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا پھر ایسے وقت نمودار ہوتا ہے جب نئے سین کے لئے تیاری ہوتی ہے اور پبلک کی توجہ کو مشغول رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اصول فن سے ہٹے ہوئے یہ ڈھنگ سٹیج کی ضرورتوں کو پیش نظر جائز سہی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں اردو ڈرامے کی ترقی قدرتی بنیادوں پر نہیں ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما اب تک سوسائٹی کے سامنے (مسائل مجلسی کی) اصلی تصویر پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ جسے درحقیقت ڈراما کے مقاصد میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شیکسپیئر کے بہت سے ڈراموں کے ترجمے یا چربے اردو زبان میں موجود ہیں ۔ ہیملٹ، ٹمپسٹ، (*The Tempest*) جولئیس سیزر، کلیوپیٹرا، ہنری دی ففتھ، رومیو اینڈ جولیٹ، سٹیج پر دکھائے جاچکے ہیں ۔ طالب بنارسی نے لٹن کے ڈرامے موسوم بہ (*Night and morning*) کا ترجمہ ''لیل و نہار'' کے نام سے اردو میں کیا ۔ اسی مصنف کا ڈرامے ''ہریش چندر'' ہندو ماخذ پر مبنی تھا ۔ طالب بنارسی کی طرح آغاحشر نے بھی ہندو ماخذ سے بہت کام لیا ہے ۔

آج کل بہت سے مصنف اس سلسلے میں عمدہ کام کر رہے ہیں لیکن سینما کی بولنے والی تصاویر کے رواج عام نے تھیٹر کی ترقی کو بڑا دھکا لگایا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں فن ڈراما کی مستقبل میں کیا حالت ہوگی ۔ مغربی ممالک میں بھی

ناطق تصاویر کی وجہ سے ڈرامے کو کچھ نقصان پہنچا ہے لیکن اس حد تک نہیں ۔ کیونکہ یہ فن ان ممالک میں صدیوں سے معراج کمال پر ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب بھی لوگ اس میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے سلسلے میں بڑی سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ ھندوستان میں ڈرامے کی ترقی کے لئے جو قوتیں صرف ہوسکتی تھیں ، وہ اب ان کہانیوں کے معیار کو بلند کرنے میں صرف ہوں گی جو خاص سنیما کے لئے لکھی جارہی ہیں ۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ تبصرہ جامع اور مکمل نہیں، تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس سے اردو ادب پر مغربی اثرات کی کمیت اور کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا ۔ قومیت، جمہوریت، اشتراکیت اور بین‌الاقوامیت اور اس نوع کے دوسرے مضامین سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ وہ اس تبصرے میں شامل نہیں ۔ ان کو پڑھنے سے ان اثرات کا جو اس وقت ھندوستانی ادب اور تصورات پر شدت کے ساتھ وارد ہو رہے ہیں اور ادب کے راستے سے ہو کر جمہور کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں، بڑی اچھی طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

(فروری ۱۹۴۳ء)

سید محمد عبداللہ

اردو کا جرمن شاعر فرانسو اور اس کی تصنیفات

ہوا جو شعروں کا مضمون فراسو کا مشہور
ضرّیز - خامۂ گوہر فشاں بلند ہوا

جل گیا برق تجلی سے فراسو صاحب
ید بیضا ہے ہر اک صفحۂ دیواں میرا

زبان اردو کی ہمہ گیری اور عالم گیری کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کے خدمت گزاروں میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل ہیں ۔ ہمارے ہندو بھائی تو خیر خانوادۂ اردو کے چشم و چراغ اور حقیقی وارث ہین اور اس جائداد پر حق شفع کے معاملے میں برابر کے شریک ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ترک، مغل، یہودی، انگریز، پرتگیز اور جرمن بھی اس کے متولی ہونے کے بجا طور پر دعویدار بن سکتے ہیں ۔



ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

حقیقت میں یہ سب کچھ زبان اردو کی فطری کشش اور ہماری تہذیب کے نقوش کی رنگینی اور گیرائی کا اثر تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں جو یورپین ہندوستان میں وارد ہوتے تھے، وہ آج کی طرح ہمیں ''لاطینی و لادینی'' کے دام میں گرفتار نہ کر سکتے تھے بلکہ اس کے برعکس جب وہ ہماری تہذیب و تمدن کے نگارستان میں داخل ہوتے تھے تو اس کے نقش و نگار سے حیرت زدہ ہوکر اس کے والہ و شیدا بن جایا کرتے تھے ۔ تذکرہ کریم الدین اور گلشن بےخار وغیرہ میں ہمیں بہت سے شیدائیان ادب اردو کا پتہ ملتا ہے جو ریختہ کی زلف گرہ‌گیر کے اسیر اور اس کے کاکل پیچاں کے پابہ‌زنجیر تھے ۔ الیگزینڈر ہیڈرلی، آزاد، سوبر، اسیر، شور اور فرانسو انہی لوگوں میں سے تھے جنھوں نے عمر بھر زبان اردو میں مشق سخن کی اور ان میں سے بعض بہت سی تصانیف یادگر چھوڑ گئے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان صاحبان ذوق اور ارباب شوق کا حال معلوم کرنا اور ان کی یاد میں عقیدت اور تحسین کے پھول چڑھانا ہمارا اولین فرض ہونا چاہئے ۔ یہ وہ عالی طبع لوگ تھے جنھوں نے ہماری زبان میں زبان کھول کر دنیا پر یہ ثابت کیا کہ کبھی ہم ایشیائی بھی اس قابل تھے کہ دنیا کے عقلا اور فضلا ہماری زبان اور ہمارے ادب سے تعلق پیدا کرنے کو قابل فخر بات سمجھتے تھے ، اور ان روشوں اور خیالوں کی دل و جان سے پرستش کیا کرتے تھے جنھیں دور جدید کے کپوت اور بزرگوں کی میراث کو ضائع کردینے والے ناخلف کنکھیوں سے دیکھتے ہیں ۔

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

اسی خیال سے آج کی محفل میں میں ایک جرمن نسل کے اردو شاعر، فرانسو کا تذکرہ کرتا ہوں جو شاہ نصیر کا شاگرد تھا۔ اور اپنے ادبی کام کی وسعت اور کثرت کی وجہ سے ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔

اس ضمن میں میں یہ عرض کروں گا کہ ۱۹۳۹ء میں جناب پیارے لال شاکر میرٹھی نے ادبی دنیا (لاہور) کے سالنامے میں اس شاعر کے متعلق ایک مضمون سپرد قلم فرمایا تھا۔ یہ مضمون کئی وجہ سے مفید اور پراز معلومات ہے۔ لیکن وہ اس لحاظ سے ضرور غیر مکمل ہی رہا کہ فرانسو کی ساری تصانیف مقالہ نگار کے سامنے نہ تھیں۔

خوش قسمتی سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں فرانسو کی کچھ تصانیف موجود ہیں جو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے عطا کردہ مجموعے میں ہیں۔ چونکہ یہ تصانیف شاکر صاحب کی نظر سے نہیں گزریں، اس لئے میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ فرانسو کے متعلق مزید خامہ فرسائی کی جائے تاکہ اس نامور جرمن شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات یک جا ہو جائیں۔

فرانسو کی تصنیفات کے تجزیے سے پہلے اس کے مختصر حالات زندگی کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کا نام فرانسو گاڈلیو (یا گاڈلیب) کوئنس تھا۔ والد

کا نام گاڈلیپ (۱) کوئنس تھا ۔ چنانچہ کتاب ''مرآۃ حسن و عشق،، کے خاتمے میں خود اپنے حالات یوں لکھتا ہے :

''خاتمہ کتاب مرآت حسن و عشق تصنیف و تالیف فرانسو کوین صاحب قوم فرنگ جارمن یعنی بزبان فرانسزی (کذا) الیمان ساکن ولایت پولند، نام والد جان کدلیپ کوین صاحب ولایت پولند سے بسن شانزدہ ہفتدہ سالہ ہندوستان میں وارد ہوکر دخترایفور (؟) شوالیر صاحب قوم فرانسیسی اہل ولایت سے شادی کی، جو یہ مصنف کتاب فرانسو کوین صاحب شہر شاہجہان آباد میں عہد سلطان شاہ عالم بصیرکے زمان میں پیدا ہوا اور بیگم شمرو صاحب کے پاس نشو و نما پاکر تا سن شباب کے اب پہنچا اور اس کتاب کو تصنیف و بہ شعرائے فارسی گویان شاعران ماضی اور حال کے تالیف کر کے واسطے ملاحظہ صاحبان اس فن کے لکھا،، ۔

(دیوان فرانسو قلمی ورق ۱۳۹ـــالف)

مسرت افزا کے دیباچے میں فرانسو نے اپنی تاریخ ولادت ۱۵ مارچ ۱۷۷۲ء بتلائی ہے چنانچہ کہتا ہے :

''من بعد مصنف کتاب مسرت افزا غمزدا (کذا) فرانسو کوین ولد جان کارلیو کوین قوم جارمن ولایت پولند تخت گہ شاہ الیمان، مؤلف کتاب متولد شاہجہان آباد، کٹڑہ بیگم

(۱) مسرت افزا (قلمی) کے دیباچے میں ''کارلیو،، درج ہے شاکر میرٹھی نے اس کے والد کا نام ''اگسٹن کوئنس،، لکھا ہے ۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ فرانس (صحیح فرانسو) کوین کی ولادت سردھنہ میں ہوئی تھی ۔ لیکن فرانسو کے اپنے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے ۔

اندرون چاندنی چوک، تولد بانزدهم ماه مارچ ۱۷۷۲ء در حیات سلطنت شاه عالم بادشاه هند بروز شنبه۔ ۔ ۔ وغیره،،۔

گزشته عبارات سے یه واضح هوا که فرانسو شاهجهان آباد میں پیدا هوا ۔ اس کی والده ایک فرانسیسی خاتون تهیں ۔ فرانسو کے والد بعد میں غالباً بیگم شمرو کے هاں ملازم هوگئے تهے ۔ فرانسو بهی اپنے والد کےهمراه ان بیگم صاحبه کے زیر سایه رهے اور بعد میں ترقی کر کے فوج کے کپتان بن گئے تهے ۔

اس سلسلے میں یه بتانا دلچسپی سے خالی نه هوگا که بیگم شمرو (زیب النساء) والٹر راٹن هارڈ کی بیوه تهیں ۔ یه صاحب ایک سپاهی پیشه شخص تهے اور هندوستان میں انهیں لوگ (*Sambru*) کهه کر پکارا کرتے تهے۔ ان کا انتقال ۱۷۷۸ء میں هوا ۔ آن کی بیگم نے جنهوں نے ان کے بعد ان کی جاگیر اور ان کے فوجی دستے کا انصرام و اهتمام کیا ، شاه عالم بادشاه کے زمانے کی سیاسیات میں بڑا حصه لیا ۔ شاه عالم بادشاه نے اسے ،، فرزند عزیزه،، کے خطاب سے ملقب کر رکها تها ۔ اس کا انتقال ۱۸۲۵ء میں هوا ۔

بیگم شمرو کے حالات زندگی خود اس کے اپنے منشی لاله گوکل چند نے زیب التواریخ کے نام سے لکهے تهے ۔ اس کتاب کا ایک نسخه برٹش میوزیم میں هے ۔ اس کے علاوه منشی جے سنگه رائے نے بهی نثر میں اس کے حالات زندگی قلمبند کیے تهے۔

مزید حالات کے لئے دیکهو فرینکلن کی تاریخ شاه عالم ص۱۵۰ ۔ جیمز سکنر، ملٹری میموائر ص ۲۷۹ ۔ سلیمن، ریمبلزاینڈ ری کالیکشنز، جلد ۲ ص ۲۷۷ ۔ کین، فال آف دا مغل ایمپائر ص ۲۹۷ (ماخوذ از ریو، ج ۲، ص ۷۲۳) ۔

جب تک یہ بیگم صاحبہ زندہ رہیں فرانسو ان کی ملازمت میں رہے۔ بیگم بھی ان پر بہت مہربان تھیں اور اکثر اُن کو اعزاز و اکرام سے نوازا کرتی تھیں۔ ۱۸۳۶ء میں بیگم صاحبہ کے مرنے کے بعد اس کے متوسلین پراگندہ ہوگئے اور فرانسو بھی ہرچندپور پہنچ کر وہیں مقیم ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فرانسو کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، جن کا حال خود اس نے مثنوی ''ظفرالظفر'' میں (جوشا کر صاحب کے بیان کے مطابق فارسی میں تھی) بیان کیا ہے۔ اس مثنوی میں وہ بڑی تفصیل کے ساتھ غدر کے اُن واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے ہرچندپور کا علاقہ متاثر ہوا اور جن کا تعلق براہ راست مصنف اور اس کے دوستوں کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ شور میرٹھی فرانسو کے ''وقائع غدر'' سے بھی ان حالات کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ یہ شور میرٹھی فرانسو کا نواسا تھا اور فرانسو کی طرح اردو کا ماہر اور مصنف تھا۔ چنانچہ اس کی مثنوی ''دہلی مرحوم'' اور دوسرے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ غرض ان سب ماخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسو نے ہنگامۂ غدر میں مصیبت زدگان کو آرام پہنچانے اور خود مصیبت میں پڑ کر ان کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ مسٹر ہالینڈ دہلی کے کوارٹر ماسٹر، ڈاکٹر بیسٹن اور دیگر انگریزوں کو عرصے تک اپنے گھر مہمان رکھا اور ان میں سے جو مجروح تھے ان کی مرہم پٹی کی اور شفایاب ہونے کے بعد انہیں کسی دوسری جائے امن تک پہنچایا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷ جولائی ۵۸ء کو شاہ مل نے ہرچندپور پہنچ کر فرانسو کا گھر لوٹ لیا اور انہیں اور ان کی غیر منکوحہ بیوی کو (جو ایک جے پوری عورت تھی، اور

''بائی صاحبہ،، کے نام سے مشہور تھی) طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ مگر خوش قسمتی سے فرانسو ان سب آزمائشوں میں زندہ و سلامت رہا اور وہ اور ان کی بائی صاحبہ جولائی کے آخر میں میرٹھ پہنچے اور ھنگامۂ غدر کے فرو ہونے تک وھیں مقیم رہے۔

جناب شاکر نے شور صاحب کے ''وقائع غدر،، سے فرانسو کی وفات کے بارے میں ایک اقتباس پیش کیا ھے ، جسے میں درج ذیل کرتا ھوں :

''...... ناگاہ جولائی ۱۸۶۱ءکو مسٹر فرانس کوئنس صاحب نے بباعث کبرسنی دنیائے دوں کو پدرود فرمایا۔ برکت و رونق خانۂ فیض کاشانہ اپنے کو یک قلم آٹھایا ۔ اگرچہ مرنا سب کو برحق اور جینا بے یاد الہیٰ ناحق ھے، ولے ایک امیر کا انتقال فرمانا ایک چشمۂ فیض کا بند ھو جانا ھے - ...... صاحب مرحوم اپنے دم قدم سے مجموعہ سخا و کرم بالضرور تھے اور ملک الشعراء بھی مشہور تھے - ...... قبل از دو سال وفات اپنی کے تمامی جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ ازان خود کہ ایک لاکھ روپے کی تھی مع چار دیہات دیگر عطیہ سرکار فیض آثار، بائی صاحبہ زن غیر منکوحہ اپنی کو بذریعہ وصیت نامہ مصدقۂ عدالت عطا فرما گئے ۔ حق تلفی جمیع وابستگان اپنے کی کہ دس بارہ آدمی حی‌القائم ھیں فرما کر ان کو خاک میں ملاگئے ۔

دل و دیدہ اپنے تھے آشنا، سو وہ درد و غم میں پھنسا گئے
ھمیں جن سے چشم امید تھی وھی صاف آنکھیں چرا گئے

فرانسو شعر و شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''مسرت افزا،، کے دیباچے میں خود لکھتے ھیں :

''شاہ نصیرالدین کو استاد اس فن کا تعین کیا،،۔

اس کے علاوہ ذیل کے شعر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

تجھ کو ہے شاید فرانسو فیض اصلاح نصیر
شاعران شہر میں تو اہل دیوان بن گیا

وہ اپنی کتابوں میں شاہ نصیرالدین کے اشعار بطور سند کے پیش کرتے۔ ان کی شاعری کا تذکرہ ''گلشن بے خار،، اور بعض اور تذکروں میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرانسو ایک طومار نویس شخص تھا۔ وہ صرف اردو کا شاعر ہی نہ تھا بلکہ اس نے اردو زبان کی ضخیم لغات لکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ اردو کی لسانیات کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں اور فن انشاء میں کچھ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ شاکر صاحب نے اپنے مضمون میں میں فرانسو کی کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ درج ذیل ہے:

۱۔ نظم انشاء مسمی بہ نسیم دلکشا۔ منظوم رقعات کا مجموعہ۔

۲۔ مجموعہ قصائد۔

۳۔ دیوان ہجویات۔

۴۔ مجموعۂ مثنویات۔ اس میں ۱۴ مثنویاں ہیں:

(۱) کشش عشق (۲) چراغ خانۂ عشق (۳) گلشن عشق (۴) مطلع نور (۵) افراط نشاط (۶) سرنامۂ ایام (۷) اندوہ ربا (۸) آتش سودا (۹) دشت عبرت (۱۰) شمع انوار

(۱۱) عالم شوق (۱۲) سرمایۂ بہار (۱۳) مجموعۂ استہزا
(۱۴) تنبیہہ الغافلین ۔

۵ ۔ نظم قطعات بہ اوزان دوہرہ ۔

۶ ۔ مثنوی ظفر الظفر (فارسی) ۔

۷ ۔ دیوان فارسی ۔

۸ ۔ دیوان ہزلیات

۹ ۔ دیوان غزلیات ۔

۱۰ ۔ قصیدہ مبارکباد فتح قلعہ بھرت پور ۔

۱۱ ۔ دیوان (کتب خانہ لالہ سری رام) ۔

شاکر صاحب کا بیان ہے کہ فرانسو کی متعدد تصانیف ہنگامۂ غدر میں ضائع ہوگئیں ۔ مگر مندرجہ بالا تصانیف کو خود انھوں نے دیکھا ہے ۔ افسوس ہے کہ راقم الحروف کو ان میں سے کسی ایک کتاب کو بھی دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا ۔ البتہ ذیل کی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ، جن کا میں نے بہ امعان مطالعہ کیا ہے :

۱۲ ۔ مسرت افزا ۔ مختصر لغات اردو الفاظ مفردہ کے ساتھ، سند بصورت شعر دے گئی ہے ۔

۱۳ ۔ لغات اردو مفصل جس میں محاورات بھی ہیں اور شواہد بکثرت دئے گئے ہیں (۲ جلد) ۔

۱۴ ۔ فرانسو کا دیوان اردو (۲ نسخے) ۔

۱۵ ۔ (نمبر ۱۴ میں) کتاب مرآۃ حسن و عشق جس میں عاشقانہ مطالب پہلے نثر میں ادا کئے گئے ہیں ، اس کے بعد فارسی اردو شعراء کے کلام سے ہم مضمون اشعار لائے گئے ہیں ۔

۱۶ - (نمبر ۱۴ میں) گلبن تمنا (یعنی جلد نہم از جام جہاں نما) یہ اردو زبان میں فن انشاء کی کتاب ہے ۔

۱۷ - (نمبر ۱۴ میں) عشق افزا ۔ ماہ طلعت اور ماہرو، مہرنگار اور محمود شاہ کا افسانہ اردو میں ۔

۱۸ - (نمبر ۱۴ نسخہ ثانی میں) عشرت‌النساء (؟) اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی عورتوں کے حسن کی تعریف و توصیف نثر میں ہے ۔

۱۹ - لغات مفصل (نمبر ۱۳) میں ایک مثنوی کا ذکر ہے جس کا نام ''آرام جان'' ہے ۔

۲۰ - (نمبر ۱۳ میں) گلزار ہفت خلد، کے نام سے کسی منظوم تصنیف کا تذکرہ آیا ہے ۔

میں نے تصانیف فرانسو کی جو نئی فہرست پیش کی ہے اس میں سے نمبر ۱۹ اور ۲۰ کو میں نے نہیں دیکھا ۔ لیکن ان کے علاوہ سب کتابوں کا خود مطالعہ کیا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کتابیں شاکر کی فہرست میں موجود نہیں ۔ پس اس خیال سے کہ فرانسو کے متعلق ہماری معلومات یک‌جا ہوجائیں ، میں نے یہ ارادہ کیا کہ یونیورسٹی لائبریری میں جو نسخے موجود ہیں ، ان پر گہری نظر ڈال کر اس شاعر اور مصنف کے علمی کام اہل علم و فضل کی محفل میں پیش کر سکوں تاکہ وہ اس دور کی تاریخ کے ان گم‌شدہ اوراق کی وہ قدر کریں جس کا استحقاق ان تصانیف کو حاصل ہے ۔

میں سب سے پہلے فرانسو کی لغت کی کتابوں کو لیتا ہوں ۔ فرانسو کی یہ لغات اگرچہ اردو کی اولین لغات میں سے نہیں ہیں

تاہم ان کا احاطہ اور دائرہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے ۔ ان سے پہلے جو لغات لکھی گئی ہیں ۔ ان میں یہ خاص طور پر مشہور ہیں :

فرگسن کی ہندوستانی انگریزی لغت ۱۷۷۳ء۔
کلیڈون کی قانونی اصطلاحات، ۱۷۹۷ء
گلکرائسٹ کی لغات، ۱۷۹۸ء—۱۸۰۰ء
شیکسپیئر کی لغات، ۱۸۱۷ء
ایلیٹ کی اصطلاحات ہندوستانی، ۱۸۴۵ء
فوربس، ہندوستانی لغت، ۱۸۴۸ء
فیلن، ۱۸۶۲ء، ۱۸۷۳ء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یورپین حضرات کو ہندوستانی زبانوں کی لسانی تحقیق سے بڑی دلچسپی تھی ، جس کا نتیجہ ان لغات اور متعدد دیگر تصانیف کی شکل میں ظاہر ہوا ۔ ہمارے مصنف فرانسو کی لغت کی کتابیں بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہیں اور کئی اعتبار سے قدر اور توجہ کے قابل ہیں جیسا کہ آگے آنے والی تفصیل سے ظاہر ہوگا ۔

مسرت افزا : در اصل ایک لغات ہے جس میں فرانسو نے صرف اپنے اشعار بطور سند پیش کئے ہیں ۔ افسوس ہے کہ مصنف نے لغات کی کہیں بھی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی ، ورنہ یہ کئی اعتبار سے ایک عمدہ لغت ہوتا ۔ اس میں ایک اور خامی یہ ہے کہ اساتذہ سے استشہاد کرنے کی بجائے اپنے ہی اشعار پیش کیے ہیں ۔ ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ اس میں بیشتر خالص ہندوستانی الفاظ درج ہیں ۔

باایں ہمہ اس سے لغت کا ایک ہیولیٰ ضرور تیار ہوگیا ہے ۔ کتاب میں بعض جگہ الفاظ تو موجود ہیں لیکن ان کی سند میں اشعار نہیں ۔ اس قسم کے بیاض بکثرت ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسو نے الفاظ پہلے لکھ لئے تھے ، پھر ارادہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ اپنے کلام سے شواہد مہیا کیے جائیں گے لیکن تکمیل کی فرصت نہ ملی ۔

مسرت افزا کے دیباچے کی عبارت یہ ہے :

''باسم پاک اللہ تعالی . . . . . . (مجروح)

''حمد و سپاس حضرت رب العالمین خالق ارض و سما . . . (مجروح) . . . . . . برگزیدہ خدا و اشرف الانبیاء و راہ نمائے اولیاء و اتقیا و پارسا و بر رائے صواب رضائے سخن شنوا، انصاف آشنا، پوشیدہ و مستور نہ رہے ۔ من بعد مصنف کتاب مسرت افزا غمزدا فرانسو کوین ولد جان کارلیو کوین، قوم جارمن ولایت پولند تختگاہ شاہ الیمان، مؤلف کتاب، متولد شاہجہان آباد کٹڑہ بیگم اندرون چاندنی چوک، تولد پانزدہ ماہ مارچ ۱۷۷۷ء در حیات سلطنت شاہ عالم بادشاہ ہند، بروز شنبہ کہ در عین عالم شروع شباب رغبت و میل تمام کہ شوق بملاحظہ اشعار قدما بزبان دری و اردوئے معلیٰ از دواوین ریختہ مثل شاہ حاتم و میرزا رفیع السودا و میر تقی میر و شاہ نصیر و انشاء اللہ خان و مصحفی و میر سوز وغیرہ کے ہوا ۔ شاہ نصیرالدین کو استاد اس فن کا تعین کیا اور کتب لغات و اصطلاحات اشعار دواوین کو مطالعہ میں رکھا، سخن ہائے استادان ماضیہ و حال سے استفادہ حاصل کیا ۔ مختصر کلام تا اربع . . . . . ؟ کہ ۱۸۵۸ء مصنف زندہ و حیات بانتخاب

اشعارات دیوان آردو ریختہ تصنیفات خود سے اس نسخہ مسرت افزا کو بنظر غور صاحبان والا شان عالی دودمان انگریز بہادر دام صولتہ، کے زمان میں اختتام پہنچا کر شہرہ جمیع خاص و عام میں جلوہ افروز کیا ، تا نتائج دولت ابد مقرون صفحات روزگار و اوراق لیل و نہار پر باق و مشتہر رہے - ابدالدھر ارباب فہم و دانش و اصحاب عقل و بینش، نفع اکمل حاصل فرمائیں کہ اسے نظیر و مثال شعری کام میں لائیں کہ اہل محفل و شائقان اس فن کے دل و جان کو گرماویں - امیدوار جناب ایزد تعالیٰ تقدس سے ہے کہ شعرائے زمن و زمانیان حال و استقبال، شاعر پسندان وصاحبان سخن بلاغت شعار، شائقان سخن فہمن، ہنگام ملاحظہ(؟) اس گلدستہ بے خزان کو مطالعہ میں لا کر مصنف مسرت افزا کو بدعائے خیر یاد فرماویں و زبان شکوہ و شکایت دراز نہ کریں - و السلام،، -

مسرت افزا میں الف سے لے کر یا تک سب ردیفیں ہیں لیکن یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں کہیں سے اوراق ضائع ہوگئے ہیں ، اس لئے کہ بعض ردیفوں کے الفاظ نسبتاً کم درج ہیں - بعض موقعوں پر فرانسو نے خود ہی بعض شواہد قلمزد کر دئے ہیں اور بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں لغات کو بدل دیا ہے -

میں اس موقعے پر مسرت افزا کی ایک فصل اس کتاب کے عام انداز کو واضح کرنے کی غرض سے پیش کرتا ہوں- یہ باب الفارسی مع التاء الفوقانیہ ،، ہے - یہ باب اس وجہ سے انتخاب کیا گیا ہے- کہ اس میں نسبتاً شواہد کم ہیں جو ان اوراق میں بآسانی درج کیے جا سکتے ہیں - اور ملال انگیز طوالت کے بغیر ناظرین

کو کتاب کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ ذیل میں میں لغات مسلسل لکھتا جاتا ہوں۔ جن الفاظ کے ساتھ شواہد ہیں وہ درج کر دوں گا:

پتا۔ پتا۔ پتر۔ پتھر۔

چکیاں چل جائیں سر پر تو بھی بیداری نہ ہو
آہ کیا پتھر پڑے بندی اثر پر ان دنوں

سخت جانی کو نہ اپنی دیکھ حیراں ہو خدا
بت پرستی اتنی کی میں نے کہ دل پتھر ہوا

پترا۔ پت۔ پت جھڑ۔

نکل کے عالم وحشت میں شہر سے سوئے دشت
ہم آئے سائے میں جس نخل کے ہوا پت جھڑ

پتلا۔ پتلا۔

اس کی طینت میں بھریں خالق نے ہیں نیرنگیاں
شعبدے نیرنگ کے مٹی کا پتلا کر گیا

پتلی۔

آنکھیں دکھائے وہ گل رعنا کسی طرح
ان پتلیوں کا دیکھیں تماشا کسی طرح

پتلیاں۔

بھلا میں دیکھ کر آنکھوں کو ان کی کیوں نہ حیراں ہوں
جو دیکھے پتلیاں ان آنکھ کی محو تماشا ہو

پتیلا۔ پتنگ۔ پتنگا۔ پٹ۔ پٹا۔ پچ۔ پچھم۔ پچر۔ پچھاڑ۔

دو چشم نے دل عاشق کو کر دیا لاچار
دو ناتواں نے پچھاڑا ہے اک توانا کو

جتانا - پدر - پر - پرت - پرتاب - پرج - پرچہ - پرچھائیں - پڑیہ - پرخاش -

مرا دل دوست ہے دشمن کا دشمن دوستداروں کا
برا انساں ہے وہ جو بر سر پرخاش ہوتا ہے

پر پرزہ - پرپرے - پردہ -

بے اختیار آنکھ لڑانی ہے گر تمہیں
پردہ حجاب رخ سے اٹھا ہوجے روبرو

پردہ در - پردہ دری - پردہ پوش - پردۂ زربفت - پردار - پردم - پر سرخاب - پرساں - پرش - (؟) پرست - پرستش - پرستان - پری - پری خانہ -

حسن کا جلوہ ترا ہے کہ پری خانہ ہے
جس نے دیکھا ترے مکھڑے کو وہ دیوانہ ہے

پرور - پرورش -

بصد خون جگر کی دل کی اپنے پرورش ہم نے

پرواز - پرکھ - پرگٹ - پری وش - پرن - پروردہ -

پروردہ حسن کے ہیں تیرے پھول گل تمام
چرچا چمن میں ہے ترا اے رشک نوبہار

پرواہ - پروان - پریشان -

اس کے پیچ و تاب سے دل میرا کچھ واقف نہیں؟
زلف کے کوچے میں جو آیا پریشان حال ہے

پرکالہ -

جلوۂ حسن جہاں سوز دکھا کر مارا
کیسا پرکالۂ آتش نے جلا کر مارا

پریدہ - پری پیکر -

اے پری پیکر میں دل سے تیرا دیوانہ ہوا
یہ ہوا روشن میں تیری شمع کا پروانہ ہوا (؟)

پرہیز - پژمردہ - پنہان - پژوھش - پس - پست - پستی - پستان - پسلی - پسار - پسر - پشت -

پشت خمیدہ کب متحمل ہو بار کی
کیونکر نہ بیگناھوں کے خوں سے ہو چرخ کج

پشت دست

جلوہ پشت دست نور افشاں
مہ خجل اس ابر میں پنہاں

پشتی بان - پشتارہ - پشک - پشم - پشیماں - پشہ - پف - پل -

جوش پر ہے بحر دل کا میرے موجیں مارتا
پل زدن میں اشک چشم تر مرا دریا ہوا

پلا - پلاؤ - پلک - پلارک - پنا - پنہاں - پنجہ -

کسی دیوانے کا سن چاک جگر کا احوال
دیکھئے لکھتا ہوں (؟) میں پنجہ و ناخن اپنے

پنجرہ - پنکھا - پنیر - پو - پوت - پوٹ - پوج - پوجا -

خدا کی بندگی ہو جائے بت پرستی جھوٹ
بتوں کو میں نے جو پوجا ہوا خدا دل گیر

چمک خورشید میں ذرے کی اور ہے سنگ میں آتش
مکاں ہے کون سا جس میں نہ اک جلوے کی پوجا ہو

وح - پود - پور - پوری - پوش - پوشش - پوشاک - پوریاں - پھایا - پہاڑ - پھاڑ - پھٹ - پھٹکا -

بدگمانی سے یقیں پاس نہ میرے پھٹکا
سچ ہے یہ وھم کا دارو نہیں لقمان کے پاس

پھدک - پھر - پھرا - پھپھولا - پھل - پھلا - پھولا -

آج پھولا چاھتا ھے کوئی اس گلشن میں گل
چشم تر رکھتا ھوں سودائی ھوں مجنوں سے زیاد

پھول - پھبن - پھونک -

عشق کی آتش دل نے حس میں میرے پھونک دی
جان کر کوڑا میرے دل کو و خس خاشاک کا

سرد مہری دیکھ دل کی اس کے آہ گرم نے
دل نے جسم ناتواں میں میرے آتش پھونک دی

پھلجڑی

دھن ھے پھلجڑی باتوں میں اس کے پھول جھڑتے ھیں

پھندنا - پھانسی - پھنس - پھوٹ - پھوٹی -

پھوٹی ھوئی قسمت نے دکھایا اسے ویران
اک روز یہ قصر (؟) بھی تھا خانۂ معمور

پھونچا (پہنچا)

آیا نہ ھات ھات میں پائی نہ دسترس
پونچے تلک بھی ھاتھ نہ پہنچا کسی طرح

پھونچی (پہنچی)

پہنچی نہ پست عقل کبھی فکر تیز کو
وضع سبک ھی جس کی ھو پھر اس کا کیا گناہ

پھن - پیا - پے - پیادہ - پیار - پیام - پت - پیدا - پش - پیشاب - پیشانی - پش - دھن - پیک - پیکان - پیکر - پیدا - پیل - پیلا - پیمان - پیمانہ -

ہو گیا لبریز پیمانہ ہمارے عیش کا
جام اک رخصت کا اب ہم کو پلایا چاہئے

پے - پیدائش - پیچش - پیمان - پیچ - پیغام - پیر - پیرھن - پیتمبر - پیشوا - پیش بین - پیچدار - پیکار - پیمائش - پیمود - پیزار - پیوند وغیرہ -

فرانسو کی دوسری کتاب جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اس کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا - یہ بھی ایک لغت کی کتاب بلکہ ایک ناقص سا سائیکلوپیڈیا ہے جو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے کتاب خانے سے یونیورسٹی میں منتقل ہوا ہے - اس کی دو جلدیں ہیں - افسوس ہے کہ اس میں صفحات کی ترتیب کچھ درست معلوم نہیں ہوتی - اس لئے کہ ردیف الف کے بہت سے اجزا جلد ثانی میں نظر آتے ہیں اور ردیف ب جلد اول میں ہے غرض کچھ اس طرح کی بے ترتیبی ہے کہ میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکا اس بارے میں کہ یہ دو مجلد اس کی الگ الگ تصانیف کے باقی ماندہ اوراق ہیں یا ایک ہی تصنیف ہے جس کے اوراق کی تصنیف میں فرق آگیا ہے -

اب میں اس خیال کے ماتحت کہ یہ در اصل ایک ہی تصنیف ہے جس کے اجزاء میں تقدیم و تاخیر واقع ہوگئی ہے اس کے مضامین کی ضروری تفصیل بیان کرتا ہوں -

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں فرانسو کی یہ تصنیف خالی خولی لغت نہیں بلکہ اس کی سکیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرانسو کا منشا ایک طرح کا سائیکلوپیڈیا اردو تیار کرنا تھا۔ اس میں سب زبانوں کے تمام وہ الفاظ، اصطلاحات، محاورات و امثال جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا استعمال اردو زبان میں ہوا یا ہوسکتا ہے ۔ الفاظ کے معنی پہلے فارسی میں بیان ہوئے ہیں اس کے بعد اردو میں ۔ اکثر موقعوں پر شعرائے اردو کے اشعار سے استناد کیا گیا ہے ۔ فرانسو کے اپنے اشعار بھی بہ کثرت ملتے ہیں ۔ اس میں بعض علمی تاریخی اور فنی الفاظ کی نہایت طول طویل تشریحیں موجود ہیں ۔ لغات فرانسو میں علمی بحثوں کا انداز جدید ترین تو نہیں ہے لیکن اپنے عصر کے اعتبار سے اس کے اندراجات خاصے مفصل اور جدید رنگ لئے ہوئے ہیں ۔

بعض الفاظ کے ہندی، ترکی، کشمیری، انگریزی، پشتو اور عربی مرادفات بھی ملتے ہیں۔ فرانسو کی طبیعت میں ظرافت کی طرف خاصا میلان نظر آتا ہے۔ چنانچہ جا بجا کہانیاں، نقلیں، لطیفے، نکتے اور افسانے تشریح کے ضمن میں لائے گئے ہیں مثلاً ذیل کے الفاظ کی تشریح ملاحظہ ہو :

آبدست، آب دزد، آثا، آخوند، آدم، آدر، آدم، ابدال، آنڈ، فولاد، قاضی، قرض، فاسق، فاجرہ، فالنامہ، فتوا، باز، بازرگان، برھمن، بیسوا وغیرہ ۔

فرانسو کو مفتیوں، قاضیوں اور ملاؤں کی کہانیوں سے خاص دلچسپی تھی۔ جنسی اور شہوانی قسم کے لطیفے اور غلیظے بھی کتاب میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

تاریخی الفاظ پر فرانسو کے نوٹ کچھ زیادہ تو نہیں لیکن جو ہیں خاصے طویل ہیں ۔ مثلاً بیدر اور تلنگ کی تشریح میں دکن کی مختصر سی تاریخ دے دی ہے ۔

فارسی شاعری کے مخصوص استعاروں اور تشبیہوں کو قدرتی طور پر بڑی جگہ دے دی گئی ہے ۔ مثلاً اشک، آہ، فلک، شمع، پروانہ وغیرہ وغیرہ ۔

اس کتاب کا مرتبہ ایک عام لغت سے کچھ زیادہ نہیں ۔ مگر بعض موقعوں پر اچھی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مثلاً آداب کی بحث میں فن انشاء کے ضروری امور زیر بحث لائے گئے ہیں ۔ اسی طرح آئین کی بحث کسی حد تک مفید ہے ۔ فرانسو نے شالامار کو ترکی لفظ قرار دیا ہے اور اس کا معنی آرام محل لکھا ہے ۔ فلذات کی تشریح بھی طویل ہے ۔

فرانسو اپنے مذہبی معتقدات میں بہت پختہ ہے ۔ ہرچند کہ وہ اپنی کتاب کو بسم اللہ الرحمان الرحیم سے شروع کرتا ہے اور مسلمانوں کے گہرے معاشرتی اثر میں ڈوبا ہوا ہے ۔ لیکن اسلام اور عیسویت کے معاملے میں مسیحیت کی حمایت کرتا ہے اور اسلام اور قرآن پر حملہ اور اعتراض کرنے سے بھی نہیں چوکتا ۔ مثلاً ابن اللہ اور قرآن کی تشریح میں، جہاں مناظرہ کے عنوان سے قرآنی تعلیمات پر معترض ہوتا ہے ۔

فرانسو نے اس لغات میں اپنے اشعار سے بکثرت استشہاد کیا ہے ۔ دوہرے، غزلیں، مثنوی کے اشعار، رباعیاں غرض ہرصنف نظم کے انتخاب تشریحوں کی شہادت میں نظر آتے ہیں ۔ شاہ نصیر (جنہیں فرانسو اکثر موقعوں پر شاہ نصیرالدین لکھتا ہے) میر تقی میر، سودا،

جرأت، نظیر اکبر آبادی، رنگین، جان صاحب، ہدایت وغیرہ کے اشعار بھی بطور سند لائے گئے ہیں ۔

ان کے علاوہ صاحب قران کے اردو اشعار سے بھی استناد کیا گیا ہے ۔ ملاحظہ ہو بھائی بند ، پاپوش وغیرہ ۔

رائج الوقت زبانوں اور بولیوں کے نام بھی لیتا ہے ۔ مثلاً علاوہ اردو کے جسے ہندی بھی کہتا ہے، لہجہ مردم دہلی، دیار ہندی پوربی وغیرہ کا تذکرہ کرتا ہے ۔

فرانسو اس لغات میں الفاظ کے تلفظ کی تعریفیں نہیں کرتا وہ اپنے مآخذ کا ذکر کہیں نہیں کرتا حالانکہ اس کے زمانے میں اردو کی بعض لغات تصنیف ہوچکی تھیں ۔

اس لغات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصنف کی کسی منظوم تصنیف (غالباً دیوان) کا نام ''گلزار ہفت خلد،، تھا ۔ اس کی ایک مثنوی کا تذکرہ بھی اس لغات میں آیا ہے جس کا نام ''مثنوی آرام جان،، تھا ۔

افسوس ہے کہ یہ لغات مکمل نہیں ۔ اس کا آغاز ندارد ۔ مندرجہ ذیل ردیفیں (کم و بیش) اس میں موجود ہیں ۔ ردیف الف کے بعض اجزاء، اس کے بعد ب سے لے کر ش تک (تقریباً مکمل) اس کے بعد ف اور ق کے بعض اجزاء لیکن موجودہ حالت میں کتاب کی ترتیب درست نہیں ہے ۔ الف کے الفاظ کو جلد اول میں آنا چاہیے ۔

فرانسو کی تصانیف نثر میں ایک رسالہ موسوم بہ ''گلدستہ حسن و عشق،، ہے (ملاحظہ ہو ورق ۹۴۱۔الف) یہ نسخہ ''دیوان

فرانسو،، کے نسخۂ اول میں ہے اور دیوان کے خط سے اس کا خط مختلف ہے ۔ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے ۔ اس میں فرانسو نے اپنی جدت طبع کا ثبوت دیا ہے ۔ یہ ایک طرح کی بیاض ہے ۔ سب سے پہلے مصنف نثر میں کچھ عاشقانہ مطالب لکھتا ہے جو غالباً شعرائے فارسی کے اشعار سے ماخوذ ہیں ۔ اس کے بعد اردو اور فارسی کے کے ہم مضمون اشعار لاتا ہے ۔ اس بیاض کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فرانسو کو شعرائے فارسی کے کلام پر بڑا عبور تھا فردوسی، انوری اور خاقانی سے لے کر متوسطین و متأخرین تک سب کے اشعار پیش کرتا ہے ۔ اشعار کا انتخاب بڑا عمدہ، حسب موقعہ اور بر محل ہے اسی طرح اردو کے اشعار بھی نہایت دل پسند و دل نشیں ہیں ۔

کتاب کا دیباچہ موجود ہے اگرچہ امر کی بعض سطریں کتابوں کے عشاق جفاکار یعنی کیڑوں کی نذر ہوگئیں اور کچھ دستبرد زمانہ کا شکار ہوکر ضائع ہوگئی ہیں ۔ بہر حال جو موجود ہے درج ذیل ہے :

" . . . . . ثنائے لاتعد خدائے پاک کو کہ خلقت انسان کو بحسن خلق . . . . . مخلوق کو پیدا کیا و بتائید ربوبیت صاحب حسن و عشق مشتہر و منور بنایا، انواع ثنا و صفات و ستائش بے انتہا سزاوار قادر قدیر مقدس خداوند کبریا و نعت گوناگوں بذات مجمع صفات حضرت عیسیٰ مسیح روح اللہ صلوات اللہ علیہ ۔

خامۂ جامع نویسان نسخہ رنگین و سرانجام بخش کار سترگ آئین حال و احوال عاشقان حقیقی و مجازی و معشوقان پردہ دار و

بے پردہ بہر روش کے، صورت آغاز تا اختتام بخشا ۔ من بعد ہیچمدان ناچیز ناتوان فرانسو کوہن ولد جن کارلبو کوہن قوم جارمن از ولایت پولند مصنف کتاب بنظر فیض اثر صاحبان سخن نظم و نثر بہدیۂ تازہ و لطف بے اندازہ باشعار و غزلیات و رباعیات بزبان اردوئے معلی بسان بہار نقش و نگر چین بہ ہزارہزار شگفتگی و شادابی برنگ سبد گل گلزار رشک رخسار گلعذار ہمیشہ بہار پیش نظر صاحبان بلاغت شعار کے پردہ چہرۂ حقیقت سے اٹھایا،، ۔

کتاب کا نام دیباچے میں مرقوم نہیں ۔ البتہ خاتمے میں جس کی عبارت اس سے پہلے درج کی جا چکی ہے، موجود ہے ۔

اب میں اس کتاب کا طرز ظاہر کرنے کے لئے کچھ فقرات عاشقانہ پیش کرتا ہوں جن سے انداز تصنیف کے علاوہ مصنف کی نثر کا بھی کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

آغاز فقرات عاشقانہ : ''اوقات عاشق فراق دیدہ ہجران کشیدہ باشعار خوانی و باظہار حال زبانی لیل و نہار بغم یار جانی کے گذرے، ظہورلاثانی ہے ۔ (اس کے بعد غزل فرانسو دی گئی ہے ۔)

فقرہ: جو شرائط عالم واقع میں درج ن آ ° مشاہدہ میں دیدۂ عاشقاں میں جلوہ دکھائے ۔

فقرہ : بیقرار عشق و محبت کو بے وصال محبوب حقیقی رغبت معشوق طلسم ظاہری دشوار ہو ۔

عاشق نے سرائے (؟) معشوقہ میں کس قدر روز و شب دست روزگار ستم شعار سے پنجۂ دشمنان اغیار ظلم کار سے کھینچ کر معشوق کو کنج عزلت میں لایا ۔ فراسو صاحب ۔

فقرہ صفت معشوق : حسن معشوق نے گوئے صباحت و ملاحت کی آفتاب و ماہتاب سے لی - یک جلوہ سرا پا ناز سے ہزار در عشرت و مسرت روے و دل عاشق پر کھولے نرگس نے چشم بند کر کے سر خجالت کا نیچے زمین پر جھکایا - سرو و شمشاد نے خجل ہو کر قامت گل و لالہ میں کیا نگہ تبسم آمیز فتنہ انگیز - ،،

اشعار سراپا معشوق :

ماہ چرخ چنبریں لکھا مطلع انوار کو
صورت شمس الضحیٰ کہہ صفحۂ رخسار کو

کیوں بیاض سادہ لکھوں میں رخ دلدار کو
سورۂ یوسف کہوں اس مصحف رخسار کو

ہے شب یلدا دیا ہے وہ طلسم ابر شام
دود آہ عاشقاں لکھ زلف کے طومار کو

ایک اور فقرۂ نثر ملاحظہ ہو :

''عاشق نے قصۂ معشوق کو گوش کیا، خود کو فراموش کیا آہ گرم و سرد جگر سے کھینچی، اشک حسرت دیدہ سے برسایا، خون دل چشم سے گرایا، روتا کہتا تھا مثل میں بیچارہ جہان سے آوارہ کو اس کواکب (کذا) سپہر قدر و شوکت سے کیا نسبت، لیکن اے معشوقہ کشور محبت، دولت دنیا کو اور ایام حسن جوانی کو کیا اعتبار، یہ سراپا ناپائیدار، نہیں ہے ان کو ایک جا قرار - کہیں ناز ہے اور کہیں نیاز ہے - عمدگیٔ ہمدگان نظر عقلا میں لائق بقا کے نہیں، باسباب ظاہر اعتماد حسب و نسب کا برقرار ہے - ،،

اس کے بعد صائب کی ایک غزل ہم مضمون درج ہے -

غرض گلدستۂ حسن و عشق میں اسی طریق سے عاشقانہ مطالب کو ادا کرنے کے لئے اشعار (اپنے اور دوسرے شعرا کے) جمع کیے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں بھی (فرانسو کی اور کتابوں کی طرح) فحش اور عریاں خیالات کا اظہار بہت ہے۔ مصنف کے لئے یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اس میدان میں اترتا ہے تو صفحوں کے صفحے سیاہ کرتا جاتا ہے۔

گلبن تمنا (یا جلد نہم از جام جہان نما)

دیوان فرانسو کے نسخہ اول کے صفہ ۱۴۹۔ الف سے ایک اور کتاب شروع ہوتی ہے جس کا نام گلبن تمنا بتایا گیا ہے۔ مگر سرنامے میں اسے ''جلد نہم از جام جہان نما،، بھی کہا گیا ہے۔ میں اس کے دیباچے کی ساری عبارت کو نقل کرتا ہوں :

روح القدس

رب یسر بسم اللہ الرحمان الرحیم و تمم بالخیر

(سرنامہ) گلبن تمنا، کتاب نثر، عبارات بطرز انشاء پردازی بخطاب القاب و آداب از اعلیٰ باوسط بادنیٰ از تألیف فرانسو کوبن صاحب، جلد نہم از جام جہان نما شروع ہوتی ہے بمدد خدا۔

(دیباچہ) زواہر جواہر حمد و سپاس بیرون از اندازہ قیاس نثار بارگاہ رب العلا، نیاز کبریا محض بفیض و احسان و فضل نامتناہی جہان و جہانیان کو بہزار زینت و زیبائی کے، تشریف ہستی کا پہنایا ہے، جس کو چاہا بافسر خلافت فرمانروائی بمرتبہ بلند سلطنت و کشور کشائی کے سرفراز و ارجمند فرمایا، تعالی تقدس شانہ، و

اعظم برھانہ،تواتر احسانہ، و درود محدود بر مہر سپہر رسالت شمع انجمن نبوت و ھدایت سرور انبیاء و رسل سرجریدۂ ھادیان کہ رایت علیہ و نصرت برساحت جہان برافراشتہ آئنہ دین و ایمان کو بمصقل حسن اجتہاد زنگ شرک و بدعت سے متجلی کیا ۔

مکشوف مرأت رائے . . . . ؟ یہ نسخہ ہے گلبن تمنا، علوم انشاء و فنون املا حسب استعداد منکہ فراسو کاڈلیب کوین تسوید مکاتبات و مراسلات بضمن تمنائے احبا و اھل طلب صفائح زبان پر برنگ نامہ اعمال کو اسود کیا، امید زبان دوستان طالبان فن سے اس قدر ہے کہ فقرات و عبارات ھیچ پوچ پر خیال نہ کر کے حسب الامکان نظر استہزا و خوردہ گیری سے معاف رکھ کر قلم باصلاح جاری کریں، عیوب سے مخفی و محتجب رکھیں ۔،، اس کے بعد کتاب شروع ھوتی ہے چھوٹے چھوٹے عنوان کے ماتحت مختصر سے بیانات ھیں ۔ مثلاً بیان معنی انشاء کے نیچے لکھا ہے :

''انشاء مصدر ہے لغت میں بہ معنی پیدا کرنا دراصطلاح ارباب دارالانشاء نثر ہے . . . . وعبارت ہے سلیس جو کچھ منشی بنام خورد و بزرگ و برابر کے لکھے، انشا اس کا نام ہے،، ۔

منشی کے عنوان کے نیچے لکھا ہے :

''صیغہ اسم فاعل لغت بمعنی پیدا کنندہ در اصطلاح شخص صاحب ملکہ ھر علم میں مہارت تام ھر فن میں صورت تمام رکھے ۔ تقریر تحریر الفاظ کہ ملال لاوے اس سے احترازواجتناب

لازم ہے ؛ اور تطویل کلام سے پرہیز کرے تا سامع کے لئے مکروہ طبع کے نہ ہو،، ۔

حاصل یہ ہے کہ اس طریق سے مصنف آسان عبارت میں انشاء اور منشی سے متعلق مطالب کو ذہن نشین کراتا جاتا ہے اس کے بعد کے عنوانات یہ ہیں :

معنئ املا (اس کے ضمن میں انشاء اللہ خاں کا حوالہ دیا گیا ہے) اقسام نثر : مرجز، مرصع، عاری، بلاغت کا معنی، سلامت کا معنی، اقسام مکتوب، توقیع و فرمان و نشان، بیان فصاحت (کذا) منشی، بیان انکسار نویسی، ذکر قواعد نویسی، قاعدہ آداب و القاب، مقام خاتمہ، مقام یوم و تاریخ و سن و سال ۔

اس کے بعد تاریخ علم انشاء کو ایک خاص عنوان سے شروع کرتا ہے ۔ اور خطوط نویسی کے ۳۸ قواعد بیان کرتا ہے ۔ اس کے بعد تجلی اول بالقاب و آداب . . . . سلاطین و شاہزادگان و بیگمات ، پھر القاب عرائض مراتب اعلیٰ مثل بادشاہان . . . . مرشد و پدر و استاد . . . .وغیر وغیرہ ۔

اظہار تعظیم شقہ و رسیدن کتابت اعلی و اوسط و ادنے کے وغیرہ وغیرہ ۔

عرض عدم رسید و استدعائے توجہ . . . . الخ، رقعہ سفارشی، عذر تقصیر . . . . . . ، استدعائے عفو جرائم، رسید ہدیہ و تحفہ ۔

یہ انشاء صفحہ ۲۰۸ پر ختم ہوجاتی ہے اور چونکہ دفعتہً منقطع ہوجاتی ہے اس لئے قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناقص اور نا تمام ہے ۔

افسانۂ مہ جبین و مہ طلعت وغیرہ

دیوان فرانسو کے نسخہ اول میں ایک اردو افسانہ بھی ہے جو دفعتاً شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا دیباچہ اور ابتدائی حصۂ ندارد۔ اس کا صحیح نام بھی معلوم نہ ہو سکا مضمون سے معلوم ہوا کہ یہ پرانے طرز کی عشقیہ کہانی ہے جس کے کردار مہ جبین، ماہ طلعت، مہر نگار، گل چہر، ماہ پیکر، اور محمود شاہ ہیں۔ نثر کے ساتھ ساتھ اردو اشعار بکثرت دئے گئے ہیں اور سٹائل پر تکلف ہے۔ محبوب کے سراپا کا مضمون بار بار دھرایا گیا ہے۔

خاتمے میں مصنف نے اپنا نام لکھا ہے۔ اور افسانے کا نام شاید ''دلکشا،، دیا ہے۔

رسالہ در صفت زنان (؟۔عشرت النسا)

دیوان فرانسو کے نسخہ ثانی میں ایک اور رسالہ ہے جو اول و آخر سے ناقص ہے اور دیوان سے مختصر خط میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں اور قوموں کی عورتوں کے حسن کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے اس کی تائید میں قدیم شعرائے فارسی اور اردو کے اشعار سے استناد کیا ہے اور جابجا اپنے اشعار بھی لائے گئے ہیں۔ بعض جگہ سراپا بھی دیا ہے اور حسب معمول عریاں اور فحش اشعار موجود ہیں۔ کتاب کا نام معلوم نہ ہوسکا لیکن ایک جگہ یہ سرخی ہے : ''شعر فرانسو مصنف عشرت النسأ،، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالے کا نام ''عشرت النسأ،، ہی ہوگا۔

ان تصانیف نثر کے بعد فرانسو کے دیوان شعر کا تجزیہ باقی رہ جاتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ کیفی میں فرانسو کے ضخیم دیوان کے دو نسخے موجود ہیں ۔ اس کے پہلے نسخے کا نمبر K. P. F, I. 3 ہے اس کی تقطیع بڑی ہے ۔ ہر صفحے پر دو دو کالم ہیں ۔

بظاہر یہ نسخہ فرانسو کا خود نوشتہ معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس بارے میں کوئی بات یقینی اورقطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی ، تاہم خیال یہی ہے کہ مصنف کا اپنا لکھا ہوا ہے ۔

ہر صفحے میں ۲ کالم ہیں ۔ ایک کالم میں نثر ہے اور دوسرےکالم میں غزلیات ۔

دیوان کے دوسرے نسخے کا نمبر (K. P. F. I. 3) ہے ۔ اس کے اوراق بڑی تقطیع پر ہیں ۔

یہ نسخہ بھی غالباً فرانسو کا خود نوشتہ معلوم ہوتا ہے ہر صفحے پر ۲ کالم ہیں ۔ اس دیوان میں چونکہ نثر کا رسالہ صرف ایک ہے اس لئے دیوان کے بیشتر حصے میں ایک کالم خالی پڑا ہے ۔

اس دیوان کی ترتیب میں بھی فرانسو نے بڑی جدت سے کام لیا ہے ۔ اس نے غزلیات کو عام دستور کے مطابق ردیف کے حروف کے اعتبار سے مرتب نہیں کیا بلکہ قافیے کے حروف کے مطابق اس بڑی ترتیب کے ساتھ ضمنی ترتیب ردیف کی بھی چلتی ہے ۔

ایک بڑے لطف کی چیز اس دیوان میں یہ نظر آئی ہے کہ شاعر بعض موقعوں پر غزل سے پہلے ان قوافی کی ایک فہرست دے دیتا ہے جن کا استعمال اس غزل میں کرتا ہے ۔ مثلاً ورق ۴۳ ۔ الف پر :

انگ ۔ اورنگ ۔ آھنگ ۔ پلنگ ۔ ترنگ ۔ تنگ ۔ بنگ ۔ چنگ خرچنگ ۔ دبنگ ۔ جنگ ۔ زنگ ۔ سنگ ۔ فرنگ ۔ لنگ ۔ نیرنگ خدنگ وغیرہ ۔

اسی طرح ورق ص ۱۲۵ پر :

اوبل ۔ اوجھل ۔ اوچھل ۔ تل ۔ جل ۔ خلل ۔ مثل ۔ ذلل ۔ کنول ۔ کل ۔ دخل ۔ محل ۔ مخمل ۔ پل ۔ ارمل وغیرہ وغیرہ ۔

اسی طرح ایک اور غزل سے پہلے :

تامل ۔ تساھل ۔ بلبل ۔ تجمل ۔ توکل ۔ تفضل ۔ تناول ۔ تحمل ۔ تغافل ۔ غل ۔ قلقل ۔ کاکل وغیرہ وغیرہ ۔

اس دیوان میں سہ غزلے ، چو غزلے بلکہ اس سے زیادہ ہم مطلع غزلیں ملتی ھیں ۔ فرانسو اس زمانے کا شاعر ھے جب دھلی کے مشاعروں میں شاہ نصیر اور ان کے معاصرین مثلاً حکیم ثناءاللہ فراق، حکیم قدرت‌اللہ قاسم، میاں شکیبا، مرزا عظیم بیگ، شیخ ولی‌اللہ محب، حافظ عبدالرحمان احسان، طویل غزلوں، سنگلاخ زمینوں اور ناقابل عبور قوافی کے ذریعے قوت آزمائی کیا کرتے تھے ۔ ایک سے زیادہ ھم مطلع غزلیں لکھنے سے یہ ثابت کرنا مقصود ھوتا تھا کہ شاعر کو زبان اور بیان، قوافی اور ردیف پر کس درجہ قوت اور قدرت حاصل ھے ۔

شاہ نصیر سنگلاخ زمینوں اور مشکل بحروں میں غزلیں لکھنے کے لئے خاص شہرت رکھتے ھیں چنانچہ یہ مطلعے آب حیات میں اس بات کی شہادت میں موجود ھیں ۔

صدا ھے اس آہ و چشم ترسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

مقطع ۔ نصیر لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو
بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نیز وہ غزل جس کامطلع یہ ہے ۔

شب کو کیونکر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں
جوں پروین و ھالۂ مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

اور مقطع ۔

اور بدل کے ردیف و قوافی لکھئے غزل اس بحر میں جلدی
تم نے نصیر اب خوب پنھایا سر پر طرہ ھار گلے میں

نیز ۔ بادہ کشی کے سکھلاتے ھیں کیا ھی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ھم نے جو دیکھا دو ھیں مہینے ساون بھادوں

اس بارے میں اتنا مبالغہ ھوا کہ شعر و غزل کی مکھیاں تک اڑائی گئیں ۔ فرانسو جیسا طومار نویس اس معاملے میں اپنے وقت اور دیس کی ریت سے الگ کیسے ھوسکتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ھاں ۱۷ اور ۲۲ اشعار کی غزلیں بکثرت موجود ھیں ۔ اسی طرح سہ غزلے، پنج غزلے بلکہ ھفت غزلے بھی ھیں ۔

وہ غزلیں جن میں روی کے الفاظ چار سے زیادہ بلکہ پورے پورے فقرے ھوں اس دیوان میں بہت ھیں ۔ مثل کے طور پر ذیل کی غزل ۔

ہے چشم تر آب رواں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
ھووے کسی کو کچھ گماں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

تیر ستم پہنچا بجاں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
آخر ھوا یوں امتحاں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

کوئی دم کے ھیں ھم مہمان کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
ھے ھر نفس ریگ رواں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

باتوں میں باتیں ھیں نئی باتوں میں باتیں پیار کی
پر ھر سخن آزار جاں کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

وغیرہ وغیرہ ۔

فرانسو کے اس دیوان میں، جہاں تک میں معلوم کرسکا، غزلیات کے علاوہ کوئی اور صنف نظم موجود نہیں ۔ اس کے اشعار میں خاصی پختگی اور متانت نظر آتی ھے ۔ مگر طومار نویسی کی علت کی بدولت اکثر موقعوں پر شعر برائے قافیہ ھے۔ فرانسو کی بیشتر زندگی رندی، لاابالی پن اور عیش پسندی میں گزری ۔ اس کے تاثرات قدرتی طور پر اس کی شاعری میں نظر آتے ھیں ۔ کہیں کہیں عریانی اور فحش گوئی بھی ھے مگر یہ بات موجودہ دور کے عریاں نویسوں کو ضرور سن رکھنی چاھئے کہ فرانسو کی عریاں نویسی، اس کی قابلیت اور قدرت اظہار کی کوتاھی کا بہانہ اور پردہ نہ تھی بلکہ وہ جو کچھ کہنا چاھتا تھا اسے کہہ سکتا تھا بخلاف جدید دور کے مدعیان ''واقعیت،، کے کہ وہ جو کچھ کہنا چاھتے ھیں اس کو کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔ اسی لئے جو کچھ کہتے ھیں نہ کہنے کے برابر ھے بلکہ نہ سننے کے لائق ۔ فرانسو کے کلام میں بت فرنگ، محبوبان بے پردۂ بنگلہ، مئے ارغوان بت فرانسیس، بوس و کنار، غرض ھوا و ھوس کے تمام مناظر و واقعات نہایت عمدہ اور پختہ زبان میں ادا ھوئے ھیں ۔ اس میں شک نہیں کہ فرانسو کی جدت پسند طبیعت اردو شاعری بلکہ سارے ادب میں نئی راھیں پیدا کرنے کے لئے بےتاب نظر آتی ھے ۔ مگر ھمارے بزرگوں نے شاعری کی علمی بنیادوں کی مضبوطی کے بارے

میں جو کڑی شرائط لگا رکھی تھیں ان کی تکمیل، قافیہ و ردیف کی مشق اور الفاظ و تراکیب پر قدرت، اور مناسبت و تلازمت سے گہری واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ شاعری عبارت ہے اظہار جذبات سے، جس کے لئے زبان و بیان کے خوبصورت سانچوں اور قالبوں کی بیحد ضرورت ہے اور یوں تو درد دل کا اظہار ''نثر'' کے بے رنگ نقوش سے بھی ہو ہی جاتا ہے مگر آپ خون جگر کو جب تک رنگین و حسین شیشہ و مینا میں بھر کر سوز و گداز کی محفل میں نہ لائیں گے، بلند پایہ شاعر نہیں کہلا سکیں گے۔

اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فرانسو کی شاعری میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ ایک غیر قوم اور ملک کا باشندہ جسے ہندوستان میں آئے ہوئے ابھی ایک ہی پشت گزری ہے، اردو اور فارسی کے مخصوص پیرایہ ہائے بیان سے کس درجہ آشنا ہو جاتا ہے۔ ہم فرانسو کی ذہانت اور اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی عمومی تربیت کے طریقوں کی کامیابی سے ضرور حیران رہ جاتے ہیں۔ اگر فرانسو کے دیوان سے اس کے تخلص کو دور کر دیا جائے تو بھی ہم اس کے کلام سے اندازہ لگا سکیں گے کہ وہ پچھلی صدی کا اچھا خاصا پختہ مشق شاعر تھا۔

اب میں فرانسو کی ایک دو غزلیات نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

مطرب سنیں گے نغمہ ترا اور ترانہ ہم
لکھتے ہیں شوق سے غزل عاشقانہ ہم

حرص و ھوا کے سینے میں اپنے جگہ نہیں
خاروں کی طرح رکھتے ھیں اپنا خزانہ ھم

نغمہ ترا تو کب ھے سزاوار گوش عشق
مطرب سنائیں تجھ کو اب اپنا ترانہ ھم

کیونکر نہ اس میں صورت جانان ھو جلوہ گر
دل صاف کو سمجھتے ھیں آئینہ خانہ ھم

حال اس کا ھے جو پیچ و خم زلف کے تلے
سمجھے نہ کیونکہ اس کو دلا دام و دانہ ھم

الجھا ھے دل فرانسو کا زلفوں کے تار میں
رکھنے لگے ھیں ھات میں بھی اپنے شانہ ھم

* * *

دیکھ عالم ابروئے قاتل کے تیغ تیز کا
رتبہ حاصل ھے شہید خنجر خونریز کا

حسن سے عالم ھویدا ھے شراب تیز کا
وصل کی شب کا ھے عالم ساغر لبریز کا

غیر ساق بس قیامت ھے دم ساغر کشی
قلقل مینا ھے ھر دم شور رستاخیز کا

عشق سے نفرت ھے ھم کو حسن سے ھے احتراز
کوئی پوچھے تو بتادیں ھم سبب پرھیز کا

* * *

رھتا ھے جو طپاں دل غمناک رات دن
جاتا ھے درددل سوئے افلاک رات دن

دے کیونکہ چین گردش افلاک رات دن
روندے ھے اس کو تو سن چالاک رات دن

آزادگی کے ساتھ چلے تو چلے گئے
طے کرتے ہم ہیں راہ خطرناک رات دان
گزرے ہے روز چرخ سے میرا خدنگ آہ
ہے کش مکش میں جو دل غم ناک رات دن
صبح شگفتہ شام کو پژمردہ ہو گیا
افسردہ ہے مرا دل صد چاک رات دن

* * *

فرانسو کی شاعری کا بس یہی انداز اور نمونہ ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں کہیں بندش کی سستی اور خیال کا پھسپھسا پن پایا جاتا ہے مگر یہ خیال رہے کہ لکھنے والا ہولینڈ کا باشندہ اور جرمن قوم کا فرد ہے، اس جرمن قوم کا جس کی زبان اپنی کرختگی اور جس کے کام و دھان درشتیٔ تلفظ کے اعتبار سے کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ ایسے شخص سے اگر اس قسم کی کچھ غلطیاں سرزد ہوجائیں تو مقام شکایت نہیں ۔ خاتمے سے پہلے میں اس رائے کا اظہار کردینا چاہتا ہوں کہ فرانسو کی نثر کی کتابیں موجودہ حالت میں اس کی نظم کی کتابوں پر ترجیح رکھتی ہیں اور ان میں سے بعض یقیناً اس قابل ہیں کہ زیور طبع سے آراستہ ہوں علی‌الخصوص فرانسو کی لغات مفصل تو اس بات کا بجا استحقاق رکھتی ہے کہ لائبریری کے تہ خانے سے نکل کر منظر عام پر آئے اور اپنے لائق مصنف کی قابل فخر یادگار بنے۔

غرض نقشیے است کز ما یاد ماند
کہ دوران را نمی بینم بقائے

(مئی ۱۹۴۴ء)



آغا محمد باقر

آغا محمد باقر

مرحوم انجمن پنجاب

اگر آج ہم کسی بڑے بوڑھے سے پوچھیں تو ہمیں کئی بڑی بڑی انجمنوں کے نام معلوم ہوں گے جو مختلف مقامات پر قائم ہوئیں اور کچھ عرصہ زندہ رہ کر فنا کی نیند سو گئیں - مرحوم انجمن پنجاب بھی ایک اسی قسم کی انجمن ہے جس کے کارناموں کی یاد تازہ کرنے کے لئے آج آپ حضرات یہاں تشریف لائے ہیں -

انجمن پنجاب کا اصلی نام انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب تھا اور انگریزی میں اس کو *(Society for the diffusion of useful knowledge in the Panjab)* کہتے تھے، بعض رسائل میں جو انجمن اپنے دفتر سے شائع کرتی تھی صرف انجمن پنجاب ہی لکھا ہے اور اکثر سرکاری رپورٹوں میں بھی اس انجمن کو اس مختصر نام سے یاد کیا گیا ہے -

انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کے نام نامی پر جو حقیقتاً سنہری حرفوں میں لکھنا چاہیے تھا، آج تک گم نامی کا پردہ پڑا

رہا ہے - غالباً یہ پہلی تقریر ہے جس کی گونج آج پہلی مرتبہ فضائے ادب میں بلند ہو رہی ہے - میں اس مختصر سے وقت میں انجمن پنجاب کے مہتمم بالشان کارناموں پر پوری طرح روشنی نہیں ڈال سکوں گا پھر بھی حتی‌الامکان کوشش کروں گا کہ مختصر سے مختصر الفاظ میں آپ کا انجمن سے پوری طرح تعارف کرادوں -

سب سے پہلے تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مرحوم انجمن پنجاب کے حالات مجھ تک کیونکر پہنچے -

۲۸ - مئی ۱۹۳۲ء کی گرمی مجھے آج تک یاد ہے - دن بھر لو کے جھکڑ چلتے رہے - رات کے وقت سخت آندھی آئی - خاک و باد کے طوفان سے دم رکا جاتا تھا - رات کے بارہ بجے کا عمل تھا - دن بھر کے تھکے ہارے لوگ نیند کے نشے میں بیہوش پڑے تھے - محلے میں ایک دم شور پڑگیا ''آزاد منزل میں آگ لگ گئی'' - آزاد منزل کی درمیانی منزل سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے - جتنی دیر میں بالائی منزل پر سونے والوں کی آنکھ کھلے، تمام عمارت شعلوں سے جگمگا اٹھی - چالیس مرد عورتوں اور بچوں نے بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچائیں - آندھی کے جھکڑ سے آگ پھیلتی چلی گئی - کوئی آدھے گھنٹے کے بعد آگ بجھانے کے انجن موقع پر پہنچ گئے اور دو گھنٹے کی لگاتار کوشش کے بعد تین انجن اس قیامت خیز آگ کے بجھانے میں کامیاب ہوئے - جب آگ بجھ چکی تو معلوم ہوا کہ آٹھ گھروں کا تمام اثاث البیت جل کر راکھ ہو گیا - دوسرے دن صبح سے لے کر شام تک یہ تباہ شدہ لوگ مٹی اور راکھ ٹٹول ٹٹول کر اپنی بچی کھچی، نیم سوختہ چیزیں نکالتے اور لے جاتے رہے - تماشائیوں کا

ایک بے پناہ ہجوم تھا جو روکے نہ رکتا تھا ۔ شام کے وقت میں نے اپنے ملازم سے کہا : "جلے ہوئے مکان کے دروازے پر قفل لگا دو" ۔ ملازم نے دروازے کو مقفل کردیا اور مجھے آکر بتایا کہ ایک الماری میں پرانے کاغذات کے بستے بھرے ہوئے ہیں ۔ میں نے کہا جہاں تک مجھے یاد ہے اس مکان میں ہماری کوئی چیز نہ تھی ۔ اس نے اصرار کیا تو میں نے خود جاکر دیکھا ۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک الماری مولانا آزاد کے کاغذات اور مسودات سے بھری پڑی ہے ۔ الماری کے دروازے جل کر راکھ ہوگئے تھے ۔ اکثر بستوں کے غلاف بھی جل چکے تھے ۔ سارے کاغذات پانی سے شرابور تھے ۔ لیکن پھر بھی کوئی کاغذ ضائع نہ ہوا تھا ۔ آپ اسے معجزہ کہیں یا کچھ اور، لیکن یہ ایک حقیقت ہے جسے میں نے آپ کی خدمت میں بغیر کسی آمیزش کے عرض کردیا ۔ میں نے اسی وقت اس الماری کو خالی کیا ۔ بھیگے ہوئے بستے اپنے مکان میں جاکر کھولے ۔ انھی کاغذات میں سے انجمن پنجاب کے ماہنامے کا ایک فائل برآمد ہوا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کی واقفیت کے حدود کو کسی قدر آگے بڑھانے کی سعی کروں گا ۔ ظاہر ہے ۲۸ اور ۲۹ مئی ۳۳ء کی درمیانی شب کی وہ قیامت خیز آتش زدگی، جس نے ایک عالیشان مکان کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کردیا اور ۴۰، افراد کو بستر نرم سے اٹھا کر خاکستر گرم پر بٹھا دیا ، اگر ان متبرک بستوں کو بھی اپنے شعلوں میں لپیٹ لیتی تو آج انجمن کے نام اور کام پر ہمیشہ کے لئے گمنامی کے تاریک بادل محیط ہو جاتے۔

۱۸۵۷ء کے تباہ کن ہنگاموں کے بعد ہندوستان کے معاشرتی اور تعلیمی نظام کا شیرازہ بالکل منتشر ہوگیا تھا۔ جب ان لوگوں کے ہوش و حواس بجا ہوئے جو اس بگڑے ہوئے نظام کو دوبارہ سنبھالنے کے اہل تھے تو جگہ جگہ انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوئیں۔ چنانچہ بنارس، لکھنؤ، شاہجہان پور، بریلی، کلکتہ کو اس قسم کی انجمنیں قائم کرنے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ پنجاب میں بھی اسی قسم کی ایک تعلیمی انجمن سکشا سبھا کے نام سے جاری ہوئی۔ یہ انجمن صرف بچوں کی تعلیم کے کام میں دلچسپی لیتی تھی۔ سرکاری ملازمین اور چند رؤسا اس کے سر پرست اور مددگار تھے۔ لیکن سکشا سبھا ان بلند مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی تھی جن پر فائز ہونے کے لئے ہر ایک قوم بلکہ ملک کے جوہر قابل خواہش‌مند ہوا کرتے ہیں۔

۲۱ فروری ۱۸۶۵ء کو سکشا سبھا کے مکان میں ایک تاریخی جلسہ ہوا۔ اس میں لاہور کے تمام دوست حضرت اور رؤسا شامل تھے۔ پنڈت من پھول صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر میرمجلس تھے۔ انہوں نے کمال فصاحت و بلاغت سے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے صاحبان! ہم کئی برس سے اس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ و لکھنؤ وغیرہ اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے، ایک مجلس، رئیسان نامی گرامی، عالم و فاضل شائق ہر علم و ہنر کے، ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقیح مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم و ہنر کے تحریراً و تقریراً عمل میں آ کر بذریعہ چھاپہ منتشر ہوا کرے۔

مگر یہ مطلب ہمارا بدون میسر ہونے ایک زبردست عالم و فاضل ، وحید عصر کے اب تک حاصل نہیں ہوسکتا تھا ۔،،

اس تقریر کے ذریعے پنڈت صاحب نے ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو لائٹز صاحب کا تعارف کرایا ۔ ڈاکٹر صاحب انگلستان سے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہوکر آئے تھے اور بڑے علم دوست اور ہردل عزیز شخصیت کے مالک تھے ۔ پنڈت صاحب نے تجویز کیا کہ اس انجمن کانام اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب رکھا جائے ۔

منشی ہرسکھ رائے سیکرٹری فارسی شعبہ اور باہو نوبین چندر رائے صاحب سیکرٹری انگریزی سیکشن منتخب ہوئے ۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب پریزیڈنٹ چنے گئے ۔

اس انجمن کے مندرجہ ذیل حضرات ممبر بنائے گئے :

(۱) ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور۔
(۲) دیوان بیج ناتھ صاحب ۔ ای ۔ اے ۔ سی لاہور ۔
(۳) فقیر شمس الدین صاحب آنریری مجسٹریٹ لاہور ۔
(۴) نواب عبدالمجید خان آنریری مجسٹریٹ لاہور ۔
(۵) پنڈت موتی لال صاحب مترجم محکمۂ لفٹنٹ گورنر پنجاب ۔
(۶) ڈاکٹر رحیم خان صاحب اسسٹنٹ سول سرجن سپرنٹنڈنٹ میڈیکل کالج لاہور ۔
(۷) ڈاکٹر راما چرن بوس اسسٹنٹ سول سرجن لاہور ۔
(۸) سردار بھگوان سنگھ جاگیر دار امرت سر ۔
(۹) شیخ فیروز الدین رئیس لاہور ۔
(۱۰) منشی جیشی رام ای ۔ اے ۔ سی امرت سر ۔
(۱۱) منشی امین چند ای ۔ اے ۔ سی سیالکوٹ ۔
(۱۲) منشی حکم چند ای ۔ اے ۔ سی راولپنڈی ۔

(۱۳) سید هادی حسین خان ای - اے - سی گجرات -

(۱۴) محمد حیات خان صاحب ای - اے - سی بنوں -

(۱۵) محمد برکت علی خان تحصیلدار لاہور -

(۱۶) منشی موہن لعل تحصیلدار امرت سر -

(۱۷) منشی رادھا کشن رئیس لاہور -

(۱۸) پنڈت رام دیال دہلوی -

(۱۹) مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور -

(۲۰) رائے مول سنگھ رئیس لاہور -

(۲۱) مولوی محمد حسین نائب سررشتہ دار ڈائرکٹری پنجاب -

(۲۲) مولوی نیاز حسین مدرس مدرسہ تعلیم المعلمین -

(۲۳) مولوی علمدار حسین مدرس گورنمنٹ کالج لاہور -

(۲۴) بابو چندر ناتھ کیوریٹر محکمہ ڈائرکٹری -

(۲۵) پنڈت امرناتھ مترجم محکمہ جوڈیشل کمشنر پنجاب -

(۲۶) بابو شاما چرن ہیڈ کلرک ڈائرکٹری پنجاب -

(۲۷) منشی گوپال سہائے سررشتہ دار محکمہ فنانشل کمشنر پنجاب -

(۲۸) منشی گوپال داس سررشتہ دار کمشنری لاہور -

(۲۹) رائے گنیشی لال رئیس دہلی و آنریری مجسٹریٹ -

(۳۰-۳۴) بابو برج لعل - لالہ چتن شاہ - پنڈت رادھا کشن محمد علی، مصر جسونت رائے (طلباء میڈیکل کالج) -

پنڈت من پھول صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں تجویز فرمایا تھا کہ انجمن کے زیر نگرانی ایک عمدہ قسم کا کتب خانہ کھولا جائے - جس میں سب زبانوں کی علمی کتابیں اور اخبارات مہیا کئے جائیں - لیکن انجمن کے پاس اس وقت روپیہ

موجود نہ تھا اس لئے ممبران سے بہت سی کتابیں عاریتاً لے کر کتب خانے میں رکھی گئیں۔ اس لئے کتب خانے کی امداد کے لئے پنڈت من پھول صاحب اور منشی ہرسکھ رائے نے اپنے اپنے نج کے کتب خانے، انجمن کو دینے کا وعدہ فرمایا اور کئی پرجوش ممبروں نے بھی نہ صرف اس قسم کے وعدے کیے بلکہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان وعدوں کو پورا کردیا۔

پنڈت من پھول صاحب نے ۳۱۶ کتب عنایت فرمائیں۔
منشی ہرسکھ رائے نے ۵۳۸ کتب پیش کیں۔
پنڈت رادھا کشن نے ۳۷ کتب
ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے ۵۳ کتب
فقیر شمس‌الدین خان ۲۰ کتب۔
فقیر ظہورالدین خان ۱۴ کتب اور
لاہور کرانیکل نے ۴۷ کتب۔

انجمن کے مقاصد:

پنڈت من پھول نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس کے مقاصد نہایت وضاحت سے بیان کر دیے تھے۔ لیکن انجمن کے جلسوں کی کاروائیاں پڑھنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اس نیک نہاد انجمن کے مقاصد بلند سے بلند تر اور بلند تر سے بلند ترین ہوتے چلے گئے۔ اس لئے یہ کہنا درست ھے کہ جس نیک گھڑی میں اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ نہایت مبارک گھڑی تھی۔ ہم دیکھتے ھیں اس انجمن میں کام کرنے والوں نے اپنے کام اور انجمن کے نام سے خاطر خواہ فائدے اٹھائے، جمہور انام کو اس سے بیش از

توقع فوائد حاصل ہونے یہاں تک کہ یہ انجمن گورنمنٹ اور رعایا کے درمیان ایک معتبر ذریعہ رسل و رسائل کا بن گئی۔

ڈاکٹر لائٹنر صاحب اس کے پریزیڈنٹ تھے۔ انھوں نے ایک روز جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: انجمن کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس میں عام مفاد کے مضامین پڑھے جائیں۔ اگر وہ ترویج کے لائق اور پسندیدہ ہوں تو انجمن کے رسالے میں شایع ہوں اور اگر وہ گورنمنٹ کی توجہ کے قابل ہوں تو گورنمنٹ کو بھیج دیئے جائیں۔

معلوم ہوتا ہے شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کاروبار سرکار میں مداخلت کرنے سے ذرا کتراتے تھے۔ وہ ہر ایسے مضمون کو جسے انجمن کے معزز ممبر سرکار کو بھیجنا چاہتے، یہ کہ کر ٹال دیتے کہ ابھی ہماری انجمن ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔ ذرا پاؤں جم جانے دیجئے، ہم سب کچھ کر لیں گے۔ حکام خود اس انجمن سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ اس کے حالات دلچسپی سے سنتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ یہی مضامین جب رسالے میں شائع ہوں گے تو ان کی نظر سے گزریں گے اور وہ از خود ان معاملات پر غور کریں گے۔

قواعد جلسہ:

انجمن کا جلسۂ خاص ہفتہ میں ایک بار ہوتا تھا۔ شروع میں اس کے لئے جمعہ کا دن مخصوص تھا۔ بعد میں حسب ضرورت کچھ کچھ تبدیلیاں ہوگئیں۔ جلسۂ خاص ہونے کے بعد دوسرے ہفتہ میں سنیچر کے دن جلسۂ عام ہوتا تھا۔ جلسۂ خاص مجلس عاملہ

کو کہتے تھے - ارباب انجمن نے اس کا نام، کارکن کمیٹی رکھا تھا - کارکن کمیٹی کے ممبر. پنڈت من پھول، ڈاکٹر لائٹنر، منشی ہرسکھ رائے اور بابو نوبین چندر رائے تھے -

ابتدائی ایام میں انجمن کا جلسۂ عام شام کے پانچ بجے ہوا کرتا تھا - بعد میں ڈاکٹر صاحب کے ایماء پر اس لئے وقت تبدیل کر دیا گیا کہ صاحب لوگوں اور عہدہ داران سرکار کو اس وقت شریک جلسہ ہونے میں دقت ہوتی تھی - گویا جلسۂ عام ہفتے کے دن شام کے سات بجے منعقد ہونے لگا -

جوں جوں انجمن نے ترقی کی، اس کے قواعد و ضوابط کی طرف توجہ منعطف ہونے لگی - ارباب انجمن کے ایما پر ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے کچھ قواعد انگریزی زبان میں مرتب فرما کر جلسۂعام میں پیش کئے - ممبران انجمن نے ان کا ترجمہ سن کر پسند کیا -

۱ - ہر جلسے میں سیکرٹری گزشتہ جلسے کی تجویزات پڑھ کر سنائے۔ اگر وہ صحیح ہوں تو پریزیڈنٹ اس کی تصدیق کرے - اس کام کے لئے ایک منٹ بک مہیا کی جائے۔

۲ - اس کے بعد صاحب صدر مختصراً حاضرین جلسہ کو اس ترقی سے اطلاع دیں گے جو انجمن نے جلسہ گزشتہ سے کی ہو نیز وہ امور بتلائیں گے جن کی تنقیح مطلوب ہوگی -

۳ - صاحب صدر درجہ بدرجہ ان ممبروں کو یاد کریں گے جن کے مضامین سیکرٹری کے پاس پہنچے ہیں - ضروری ہے کہ ان کا خلاصہ سیکرٹری کے پاس ایک ہفتہ پیشتر پہنچ جائے -

۴ - جب کوئی کاغذ پڑھا جائے، سب چپ رہیں -

۵ - جب مضمون ختم ہو جائے، صاحب صدر ارباب انجمن سے رائے دریافت کریں -

۶ - جب کوئی صاحب گفتگو کریں تو بلا روک یا علامت بے صبری، ان کا بیان سننا چاہیے -

۷ - جب ایک صاحب اپنا مضمون ختم کر چکیں تو دوسرے مباحثہ کریں - اگر دو صاحب ایک دفعہ اٹھ کر تقریر کرنے لگیں تو اول وہ صاحب تقریر کریں گے جن پر صاحب صدر کی پہلے نظر پڑی ہے -

۸ - اگر کسی مضمون پر مباحثہ ضروری معلوم ہو تو صاف اور مختصر تجویز لکھ کر سیکرٹری کو دے دی جائے - صاحب صدر، ممبروں سے رائے لینے کے بعد اس امر کا فیصلہ کریں گے -

۹ - جو صاحب اس انجمن کا ممبر ہونا چاہیں وہ اپنی درخواست سیکرٹری کو بھیج دیں - درخواست پیش ہونے پر صاحب صدر، ارباب انجمن سے صلاح لے کر منظوری یا نامنظوری درخواست سے سیکرٹری کی معرفت اطلاع دیں گے -

۱۰ - سیکرٹری کے پاس پیش شدہ مضامین کی ایک فہرست موجود رہنی چاہیے جس میں نمبر شمار، تاریخ، نام کاتب خلاصۂ مضمون اور کیفیت منظوری یا نامنظوری درج ہو -

۱۱ - اگر مصنف موجود ہو تو خود اپنا مضمون پیش کرے ورنہ سیکرٹری کو اختیار ہے کہ وہ پیش کر دے ۔ کل مضامین نمبروار پیش ہوں گے ۔ اگر مضمون باقی رہ جائے تو وہ جلسہ آئندہ میں سب سے پہلے پیش ہوا کرے ۔

۱۲ - دیوان بیج ناتھ کی تجویز پر یہ قاعدہ بھی منظور ہوا کہ سب تقریریں دیسی زبان میں ہوا کریں ۔ اگر کوئی انگریزی میں ہو تو اس کا ترجمہ اسی وقت سنا دیا جائے ۔

۱۳ - یکم اگست ۶۵ء کو ڈاکٹر صاحب نے جلسہ خاص میں یہ تجویز منظور کرائی کہ :

بعض معاملات میں حاضرین جلسہ کو علانیہ رائے دینے میں تامل ہوتا ہے ۔ ایسے مواقع کے لئے ہر ایک ممبر اپنے پاس سیاہ اور سفید گولیاں رکھے ۔ انکار کی حالت میں سیاہ گولی اور اتفاق کی صورت میں سفید گولی ایک طرف میں ڈالدیں ۔ اخیر میں سب گولیاں نکل کر دیکھ لی جائیں ۔ جس قسم کی گولیاں زیادہ ہوں اسے غلبۂ آرا تصور کیا جائے ۔

اس تجویز پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی ۔ آخر قرار پایا کہ صرف ایسے مواقع پر جبکہ کوئی عہدہ دار مقرر کرنا ہو یا رازداری مطلوب ہو اس تجویز پر عمل کیا جائے ۔

۱۴ - صرف ممبر ہی اپنے مضامین جلسۂ انجمن میں پڑھ سکتے ہیں ۔

۱۵ - انجمن کی تجویزات اور جلسوں میں پڑھے ہوئے مضامین ایک رسالے کی صورت میں شائع ہوں گے ۔

۱۶ - اس رسالے کا نام رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب ہوگا -

۱۷ - ممبروں کو یہ رسالہ مفت دیا جائے گا - غیر ممبروں سے ۸ آنے فی پرچہ لیا جائے گا -

۱۸ - انجمن کی ممبری کی معمولی فیس ۸ آنے ماہوار یعنی چھ روپے سالانہ ہوگی -

۱۹ - انجمن کا معمولی جلسہ سلسلہ وار پندرہ دن کے بعد ہوا کرتا تھا -

۲۰ - اول تو صدر صاحب کبھی غیر حاضر ہی نہیں ہوئے - مگر جب انجمن کی کاروائی بہت باقاعدہ ہوگئی تو دوسرے کاموں کی وجہ سے غیر حاضر ہو جاتے تھے - ۱۸۶۹ء فروری میں یہ قاعدہ پاس کرنے کی ضرورت ہوئی کہ:

اگر صاحب صدر کسی ضروری کام کی وجہ سے نہ آسکیں تو سب کمیٹیوں کے صدر صاحبان میں سے جو صاحب پہلے تشریف لائیں ان کو صدر انتخاب کر لیا جائے - اگر کسی موقع پر کسی کمیٹی کا صدر موجود نہ ہو تو ممبروں میں سے جو صاحب سب سے پہلے جلسہ گاہ میں تشریف لائیں ان کو صدر تصور کیا جائے -

انجمن سے سرکاری افسران کی دلچسپی :-

میرے پاس انجمن کے چھ سات سال کے رسائل ہیں - ان کو

پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ انجمن سرکار کے ایماء پر بنائی گئی تھی - ۱۸۵۷ء کے بعد سے عوام انگریزوں سے بے حد بدظن اور بدگمان ہوگئے تھے - انگریز افسر اس بدگمانی کو دور کر کے کسی قدر اطمینان سے حکومت کرنا چاہتے تھے - اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے پنڈت من پھول کو اشارہ کیا اور پنڈت صاحب نے اس کے لئے میدان تیار کردیا - پنڈت صاحب خود اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور اس وقت گورنر پنجاب کے میر منشی کے عہدے پر فائز - وہ ایک ایسی انجمن جاری کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرسکتے تھے جو سرکار کے کاروبار میں رکاوٹ کا باعث ہوسکے - انجمن کے پہلے جلسے میں جن لوگوں کو ممبر انتخاب کیا گیا وہ سب کے سب سرکاری عہدےدار، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، آنریری مجسٹریٹ، رئیس اور جاگیردار وغیرہ تھے - بہر حال ان قیود اور پابندیوں کے باوجود اس انجمن نے نہایت شاندار کام کیا جس کے لئے وہ تحسین کی حقدار ہے

اس باب میں میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ سرکاری افسر کس انہماک اور شوق سے انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں کوشش کرتے تھے -

۲۳ مارچ ۱۸۶۵ء کو انجمن کا جلسہ ہوا - اس میں ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے اعلان کیا کہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اس انجمن کے قیام کی خبر سن کر خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اس انجمن کے مفصل حالات لکھ کر

ان کو بھیجے جائیں ۔

۱۷ - اپریل ۱۸۶۵ء کے جلسۂ عام میں مسٹر تھارنٹن سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب، مسٹر ایچیسن ڈپٹی کمشنر لاہور، مسٹر کولڈ سٹریم اسسٹنٹ کمشنر، مٹر گریفن جج عدالت خفیفہ لاہور اور بہت سے رؤساء رونق افروز محفل ہوئے ۔ صاحبان والاشان نے کتب خانہ انجمن کو دیکھ کر بےحد پسند کیا ۔ اس کے بعد جلسۂ عام میں شریک ہوئے ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اس جلسے میں ایک نہایت فصیح اور بلیغ تقریر فرمائی ۔ انجمن کے مقاصد بتاتے ہوئے انہوں نے ان صاحبان کا نام بنام ذکر فرمایا جنھوں نے اس انجمن کی امداد فرمائی ہے ۔ صاحب موصوف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا :

''مسٹر کوپر کمشنر لاہور بھی تشریف لانے والے تھے ۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکے ۔ انہوں نے ایک چٹھی کے ذریعے معذرت کی ہے اور لکھا ہے کہ میں اس انجمن کے کاموں میں دلی شوق رکھتا ہوں ۔ آپ میری مجبوری کا ذکر جلسے میں کردیں ۔ جب بھی آپ مجھے بلائیں گے ضرور آؤں گا ۔

یہ جلسہ بڑا پر جوش تھا ۔ پنڈت من پھول نے اس میں مروجہ تعلیم کے خلاف ایک زور دار مضمون پڑھا ۔ اس میں انہوں نے یہ بتلایا تھا کہ دفتروں میں کارکنوں کو از سرنو تعلیم دینی پڑتی ہے ۔ پنڈت صاحب کا دوسرا مضمون اصلاحی طرز کا تھا ۔ اس میں انہوں نے ہندوؤں سے اپیل کی تھی کہ بیاہ برات کے موقع پر

آپس میں گالم گلوچ نہ کیا کریں اور اس رسم بد کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیں ۔ جلسہ ختم ہونے سے پہلے مولوی محمد حسین صاحب نے ترقی و تجارت ہندوستان پر اپنا مضمون پڑھا۔ اسے سن کر حاضرین جلسہ بہت خوش ہوئے اور مسٹر تھارنٹن سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ نے مولوی صاحب کو اپنے پاس بٹھا کر تحسین کی ۔

آخر میں صاحب سیکرٹری حکومت پنجاب نے استادہ ہوکر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا اور انجمن کو بہمہ وجوہ کامیاب ہونے کی دعا دی۔ اس جلسے کے دوسرے دن مسٹر ایچیسن نے ۹ کتابیں کتب خانہ انجمن کے لئے بھیجیں اور ایک خط میں لکھا کہ میں اس سوسائٹی سے دلی تعلق رکھتا ہوں اور حتی الامکان امداد کرتا رہوں گا ۔

۲۲ - اپریل کے جلسۂ عام میں ڈاکٹر لائٹنر نے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی چٹھی پڑھ کر سنائی۔ اس میں مرقوم تھا: ''ہم اگلے جلسے میں شامل ہوں گے اور ہماری خواہش ہے کہ ہم اکثر شامل ہوا کریں، مگر بےتکلف اور بلا اطلاع ، جس سے یہ نہ پایا جائے کہ ہمارے واسطے خاص جلسہ ہوا ہے ۔

۲۹ - اپریل ۶۵ء کے جلسۂ عام میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بہ نفس نفیس مع دو تین اور صاحبان کے جلسۂ انجمن میں رونق افروز ہوئے۔ اول کتب خانے کا ملاحظہ فرمایا اور بہت محظوظ ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے اپنی تقریر میں تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے انجمن کی مختصر کیفیت سنائی۔ امتحانات کے انتظام اور ان کی کمیٹیوں کے ذکر کو سن کر گورنر بہادر

بہت خوش ہوئے - انھوں نے ایک سو پچاس روپے کامیاب طالب علموں کو دینے کے لئے عنایت فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ جن مقاصد کو لے کر یہ انجمن جاری ہوئی ہے، خدا ان کو سرسبز کرے - یہ وہ مقاصد ہیں جن کی مدت سے ہمیں تمنا تھی - جن لوگوں کی سعی سے اس کی ترقی ہو گی وہ لائق تحسین ہوں گے -

اس جلسے میں پنڈت من پھول نے طریقۂ تعلیم انگریزی کے نقائص بیان کیے - اس تقریر کو سن کر گورنر صاحب نے فرمایا ''دیسی زبانوں کا طریقۂ تعلیم بھی جیسا ہونا چاہئے نہیں ہے - جیسی تعلیم فارسی کی دیسی مکتبوں میں ہوا کرتی تھی، سرکاری سکولوں میں نہیں ہوتی - طالب علموں کو چاہئے کہ اپنے دیس کی زبانوں میں زیادہ ترقی کریں - یہ ٹھیک نہیں کہ غیر زبان میں ترقی کریں اور اپنی زبان سے بے بہرہ رہیں - اگر وہ اپنی زبان میں ترقی کریں گے تو غیر زبان میں ترقی کرنی آسان ہوگی - پرنسپل صاحب اور ڈائرکٹر صاحب کو اس بارے میں خوب کوشش کرنی چاہئے'' -

اس کے بعد مولوی محمد حسین صاحب دہلوی نے ایک مضمون ''در باب راہ و رسم سابق فی‌مابین ہنود و اہل‌اسلام و طریق فی‌مابین اہل ہند و اہل انگلینڈ'' پڑھا - یہ مضمون بہت طویل مگر بہت دلچسپ تھا - نواب گورنر بہادر نے اسے بہت پسند فرمایا اور مولوی صاحب کو تحسین کی نیز فرمایا ''اگر یہ ہمارے پاس انگریزی میں ترجمہ ہو کر آئے گا تو بہت خوب ہوگا - ہم اس انجمن کے کامیاب ہونے میں بہت خوش ہیں اور اس کے کاموں کی کیفیت سننے کے واسطے مشتاق ہیں'' -

انجمن کے بڑے بڑے ممبر جو سرکاری عہدوں پر فائز تھے، جب لاہور سے تبدیل ہو کر کسی اور جگہ جاتے تو وہاں انجمن کی شاخیں کھولتے اور انجمن کے ممبر بناتے تھے۔ مسٹر کولڈسٹریم جج عدالت خفیفہ نے دہلی میں انجمن کی شاخ کھولی۔ سر سکندر حیات خاں کے والد ماجد سردار محمد حیات خاں نے بنوں میں انجمن جاری کی اور تین سو روپیہ چندہ جمع کر کے مرکزی انجمن کو بھیجا۔ بیڈن پول صاحب جج عدالت خفیفہ نے ایک دوربین ستارہ نما اور ایک سو پچاس روپیہ نقد برائے لکچر فنڈ عنایت فرمائے۔ کرنل لیک فنانشل کمشنر کمال خوشی سے انجمن کے ممبر بنے۔ اس کے ساتھ ہی دو سو چالیس روپے لکچر فنڈ کے لئے عنایت فرمائے۔ سر رابرٹ جوڈیشل کمشنر پنجاب اور فورسائیڈ صاحب کمشنر جالندھر، انجمن کے جلسے میں شریک ہونے کے لئے خود لاہور تشریف لائے۔

گورنمنٹ اور انجمن :

اس باب میں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۸۶۸ء تک کس قدر کتابیں اور مضامین وغیرہ پیشگاہ گورنمنٹ سے اور ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اور دیگر مصنفین کی جانب سے رائے طلبی کے لئے انجمن پنجاب کے سپرد ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ارباب انجمن نے ان امور میں کیا کیا فیصلے صادر فرمائے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام صاحب رائے	خلاصہ رائے
(۱) مسئلہ شرعی درباب وراثت نسواں	نورتھ صاحب کمشنر جالندھر	فقیر شمس الدین و دیگر اہل اسلام	بموجب شرع شریف کے حصہ ملنا چاہئے
(۲) ترک سنکرہ و بیدانت سار	پنڈت بھان دت	بابو نوبین چند رائے	پسند ہوئی
(۳) قاطع برہان مرزا غالب	محکمۂ گورنمنٹ پنجاب	شیخ فیروز الدین صاحب	پسند ہوئی
(۴) کتاب اخلاق یعنی چراغ ہدایت	منشی محمد علی	رائے کمیٹی	پسند ہوئی
(۵) صرف و نحو اردو	سید مہدی حسن	فقیر سید جمال الدین	پسند ہوئی
(۶) نذر آقا	مولوی الفت حسین آمدہ محکمۂ ڈائر کٹری	مولوی محمد حسین	پسند ہوا
(۷) اشارات التعلیم	محکمۂ ڈائر کٹری پنجاب	مولوی علمدار حسین	قابل دستور العمل معلمان کے ہے
(۸) قصیدہ در مدح نواب لفٹنٹ گورنر بہادر	مولوی نجف علی قاضی جھجر از محکمہ لفٹنٹی پنجاب	مولوی محمد حسین	پسند ہوا
(۹) مضمون مولوی محمد حسین در جواب وسوالات نقص ہائے ریلوے	آمدہ محکمہ گورنری	ارباب کمیٹی	پسند ہوا

نام کتاب	نام مصنف	نام صاحب رائے	خلاصہ رائے
(۱۰) عجائبَ و غرائب	محمد سرفراز خان سرشتہ نہر جمن غربی آمدہ محکمہ گورنری پنجاب	صاحب سیکرٹری	بخوبی صحت اس کی نہیں ہے اور قابل ترویج اطفال نہیں ہے
(۱۱) گلزار ہندی	رائے کنھیا لعل، آمدہ محکمہ ڈائرکٹری پنجاب	مولوی محمد حسین سیکرٹری	پسند ہوا
(۱۲) روبکار ضلع لاہور	در باب انتظام جاتری لوگوں کے آمدہ محکمہ ڈائرکٹری	,, ,,	پسند ہوا
(۱۳) منتخبات فارسی	آمدہ محکمہ ڈائرکٹری	,, ,,	بعض بعض جگہ نقص ہیں
(۱۴) قواعد اردو	,, ,, ,,	,, ,,	,, ,,
(۱۵) رسالہ کلاں قواعد اردو	,, ,, ,,	,, ,,	,, ,,
(۱۶) منتخبات اردو	,, ,, ,,	,, ,,	پسند ہوئی
(۱۷) گلشن اخلاق	منشی بھولاناتھ میرٹھ	مولوی علمدار حسین	,, ,,
(۱۸) رسالہ بزبان ناگری	لالہ نہال چند	مولوی محمد حسین	ناپسند ہوا بسبب عبارت عاشقانہ
(۱۹) اوپدیش پنجک تعلیم نسواں	آمدہ ڈائرکٹری	,, ,,	پسند ہوا

نام کتاب	نام مصنف	نام صاحب رائے	خلاصہ رائے
(۲۰) ذخیرہ بال گوبند (رسالہ ماہواری)	آمدہ ڈائرکٹری	مولوی محمد حسین	پسند ہوا
(۲۱) اخلاق بہادری	منشی بہادر سنگھ فیروزپور از محکمہ ڈائرکٹری	,, ,,	,, ,,
(۲۲) پانچ جلد کتب گورمکھی	لالہ بہاری لعل	,, ,,	پسند ہوئیں
(۲۳) تزکیۃ الاخلاق	رحیم بخش مدرس دھلی آمدہ محکمہ ڈائرکٹری	مولوی عملدار حسین	عبارت اچھی نہیں ہے -

انجمن کے فوائد :

انجمن کے فوائد دو اصول پر مبنی تھے - اول ترقی علوم مشرقی دوسرا اشاعت مطالب مفیدہ - ترقی علوم کے سلسلے میں صرف یہی کہنا کافی ہو گا کہ انجمن کی طرف سے شروع ھی میں اشاعت تعلیم کی کوششیں جاری ہوئیں - مدرسوں مکتبوں اور پاٹھ شالوں کو امداد دینے کا اعلان ہوا - پھر عربی ، فارسی ، سنسکرت ، ھندی ، اردو کے امتحانات جاری کرنے کا انتظام کیا گیا - انعامات اور سندیں دینے کا بندوبست ہوا ، جس سے عوام کی

توجه حصول تعلیم کی طرف منعطف ہوتی چلی گئی ۔ اس سے اگلا قدم انجمن کے ممبروں نے یہ اٹھایا کہ پنجاب میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز سوچی ۔ اگرچہ یہ تجویز بہت دیر میں پروان چڑھی لیکن وہ یہی انجمن تھی جس نے پنجاب میں یونیورسٹی قائم کی ۔ انجمن پنجاب نے یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے جیسی سر توڑ کوششیں کیں ان کا ذکر میں یونیورسٹی کے باب میں کروں گا ۔ اس وقت صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ آج جس یونیورسٹی سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں طلبہ ، علم کی پیاس بجھا کر بلند مدارج حاصل کر چکے ہیں ، وہ اسی مرحوم انجمن کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔

۱ ۔ انجمن کے عام جلسوں میں ایسے مضامین پڑھے گئے جن کے سننے سے اخلاق کی تہذیب ہوئی ۔ اکثر مؤلفین مروجہ رسوم قبیحہ کا ذکر کر کے عوام کو ان کے ترک کر دینے کا مشورہ دیتے تھے ۔ بیشتر مضامین تحصیل علوم و فنون کی ترغیب کے لئے پڑھے جاتے تھے ۔ ظاہر ہے اس قسم کے مضامین تمام ملک کے لئے مفید تھے اور یہی وجہ تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ انجمن خاص و عام میں دور و نزدیک محبوب و مقبول ہوتی چلی گئی ۔

۲ ۔ انجمن کے جلسوں میں بعض ایسے معاملات پیش ہوتے تھے جن کا تعلق ہندوستان کے رہنے والوں کی بہتری اور بہبودی سے ہوتا تھا مگر وہ بغیر حکومت کی

عنایت اور توجہ کے حل نہیں ہو سکتے تھے ۔ ایسے معاملات کو انجمن کے ممبر ضروری گفتگو اور بحث کے بعد سرکار کو بھیج دیتے تھے ۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ انجمن نے جن معاملات کو سرکار میں پیش کیا ، ان پر سرکار نے ہمیشہ بہت ہمدردی سے غور کیا ۔ اور انجمن کی رائے کو اکثر افسران کی رائے پر ترجیح دی ۔

۳ ۔ بعض معاملات سرکاری افسر بغیر رائے عامہ دریافت کیے طے نہیں کر سکتے تھے ۔ ایسے معاملات سرکار کی طرف سے انجمن کو بھیج دیئے جاتے ۔ ارباب انجمن ان پر کمال ہمدردی سے غور کرتے اور پھر اپنی رائے سے حکومت کو مطلع کرتے تھے ۔

۴ ۔ رفاہ عام کے لئے انجمن نے ایک کتب خانہ جاری کیا تھا ۔ اس میں انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت، ہندی، گورمکھی وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں ۔ اس کتب خانے میں انگریزی، اردو، فارسی، عربی، ہندی کے اخبارات و رسائل بھی آتے تھے ۔

۵ ۔ ہفتے کے دن شام کے وقت مکان انجمن میں ہفتہ وار ایک علمی لکچر اور مشاعرہ ہوا کرتا تھا ۔ اس مین اہل فضل و کمال اور طلبہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے ۔ اوسط حاضری ایک سو کے قریب ہوا کرتی تھی ۔

انجمن کی ۱۸۶۷ء کی رپورٹ مولوی محمد حسین صاحب نے لکھی تھی۔ متذکرہ سال میں انجمن کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تحریر فرمایا:

۱ - یونیورسٹی علوم شرقیہ کا بار آور درخت یہیں سے نکلا۔

۲ - کتابوں کا محصول چنگی معاف کرایا گیا۔

۳ - پاگل خانوں میں واجب الرحم پاگلوں سے جو مشقت لی جاتی تھی، حکام کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

۴ - عجائب خانے میں سیر عام کی اجازت لی۔

۵ - قانونی سوسائٹی بنائی جو انجمن کی شاخ ہے۔

۶ - ضلع ضلع میں انجمن کی شاخیں کھولیں۔

۷ - حق مالکانہ و مزارعانہ کے باب میں حضور نائب السلطنت باجلاس کونسل کو متوجہ کیا۔

۸ - مقام فخر یہ ہے کہ دفعات مذکورہ بالا میں جس دفعہ کو خیال کریں، خواہ تربیت و شائستگی خواہ ملکی خواہ مالی، ہر جگہ کل پنجاب میں پریسیڈنٹ انجمن ڈائرکٹر لائٹنر صاحب کی برکت شامل حال ہے۔ الغرض اس ترقی کی کچھ حد نہیں معلوم ہوتی۔ قابل لحاظ کے بات یہ ہے کہ ترقی نہ صرف علم کتابی میں ہے بلکہ ہمت و حوصلۂ اصلاح عادات و اطوار میں بھی اس کا اثر ظاہر ہے اور امورات مذکورہ نہ فقط رعایا میں بلکہ حکام میں بھی مثل کشش آہن ربا، برابر زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔

امتحانات :

انجمن کا سب سے بڑا مقصد مشرقی علوم کو ترویج دینا تھا۔ اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے دیسی زبانوں میں امتحان لینے کی تجویز ہوئی۔ باقاعدہ ایک امتحان کمیٹی بنائی گئی۔ بابو نوبین چندر رائے اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ہندی امتحانات کے متعلق انہوں نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں، جو جلسۂ عام میں پسند ہوکر منظور ہوئیں۔ غور فرمایئے یہ تجاویز کس قدر سادہ اور جامع ہیں۔

۱ - یہ امتحان اکتوبر کے مہینے میں ہو گا۔

۲ - جسے امتحان دینا منظور ہو، آخر جولائی تک اپنی تحریری درخواست پریسیڈنٹ امتحان کمیٹی یا سیکرٹری انجمن کے پاس بھیج دے۔

۳ - اعلیٰ لیاقت والوں کو پچاس روپے تک انعام مع سند لیاقت ملے گا۔

۴ - اس امتحان کی دو قسمیں ہوں گی۔
قسم اول : دو طرح کے مضمون لکھوائے جائیں گے۔

۱ - ہر انسان کو واجب ہے کہ حتی‌الامکان پراوپکار یعنی بیگانے کام میں تن دھی سے کام کرے یا اپنے ہم‌جنس کو فائدہ پہنچاوے۔ پس دلائل سے ثابت کیا جاوے کہ پراوپکار کتنی طرح سے ہو سکتا ہے۔

۲ - راست بازی کی ضرورت اور اس کے فوائد دلائل سے

ثابت کیے جائیں - اور ان دونوں میں سے ایک مضمون کو ٹھیٹھ ہندی بھاشا جس میں کوئی لفظ فارسی زبان کا نہ ہو، لکھ کر امتحان کے وقت پیش کرنا ہو گا۔

قسم دوم : امتحان کے وقت ایک پرچہ سوالات کا دیا جائے گا، جس میں آسان نیائے، ویدانت اور نیتی شاستر کے سوالات ہوں گے اور جواب ان کا اسی وقت لکھنا ہوگا۔ تحریری سوالات کے ماسوا کچھ سوالات زبانی بھی پوچھے جاویں گے - چند اشلوک بہت آسان ایک پرچے پر لکھے ہوئے دیے جائیں گے۔ ترجمہ ان کا اسی وقت زبان بھاشا میں کرنا ہوگا۔

امتحان کا اعلان امتحان سے چھ ماہ پیشتر کیا جائے گا۔

ہر امتحان کے لئے الگ الگ کمیٹیاں بنائی گیئں - اس سلسلے میں ۲۷ - اپریل ۱۸۶۵ کے جلسۂ خاص میں مصر رام‌داس‌جی کا کا ایک خط پڑھا گیا - یہ خط نہایت دلچسپ تھا۔ مصر صاحب نے لکھا تھا کہ ''مجھے صرف امتحان عربی‌کمیٹی کا ممبر بنایا گیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ میں دوسری زبانوں یعنی فارسی، اردو، اور سنسکرت، ہندی سے ناواقف ہوں۔ یہ امر موجب تحقیر ہے۔ میں سب زبانیں جانتا ہوں اور ان میں امتحان لے سکتا ہوں۔ اگر انجمن مجھ کو سب امتحانوں کا ممبر مقرر کرے تو مجھ کو منظور ہے''۔

اس کے جواب میں ارباب انجمن نے مصر صاحب کو لکھا کہ امتحان کمیٹوں کے سب ممبر دو دو تین تین زبانیں جانتے ہیں لیکن ان کو ہر کمیٹی میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا

کہ کام بہت زیادہ ہوگا۔ اگر ایک شخص کئی امتحان کمیٹیوں کا ممبر ہوگا تو اس کو محنت بہت پڑے گی پھر بھی اگر آپ کی مرضی ہو تو انجمن کو عذر نہیں۔

یہ معقول جواب سن کر مصر صاحب ٹھنڈے ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصر صاحب فارسی کے اچھے فاضل تھے۔ انجمن کے مشاعروں میں عموماً فارسی غزلیں کہہ کر لاتے تھے اور اچھے اچھے شعر نکالتے تھے۔

کاغذات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت عوام کی توجہ تحصیل علوم کی طرف بالکل نہ تھی۔ اس جمود کی حالت کو دیکھتے ہوئے (۲۹ - اگست کے جلسۂ خاص میں) ڈاکٹر لائیٹنر نے تجویز پیش کی کہ ''عوام میں مشرقی زبانوں کے امتحان دینے والوں کی ہمت بڑھانے کے واسطے امتحانات کے اشتہار کے ساتھ یہ اعلان بھی جاری کیا جائے کہ جو طالب علم منجملہ نمبر مقررہ کے نصف نمبروں سے کم حاصل نہ کرے گا، اس کو ایک اعزاز کی سند بھی عطا ہوگی اور جو طالب علم نمبر مقررہ کے تین چوتھائی نمبروں سے کم حاصل نہ کرے گا ، اس کو علاوہ سرٹیفیکٹ اعزاز کے کچھ روپیہ انعام ملے گا۔ اور سرٹیفیکٹ اور انعام ، دربار عام میں تقسیم ہو گا،،۔ اطلاع عام کے لئے یہ اشتہار کوہ‌نور میں چھاپا گیا اور ایک ہزار علیحدہ چھپوا کر مشتہر ہؤا۔ ان اشتہارات میں سے چار سو اشتہار ڈائرکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجے گئے کہ سرکاری اخبار کےساتھ مشتہر کردیے جائیں۔

ہندی کے اصول امتحان آپ نے سن لیے۔ اسی طرح عربی، فارسی اور سنسکرت کے قواعد بھی مرتب ہوئے۔ ہر امتحان کے متعلق

الگ الگ عرض کرنا باعث طوالت ہوگا ۔ اس لئے میں صرف امتحان عربی کے قواعد پر اکتفا کرتا ہوں ۔

عربی کمیٹی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر لائٹنر صاحب تھے اور فقیر شمس الدین مصر رام داس، مولوی علمدارحسین اور مولوی محمد حسین ممبران امتحان عربی کے تین درجے مقرر ہوئے ۔ اعلیٰ اور ادنیٰ ہر درجے میں چھ مراتب مقرر تھے -

(۱) صرف و نحو (۲) علم ادب (۳) انشاء (۴) املا (۵) خوشخطی (۶) تلفظ ۔

یہ امتحان سکشا سبھا کے مکان میں ہوا ۔ تین درجوں کے امتحان کے ایک سو پچاس روپے انعام مقرر تھا ۔ جو طلبا لاہور میں نہیں آسکتے تھے ان کا امتحان سوالات بھیج کر ضلع کے ڈپٹی کمشنروں کی معرفت لینا قرار پایا ۔ ان امتحانات میں عمر کا لحاظ نہیں رکھاگیا تھا ۔ ہر عمر کا آدمی امتحان میں شامل ہوسکتا تھا - ۱۸۶۶ء میں پانچ زبانوں کے امتحانات لئے گئے - ۱۰۹ امیدواروں نے درخواستیں بھیجیں - ۷۴ نے امتحان دیا - ۳۵ امیدوار غیر حاضر رہے - ۷۴ امتحان دینے والوں میں سے ۳۳ نے سند لیاقت حاصل کی ۔ درجہ اول میں آٹھ ، درجہ دوم میں ۱۷ اور درجہ سوم میں ۸ امیدوارکامیاب ہوئے ۔ ان سب کو ۶۷۶ روپےانعام دیا گیا ۔ عربی کے امتحان میں ۱۳ طلبہ شامل ہوئے ۔ ان میں سے ۸ درجہ دوئم میں پاس ہوئے اور ان کو ۱۸۰ روپے انعام ملا ۔ فارسی میں ۱۳ طلبہ شامل ہوئے ۔ ان میں سے ۳ درجہ اول ۲ درجہ دوئم میں کامیاب ہوئے اور ان کو ۱۲۵ روپے انعام ملا ۔

امتحان کے بعد طلباء کو ایک دعوت بھی دی گئی جس پر ۲۷ روپے صرف ہوئے۔

سنسکرت میں ۲۱ طلبہ شامل ہوئے۔ ۴ درجہ اول میں، دو درجہ دوم میں اور دو درجہ سوئم میں پاس ہوئے۔ ۱۷۰ روپیہ انعام ملا۔ ھندی میں ۱۳ طلبہ شریک ہوئے۔ ایک درجہ اول میں ایک درجہ دوم میں اور پانچ درجہ سوم میں پاس ہوئے۔ ۱۱۱ روپیہ انعام پایا۔

اردو میں ۱۴ طلبہ شریک ہوئے۔ ۴ درجہ دوم میں اور تین درجہ سوم میں پاس ہوئے۔ ۹۰ روپے انعام ملا۔

اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی علوم کا بازار کس قدر سرد پڑ گیا تھا۔ جب یہ معاملہ جلسۂ انجمن میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بہت سے لوگوں کو قواعد امتحانات کی واقفیت نہیں۔ بعض لوگ اسے اپنی سبکی خیال کرتے ہیں۔ اس امتحان میں صرف لاہور کے قرب و جوار کے لوگ شامل ہوئے ہیں۔ جب اس امتحان اور اس کے نتائج کی اطلاع دور دور پہنچے گی تو زیادہ تعداد میں لوگ شریک ہوں گے۔ ایک ممبر نے کہا، مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی ۱۸۵۴ء میں قائم ہوئی تھی اور ۱۸۵۷ء میں جبکہ احاطۂ بنگال اور ممالک مغربی کے تمام کالج اس کی مدد پر تھے اس کے امیدواروں کی تعداد صرف ۲۴۴ تھی جن میں سے صرف ۱۶۲ نے امتحان انٹرینس پاس کیا تھا۔

غرض انجمن کے سند یافتہ امیدواروں میں سے چھ نے تھوڑے ہی عرصے میں انجمن کے ممبروں کی سفارشوں سے معقول نوکریاں پالیں۔

اگرچہ یونیورسٹی ابھی قائم نہیں ہوئی تھی، تجویزیں اور جلسے ہی ہو رہے تھے لیکن اس تجویز اور انتظام امتحانات کی بدولت انجمن نے یونیورسٹی زبان ہائے دیسی کا خطاب حاصل کر لیا اور ہندوستان سے انگلستان تک تمام اخباروں میں اس دلچسپ خبر سے ایک غلغلہ پیدا ہو گیا۔

اس پہلے امتحان پر ۴۷۴/۱۲/۶ صرف آئے، جس میں ۳۲۵/۱۳/۱۱ بطریق چندہ وصول پائے اور باقی -/۱۴۸ روپے یونیورسٹی فنڈ سے لے کر صرف کئے گئے۔

مناسب ہوگا کہ میں ۱۸۶۶ء کے امتحان کا گوشوارۂ خرچ ہی پیش کردوں جس کو سن کر آپ از خود اندازہ کرلیں کہ یہ انجمن ان ابتدائی سالوں میں کس قدر مفید خدمات تعلیمی انجام دے رہی تھی۔

جمع

	پائی - آنے - روپے
بابت چندہ امتحان ابتدائے ۱۸۶۵ء سے آخر ۱۸۶۷ء تک	۳۲۵ - ۱۳ - ۱۱
یونیورسٹی فنڈ سے لے کر	۱۴۸ - ۱۴ - ۷
	۴۷۴ - ۱۲ - ۶

خرچ

	پائی - آنے - روپے
انعامات جو طلبہ زبانہائے مختلفہ کو ایک جلسہ منعقدہ مارچ ۶۶ء میں تقسیم ہوئے	۳۴۳ - ۰ - ۰

	روپے - آنے - پائی
مصارف متفرق ابتدائے ۶۵ء سے ۱۸۶۸ء تک	۶ - ۱۲ - ۴۳
چھپائی اشتہارات و سوالات امتحان و سندھائے امتحان وغیرہ	۰ - ۴ - ۵۱
صرف دعوت طلبہ	۰ - ۰ - ۱۷
قیمت ٹکٹ ڈاک برائے اجرائے اشتہارات و سوالات وغیرہ	۶ - ۳ - ۱۳
قیمت کاغذات وغیرہ	۰ - ۳ - ۵
قیمت پارچہ لٹھہ برائے بستنی ہائے مبالغ امتحان	۰ - ۶ - ۱
	۶ - ۱۲ - ۳۷۴

کتب خانہ انجمن:

انجمن پنجاب کے پہلے جلسے میں پنڈت من بھول صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا ''ایسی مجلس کو امداد کتب علمی بھی ضرور ہے - لہذا اس مکان سکشا سبھا میں ایک کتب خانہ بھی جمع کیا جائے جس میں سب زبانوں کی کتب علمی نیز اخبارات و کتب ماہواری چھاپہ موجود ہوں اور ان کو جس کا جی چاہے بے تامل سیر کرے - مگر چونکہ ابھی ایسے کتب خانے کے لئے روپیہ موجود نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ فی الحال ایسی کتب، صاحبان شوق سے صرف عاریتاً ہی لے کر رکھی جاویں اور آیندہ وقتاً فوقتاً اس کی رونق اور ترقی میں تائید کی جاوے،، -

اس تجویز کو سب حاضرین جلسہ نے پسند کیا اور ایسے جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا تھا کہ تاریخ میں اس کی

مثال نہیں مل سکتی۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ جادو کے زور سے، پلک جھپکتے میں ایک عظیم‌الشان کتب خانہ تیار ہوگیا۔ انجمن قائم ہونے کے پانچ مہینے بعد انجمن کے دفتر سے ایک گشتی مراسلہ، دوسری انجمنوں سے الحاق کے لئے جاری ہوا۔ اس مراسلے میں یہ فقرہ لکھا ہوا نظر آتا ہے: ''اور اس انجمن میں ایک کتب خانہ بھی قائم ہوا ہے جس میں قریب ڈیڑھ ہزار کے کتب علمی ہر زبان انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت بھاشا، اردو وغیرہ کی مرسلہ امراء و رؤساء صاحبان علم و ہنر و شائقان رفاہ و فلاح ہر خاص و عام، داخل ہوچکی ہیں جن میں سے کسی قدر صرف عاریت ہیں اور بہت سی بطور امداد ملک انجمن بلا قیمت عنایتی امراء و رؤساء ہیں۔ یہ امر دلیل کامل شوق و توجہ خاص صاحبان ممدوح متصور ہے۔ اس کتب خانے کی سیر بالکل بے تعرض ہو سکتی ہے۔ جس کا جی چاہے سیر کرے،،۔

اس زمانے میں یعنی آج سے قریباً ستر اسی سال پہلے علم کے شایقین اپنی کتابوں کی جان سے زیادہ حفاظت کرتے تھے کیونکہ آجکل کی طرح کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس انجمن کے بابرکت نام نے سب کے دلوں میں علم کا ایک شعلہ روشن کر دیا تھا۔ انجمن کے ممبروں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر دریا دلی سے کام لیا۔ اپنے علمی خزانے نکال نکال کر بے دریغ انجمن کے سپرد کر دیئے تاکہ خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں۔ شروع شروع میں کتابوں کی حفاظت کا کام سکشا سبھا کے محرر صاحب کے سپرد ہوا۔ انہوں نے اس فرض کو نہایت جانفشانی اور محنت سے ادا کیا۔ جب کتابیں کافی تعداد میں جمع ہو گئیں تو انجمن نے کتبخانے کے لئے کچھ قواعد مرتب کیے۔ میں ان

قواعد کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، صرف یہ دکھانے کے لئے کہ ہمارے کتب خانوں کے بنیادی قواعد کیا تھے جن سے ترقی کرتے کرتے آج ہم تنظیم و ترتیب کتب کی معراج پر پہنچ چکے ہیں۔

قاعدہ سیر کتب خانہ :

۱ - کتب خانہ ۶ بجے صبح سے ۷ بجے شام تک یعنی تمام دن کھلا رہے گا۔

۲ - جو صاحب سیر کتب کو آئیں، اپنا نام مع نام کتاب جس کی سیر کریں، ایک کتاب یادداشت میں لکھ دیں جو میز پر موجود رہے گی۔

۳ - ممبران انجمن جو فیس دینے والے ہیں ان کو ایک ہفتے تک اپنا پرچہ دستخطی دے کر کتاب اپنے گھر لے جا کر سیر کرنے کا اختیار ہو گا۔ اس سے زیادہ ناجائز ہے۔

۴ - اگر کتاب گم ہو جائے گی تو قیمت کتاب کی دینی ہو گی ۔ اور در صورت خراب کر دینے کتاب کے ہرجانہ حسب تشخیص کمیٹی کارکن دینا ہو گا۔

۵ - سیر کنندگان عام کو صرف کتب خانے میں بیٹھ کر ہر کتاب یا اخبار کے دیکھنے کا اختیار ہو گا۔ کتب خانے کے باہر لے جانے کا اختیار ہرگز نہ ہو گا۔

۶ - جو کتاب ایک شخص کی سیر میں ہو گی تا آنکہ وہ

حسب مرضی خود سیر نہ کر لے دوسرے کو اس پر
تفوق نہ ہو گا۔

۷ - احتیاط گم شدگی وغیرہ کتاب کا اندر کتب خانے کے
ذمہ‌دار محافظ کتب خانے کا ہو گا۔

جب کتابیں بہت زیادہ ہو گئیں اور ممبر چاروں طرف سے دریافت کرنے لگے کہ کتب خانے میں کون کون سی کتابیں موجود ہیں، تو تجویز ہوا کہ سال میں ایک مرتبہ کتب خانے کی فہرست شائع کی جائے اور وہ ہر ایک ممبر کے پاس رہے تاکہ ہر ممبر بغیر کسی تکلیف کے اپنے پسند کی کتابیں انتخاب کر سکے۔ اس مضمون کی اطلاع رسالہ انجمن سے شائع کی گئی۔

۱۴ - اپریل ۱۸۶۵ء کے جلسۂ عام میں پنڈت من پھول صاحب نے تجویز کیا تھا کہ ''انجمن کے کتب خانے کی ترقی کی صورت میری رائے میں یہ ہے کہ منتخب کتابوں کی فہرست تیار کی جائے اور پھر وہ کتابیں جہاں جہاں سے دستیاب ہوں منگا لی جائیں۔ اسی سلسلے میں پنڈت صاحب نے سولہ کتب ہندی و گورمکھی کے نام اور پتے بھی بتائے۔ اسی جلسے میں کتب خانے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پاس ہوئیں :

۱ - ایک ایک جلد میں جو کئی کتابیں بندھی ہوئی ہیں، اس سے قباحت یہ ہے کہ جب ایک کتاب ایک صاحب کی سیر میں ہوگی، تو باقی ماندہ کتب جو اس جلد میں ہوں گی، اس کے ساتھ خوامخواہ نہ دی جائیں گی۔ اس لئے ہر کتاب کی جلد ایک بندھوائی جائے۔

۲ - جن کتب کی جلدیں بوسیدہ ہوچکی ہیں ان کی جلد بندی کرائی جاوے -

۳ - جن کتابوں پر جلدیں نہیں ہیں ان کی بھی جلد بندی کرادی جاوے اور ان میں سے جو کتابیں عاریتاً ہیں ان کی جلد بندی کے دام مالک کتب سے وصول کئے جاویں -

اسی جلسے میں یہ بات بھی معرض بحث میں آئی کہ کتب خانے کی ترتیب بڑی محنت سے ہوئی ہے، ایک محافظ اور ایک محرر مقرر ہونا چاہئے - فیصلہ ہوا کہ فی‌الحال گنجائش نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس کام میں محنت کی ہے ان کو مناسب انعام دیا جائے اور آیندہ بھی یہی طریقہ رہے - جب گنجائش ہوگی معاملے پر غور کیا جائے گا۔ چنانچہ مکشا سبھا کے ملازمین کو جنہوں نے کتب خانے کی ترتیب اور حفاظت کا کام کیا تھا، بیس روپے انعام دیا گیا -

انجمن کی انتہائی کوشش تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں میں کتب بینی کا شوق پیدا ہو - چنانچہ ۲۷ - اپریل ۱۸۶۵ کے جلسۂ خاص میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی کہ کتب خانے کے اوقات اور قواعد کے متعلق اطلاع عام دی جا چکی ہے پھر بھی بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے - لہذا مولوی صاحبان اور ماسٹر صاحبان شہر لاہور کو جو مہتمم نج کے مکتبوں کے ہوں خاص طور پر اطلاع دی جائے -

معلوم ہوتا ہے انجمن کو بھی اپنے کتب خانہ پر بڑا فخر تھا - جو لوگ انجمن کے جلسوں میں شریک ہونے آتے تھے، انجمن

کا کتب خانہ انہیں بڑے اہتمام سے دکھایا جاتا تھا۔ اصل میں یہ کتب خانہ شمالی ہندوستان میں اپنی قسم کا پہلا کتب خانہ تھا جو بغیر سرکاری امداد کے جاری ہؤا تھا ۔ ۲۹ - اپریل کو جب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب جلسۂ انجمن میں شریک ہوئے تو انہوں نے بھی اس کتب خانے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس کی تعریف کی۔

جوڈیشل کمشنر صاحب بہادر نے بھی اس کتب خانے کو پسند کیا تھا اور محمد برکت علی خاں صاحب تحصیلدار لاہور کے ذریعے ۱۳ جلد کتب عنایت فرمائی تھیں ۔

۲ مئی ۰۶۵ کے جلسے کے فیصلے کے مطابق کتب خانے کی تیاری کا کام مولوی علمدار حسین اور مولوی محمد حسین کے سپرد کردیا گیا ۔ اور ان دونوں صاحبوں نے بڑی جانفشانی سے کتب خانے کی مکمل فہرست تیار کر دی جو بعد میں چھاپ کر تمام ممبروں کو بھیجی گئی ۔

۱۹ دسمبر ۰۶۵ کے جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ سرکاری ملازمین ہفتہ بھر میں صرف اتوار کے دن فارغ ہوتے ہیں ۔ دن بھر وہ گھر کے کام میں مصروف رہتے ہیں اس لئے انہیں کوئی موقعہ نہیں ملتا کہ کتب خانے کی سیر یا اخبارات کا مطالعہ کرسکیں ۔ اگر کتب خانہ رات کے دس بجے تک کھلا رہے تو وہ بھی مستفید ہوسکتے ہیں ۔ اس کام کے لئے لالہ ہردیال سنگھ محافظ کتب‌خانہ کی تنخواہ پندرہ روپیہ سے بیس روپے ماہوار کر دی جائے۔ سب نے اس تجویز پر صاد

کیا اور کتب خانے کا فیض صبح ٦ بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک جاری ہوگیا ۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتب خانہ کس قدر مقبول ہورہا تھا ۔

ایک مرتبہ سیکرٹری نے ایک جلسے میں شکایت کی کہ وہ صاحبان جنہوں نے کتابیں عاریتاً دے رکھی ہیں اپنی کتابیں واپس لئے جارہے ہیں، اس کی روک تھام ہونی چاہئے ۔ اس پر لائٹنرصاحب نے تمام ممبروں سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتابوں سے عوام کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیں اور کتابیں واپس نہ لیں ۔

آہستہ آہستہ انجمن کی اپنی زر خرید کتابیں بھی کافی ہوگئیں۔ قیاس کہتا ہے کہ آخرکار جب یونیورسٹی قائم ہوگئی اور انجمن پنجاب اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئی ہوگی تو یہ کتب خانہ یونیورسٹی کو جوں کا توں مل گیا ہوگا ۔

اس عظیم الشان کتب خانے کے محسنوں اور سرپرستوں کی فہرست بہت طویل ہے ۔ میں ان میں سے بعض چند افراد کے نام اور ان کے پیش کش آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔

۱ ۔ گورنمنٹ پنجاب نے -/۱۳۳ روپے کی کتب انگریزی و اردو اور دو سو روپے نقد برائے خرید کتب عنایت کئے ۔

۲ ۔ -/٦۳ روپے کی کتب انگریزی و فارسی ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے عنایت کیں اور -/۲۱۰ نقد دئے ۔

۳ ۔ -/۵٦۷ روپے کی کتب منشی ہرسکھ رائے مالک کوہنور اخبار نے عنایت فرمائیں اور وعدہ کیا کہ نو مطبوع کتب انجمن کو دیا کروں گا ۔

۴ - -/۹ روپے کی کتب مسٹر ایچیسن ڈپٹی کمشنر لاہور نے عنایت فرمائیں ۔

۵ - -/۵۰ روپے کی کتب منشی نولکشور نے عنایت کیں اور نومطبوع کتب دینے کا وعدہ کیا ۔

۶ - -/۴۷ روپے کی کتب لاہور کرانیکل نے پیش کیں ۔

۷ - -/۱۰۰ روپے کپتان فولر ڈائرکٹر پنجاب نے عنایت فرمائے ۔

کتب خانے کی فہرست مطبوعہ ۱۸۶۸ء دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، اس وقت کتب خانے میں حسب ذیل تعداد کتب کی موجود تھی ۔

کتب ملکیت انجمن :

فارسی	انگریزی	ہندی ناگری		
۱۱۵	۲۳۵	۶۵	میزان کل	۵۱۵

کتب عاریتی:

عربی فارسی	انگریزی	ہندی		
۴۳	۲۱۸	۵۹	میزان کل	۳۱۹

میزان کل ۸۳۴

یہاں ان لوگوں کا ذکر خیر نہ کرنا حد درجے کی نا انصافی

ہوگی جنہوں نے انجمن کو اپنی کتابیں مستعار دے رکھی تھیں یا بطور عطیہ پیش کی تھی۔

مستعار کتابیں دینے والے حضرات:

۱۔ فقیر سید شمس الدین خاں کتب فارسی و اردو و عربی — ۳۰ کتب

۲۔ پنڈت من پھول صاحب کتب فارسی و اردو پشتو — ۲۱ کتب

۳۔ پنڈت رادھا کشن صاحب — ۲ کتب

۴۔ پنڈت من پھول صاحب — کتب انگریزی ۲۰۱

۵۔ پنڈت رادھا کشن صاحب — کتب انگریزی ۱۵

۶۔ پنڈت رادھا کشن صاحب — کتب ہندی ۹۔

اخبارات و رسائل:

انجمن کے کتب خانے میں علاوہ کتابوں کے اخبارات بھی موجود رہتے تھے۔ بہت سے پرچے انجمن کے رسالے کے تبادلے میں موصول ہوتے تھے۔ انجمن کے جلسوں کی کارروائیاں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی رسالے یا اخبار کو چندہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ہاں انجمن کے ہر رسالے میں سیکرٹری کی طرف سے شکریے کے عنوان سے ایک نوٹ شائع ہوجاتا تھا۔ اس نوٹ کے تحت میں ان اخبارات اور رسائل کے نام اور ایڈیٹروں کے اسمائے گرامی درج کردیے جاتے تھے جو انجمن کو اپنا رسالہ یا اخبار ارسال فرماتے تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے اخباروں سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ بھی اپنا رسالہ یا اخبار انجمن کو بھیجیں۔

مئی ۱۸۶۵ء میں مندرجہ ذیل اخبارات انجمن کو موصول ہو کر کتب خانے کی زینت کا باعث ہوئے۔ یہ بتادینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اخبارات کی تعداد کے لحاظ سے اس وقت بھی لاہور سارے ہندوستان کے شہروں سے آگے تھا۔

۱ - کوہ نور اخبار لاہور — ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے

۲ - کرانیکل لاہور — ایڈیٹر گارڈن صاحب

۳ - سرکاری اخبار لاہور — ایڈیٹر بابو چندرناتھ کیوریٹر ڈائرکٹری

۴ - پنجابی اخبار لاہور — ایڈیٹر منشی محمد عظیم

۵ - مجمع البحرین لودھیانہ — ایڈیٹر محمد ناصر خان و سید محمد شاہ

۶ - نجم الاخبار میرٹھ — ایڈیٹر محمد امیر احمد صاحب

۷ - لارنس گزٹ میرٹھ - ایڈیٹر محمد اسماعیل صاحب

ستمبر ۱۸۶۵ء کے مہینے میں ان اخبارات کے علاوہ کچھ اور اخبارات انجمن کو موصول ہوئے۔ ان کے نام بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱ - اخبار عام، میرٹھ — ایڈیٹر محمد وجاہت علی خان

۲ - نورالابصار، آگرہ - ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال

۳ - نیر راجستان، جے پور — ایڈیٹر محمد سلیم اللہ

۴ - اردو دہلی گزٹ، آگرہ ایڈیٹر؟

۵ - کانپور گزٹ، آگرہ — ایڈیٹر منشی نولکشور

۶ - شمس الاخبار، مدراس — ایڈیٹر سید عبدالستار

۷ - رفاہ خلائق، شاھجہان پور — ایڈیٹر کنور بہادر

۸ - نارتھ انڈین ھیرلڈ — ایڈیٹر مسٹر کوپ

دسمبر ۶۸ء میں مندرجہ ذیل تین اخباروں کا اضافہ ھؤا :

۱ - خیر خواہ پنجاب، سیالکوٹ — ایڈیٹر حکیم دیوان چند

۲ - آب حیات ھند، آگرہ۔ ایڈیٹر پنڈت بنسی دھر

۳ - میرٹھ گزٹ، میرٹھ — محمد حمایت علی خان

جن اخبارات کے نام میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے ھیں ان میں سے اکثر اخبارات کے نام سے بھی آج کل کوئی شخص واقف نہیں بلکہ ھم لوگ تو یہ سمجھے بیٹھے ھیں کہ اخبار نویسی نے موجودہ دور میں فروغ پایا ھے۔ اس طویل فہرست سے یہ اندازہ ھوتا ھے کہ اخبار نویسی کی ابتدا ھوتے ھی ملک کے کونے کونے سے اخبارات اور رسائل حشرات الارض کی طرح نکل پڑے تھے۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں ۱۸۶۸ء کے ان اخبارات کے نام پیش کرنے کی جسارت کروں گا جو کتب خانہ انجمن کی دلکشی کا باعث بنے ھوئے تھے۔

پہلے ان اخبارات کا نام سن لیجئے جو لاھور سے شائع ھوتے تھے۔

۱ - انڈین پبلک اوپین بحروف انگریزی

۲ - پنجابی اخبار (اردو) منشی سید محمد عظیم صاحب، ایڈیٹر ۔

۳ - گیان پرداھنی پترکا (اردو ھندی بھاشا) پنڈت مکند رام ایڈیٹر ۔

۴ - کوہ نور (اردو) منشی ھر سکھ رائے، ایڈیٹر ۔

۵ - سرکاری اخبار (اردو) بابو چندر ناتھ کیوریٹر محکمہ ڈائرکٹری پنجاب ، ایڈیٹر ۔

۶ - انوارالشمس (اردو) دیوان بوٹا سنگھ، ایڈیٹر ۔

۷ - کلید امید (اردو) منشی محمد منیر، ایڈیٹر ۔

اب ھندوستان کے دوسرے اخبارات کے نام سنئے :

۱ - السٹریٹڈ لنڈن نیوز (لنڈن) بحروف انگریزی

۲ - پبلک او پنین (لنڈن) بحروف انگریزی

۳ - انڈین پبلک او پینین لاھور

یہ تینوں اخبار ڈاکٹر لائٹنر صاحب کتب خانے کو عنایت فرماتے تھے

۴ - سائنٹفک سوسائٹی - علی گڑھ (اردو انگریزی) ایڈیٹر حافظ محمد عبدالرزاق ۔

۵ - لارنس گزٹ میرٹھ (اردو) سید جمیل الدین صاحب، ھجر

۶ - میرٹھ گزٹ میرٹھ (اردو) ایڈیٹر محمد وجاھت علی خاں

۷ - اخبار عالم میرٹھ (اردو) ایدیٹر محمد وجاھت علی خاں

۸ - خیر خواہ پنجاب گوجرانوالہ (اردو) حکیم دیوان چند

۹ - رفاہ خلایق شاہجہانپور (اردو) کنور بہادر سنگھ

۱۰ - مجمع البحرین لدھیانہ (اردو) سید محمد ناصر خاں

۱۱ - آب حیات ہند آگرہ (اردو ہندی) پنڈت ہنسی دھر

۱۲ - تتابودھن پترکا بریلی (اردو ناگری) پنڈت گلاب شنکر

۱۳ - نجم الاخبار میرٹھ (اردو) محمد امیر احمد

۱۴ - نور الابصار الہ آباد (اردو) منشی سداسکھ لال

۱۵ - مفرح القلوب کراچی بندر (فارسی) میرزا محمد مخلص علی

۱۶ - نیر راجستان جے پور (اردو) محمد سلیم اللہ

۱۷ - ذخیرہ بالگوبند آگرہ (اردو) منشی بال گوبند

۱۸ - نیر اکبر بجنور (اردو) محمد ظہور الحسن

۱۹ - نوبہار ملتان (اردو) سید محمد حسین

۲۰ - رسالہ تہذیب لکھنؤ (اردو) منشی شیو نرائن سیکرٹری -

۲۱ - آئینہ عالم الہ آباد (اردو) منشی سدا سکھ لال

۲۲ - صادق الاخبار بہاولپور (اردو) پنڈت دوارکاناتھ

۲۳ - گوڑگانوہ اخبار گوڑگانوہ (اردو) منشی رام نرائن

۲۴ - رہنمائے پنجاب سیالکوٹ (اردو) منشی حسین بخش

۲۵ - جام جہان نما کلکتہ (فارسی)

۲۶ - رسالہ انجمن کانگڑہ (اردو) منشی ہولومل

۲۷ - رسالہ انجمن گوجرانوالہ (اردو) حکیم جے سنگھ

۲۸ - رسالہ انجمن دہلی (اردو) منشی پیارے لال

رسالہ انجمن

شروع ہی سے انجمن کے زیر اہتمام ایک رسالہ جاری کرنے کی بھی تجویز تھی - ۳۱ مارچ ۶۵ء کے جلسے میں منشی ہرسکھ رائے نے چیدہ چیدہ مضامین جو ارباب انجمن نے پسند کیے تھے اور انجمن کی کاروائی چھاپنے کا تکدمہ پیش کیا - صاحب صدر نے باتفاق آرا جملہ ممبران پیش کردہ نرخوں کو منظور فرمایا اور صرف زبان اردو میں چھاپنے کی اجازت دی - اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اس کی تقطیع مطبع کوہ نور کی جنتری کے برابر ہو - اسی جلسے میں یہ بھی قرار پایا کہ یہ رسالہ تمام ممبروں کو مفت دیا جائے اور غیر ممبروں سے تین روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک یا آٹھ آنے فی پرچہ وصول کیا جائے -

جس جس مطبع اور سوسائٹی سے انجمن کے دفتر میں اخبارات یا رسائل موصول ہوتے تھے، انجمن کا سکرٹری ان کو بلا قیمت رسالہ انجمن بھیجتا تھا - انجمن کے رسالوں کا فائل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اس کا کچھ حصہ انگریزی اور ہندی مضامین کے لئے بھی مخصوص تھا - انگریزوں کے افادے کے لیے خاص طور پر انجمن کے جلسوں کی کاروائی کا خلاصہ انگریزی میں ضرور درج ہوتا تھا -

ڈائرکٹر تعلیم ممالک پنجاب و اودھ از راہ عنایت و اعانت اپنے ماتحت اضلاع کے مدرسوں کے لئے انجمن کے رسائل خرید فرماتے تھے - اس کے علاوہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر قسمت ہائے پنجاب بھی بنظر فوائد انجمن کے رسالے کے خریدار تھے - ۶ ستمبر

۱۸۶۵ء کے جلسۂ خاص میں ڈائرکٹر مدارس پنجاب کی ایک چٹھی پڑھی گئی - اس میں دریافت کیا گیا تھا کہ ڈپٹی کمشنر لودھیانہ اپنے ضلع کے سکولوں کے لیے بہت سے رسالے خریدنا چاہتے ہیں - ان سے فی رسالہ کیا قیمت لی جائے گی - بعد گفتگو کے فیصلہ ہوا کہ یہ جلدیں مدرسوں میں تقسیم ہوں گی اس لیے ۸ آنے کے بجائے ۲ آنے فی پرچہ لئے جائیں -

رسالہ انجمن میں اُن پسندیدہ مضامین کے علاوہ جو انجمن کے جلسوں میں پڑھے جاتے تھے، وہ لیکچر بھی شائع ہوتے تھے جن کا انتظام انجمن پنجاب نے طلبا اور عوام کے لیے کر رکھا تھا - نیز وہ امور بھی جن کے متعلق حکومت رائے عامہ، جسے انجمن کی رائے کہنا چاہیے، دریافت کرنا چاہتی تھی، بالتفصیل چھپا کرتے تھے - جب انجمن نے مشاعرہ قائم کیا تو رسالے میں فارسی اردو کی طرحی غزلیں بھی شائع ہونے لگیں - اکثر رسالوں میں دوسرے رسالوں کے مضامین افادۂ عام کے لیے شائع ہوئے - انشاء و املا کی وہ عام غلطیاں اور ان کی تصحیح جو اکثر انشاء پردازوں سے سرزد ہوتی تھیں متعدد رسائل میں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں -

منتخب مضامین :

میں عرض کر چکا ہوں کہ انجمن کے جلسوں میں مفید علمی، ادبی، تاریخی، معاشی اور اصلاحی مضامین بھی پڑھے جاتے تھے - اس باب میں انجمن کا قاعدہ یہ تھا کہ مضمون نویس اپنا مضمون

یا اس کا خلاصہ انجمن کے سکرٹری کے پاس بھیج دیتا ۔ سکرٹری اس کو کارکن کمیٹی کے جلسۂ خاص میں جو جلسۂ عام سے چند دن پہلے منعقد ہوا کرتا، ارباب کارکن کمیٹی کے سامنے پیش کر دیتا ۔ اگر ارباب کارکن کمیٹی اس کو پسند کر لیتے تو مضمون جلسۂ عام میں پڑھنے کی اجازت مل جاتی اور اس کی اطلاع مؤلف کو بھیج دی جاتی ۔ جب یہ مضمون جلسۂ عام میں پڑھا جاتا تو ارباب انجمن جناب صدر کی اجازت سے بحث طلب امور پر ضروری بحث کرتے یا اگر کسی کو ضروری معلومات حاصل ہوتیں تو وہ اس کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ارباب انجمن کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے کا فخر حاصل کرتا ۔ جب مؤلف اور اس کا مضمون ان تمام مرحلوں سے گزر چکتا تو ارباب انجمن سے اس کے بارے میں رائے لی جاتی ۔ اگر یہ مضمون سب کو پسند ہوتا تو رفاہ عام کے لیے اسے انجمن کے رسالے میں شایع کر دیا جاتا ۔ میں نے ان مضامین کو جستہ جستہ پڑھا ہے ۔ بعض مضامین نہایت خوب اور پر از معلومات ہیں ۔ البتہ زبان گزشتہ صدی کی ہے ۔ یہ انجمن فروری ۱۸۶۵ء میں جاری ہوئی ۔ دسمبر ۱۸۶۸ء تک اس کے رسائل میں ایک سو بیالیس (۱۴۲) مضامین شایع ہوئے ۔ ان مضامین کی فہرست تاریخی حیثیت سے قابل قدر ضرور ہے ۔ لیکن وقت کی تنگی کو دیکھتے ہوئے میں اسے نظر انداز کرتا ہوں اور آپ کی خدمت میں ان چار سال کے مضامین کے متعلق کچھ منتشر خیالات کو یک جا کرنے کی کوشش کرتا ہوں ۔

اصل میں یہ مضامین انجمن اور ارباب انجمن اور اس دور کی

ضرورتوں کی دلچسپ اور قابل قدر تصاویر ہیں ۔ کوئی تاریخ کوئی کتاب یا کوئی رسالہ اس دور کی زندگی پر اتنی روشنی نہیں ڈال سکتا جس قدر یہ مضامین ۔ یہ مضامین صرف لاہور کے اہل قلم کے نہیں ہیں ۔ ان کے لکھنے والے پنجاب کے مختلف شہروں اور علاقوں کے رہنے والے ہیں ۔ اکثر و بیشتر لکھنے والے ایسے ہیں جن کے نام سوائے انجمن کے رسائل کے اور کسی کتاب میں نہیں دیکھے گئے ۔ ان میں جس شخص نے سب سے زیادہ مضامین لکھے وہ مولوی محمد حسین صاحب ہیں ۔ انہوں نے جس قدر مضامین انجمن کے جلسوں میں پڑھے وہ سب کے سب پسند عام کی سند کے ساتھ صفحۂ قرطاس کی زینت ہیں ۔

مولوی صاحب کے مضامین کی فہرست یہ ہے :

(۱) تحریص و تشویق تحصیل علم (۲) معافی محصول چونگی کتب تجارتی پر (۳) ترمیم رواج نیلام‌ہائے مروجہ (۴) روئداد مجلس اسلامی کلکتہ (۵) توسیع شہر لاہور (۵) فضیلت ارتباط و حفظ مراتب احتیاط ۔ (۷) اصلاح تعلیم مروجہ (۸) ابتدائے حال زبان عرب اور فرق زبان مروجہ (۹) تحصیل علم سے مطلب اصلی کیا ہے (۱۰) ہر کام کو سوچ سمجھ کر احتیاط سے کرنا چاہیے (۱۱) ترغیب تہذیب و اکتساب فنون (۱۲) تنزل خیالات اہل ہند اور تقریر ان کی ترقی ہمت کے لئے (۱۳) تکالیف و اصلاح ریلوے (۱۴) شکایت ترویج کتب مفیدہ کی (۱۵) ترجمہ کتب علمی و ریاضی (۱۶) اجتماع میلہ ہائے ہندوستان (۱۷) طرز انشاء فارسی و اردو مروجہ (۱۸) آج کل کے تحصیل و تعلیم میں کیا

ترمیم کرنی چاہیے (۱۹) تدبیر رفع افلاس اہل ہند (۲۰) اہل ہند کو اپنے سود و بہبود میں آپ کوشش کرنی چاہیے (۲۱) فوائد تجارت (۲۲) ترقی و تائید تجارت ۔

دوسرے لکھنے والے منشی محمد علی صاحب ملازم اخبار سرکاری ہیں ۔ وہ اس دور کے اچھے لکھنے والوں میں سے تھے انہوں نے مندرجہ ذیل مضامین پڑھے ۔

(۱) عہد قدیم اور زمانے حال کی تحصیل میں کیا فرق ہے ۔
(۲) کتب مروجہ حال و تحصیل طلبہ حال ۔
(۳) صرف وقت ۔
(۴) تربیت جسمانی ۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین بھی مصنفین نے نہایت محنت سے لکھے ہیں :

(۱) دروغ گوئی مصنفہ منشی گوپال داس ای ۔ اے ۔ سی ۔ گجرانوالہ ۔
(۲) احسن طریقہ تعلیم و مواقعات ترقی علوم مصنفہ منشی جمنا پرشاد لدھیانہ ۔
(۳) تدبیر احسن ترقی صحت نفسانی مصنفہ منشی ھر سکھ رائے ۔
(۴) موجبات دروغ گوئی مصنفہ لالہ رجو لعل ھیڈ ماسٹر بھوانی ۔
(۵) ترغیب علوحوصلگی مصنفہ فقیر سید جمال الدین ۔
(۶) فن طبابت مصنفہ ڈاکٹر ھادی حسین خاں ۔
(۷) نکاح بیوہ زناں و شادی دختران کمسن مصنفہ پنڈت بشمبر ناتھ دھلی ۔
(۸) تعلیم نسواں از پنڈت بشمبر ناتھ ۔

(۹) فضیلت راست بازی و حلم از لاله رجو لعل -

(۱۰) ترجمہ اصطلات علوم ریاضی وغیرہ از فقیر سید جمال الدین -

(۱۱) تربیت اطفال از منشی کرم الٰہی محاسب انجمن وغیرہ وغیرہ -

انجمن پنجاب کی تالیفات :

جس وقت انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی تھی اس وقت یہ بات ظاہر کری گئی تھی کہ انجمن ملک کے لیے مفید لٹریچر بھی تیار کرے گی - پہلے سال میں انجمن کے اراکین تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں دے سکے - اس کی وجہ یہ تھی کہ انجمن کے پاس کوئی مستقل سرمایہ نہ تھا - جب انجمن نے دوسرے سال میں قدم رکھا تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا - جو فہرست میں پہلے چار سال کے رسائل سے مرتب کر سکا ہوں وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں -

۱ - عربی کی گرامر انگریزی اور اردو میں مصنفہ ڈاکٹر لائٹنر صاحب -

۲ - الریالیہجی مصنفہ ڈاکٹر نیل صاحب -

۳ - امراض الصبیان مصنفہ ڈاکٹر رحیم خاں صاحب -

۴ - پنڈت دھرم نارائن نے ریاست راجپوتانہ اندور پر ایک کتاب لکھی -

۵ - تواریخ افغانستان مصنفہ ڈپٹی محمد حیات خاں -

۶ - نوبین چندک (ہندی) مصنفہ بابو نوبین چند رائے -

۷ - سنسکرت گرامر مصنفه بابو نوبین چندر رائے -
۸ - سنسکرت و امر کرن، مصنفه بابوبین چندر رائے -
۹ - جپ جی کا پرانا ارتھ مصنفه بابو نوبین چندر رائے -
۱۰ - بابا نانک کی نصیحتها - مصنفه بابو نوبین چند رائے -
۱۱ - پنجابی گرامر مصنفه لاله بهاری لعل -
۱۲ - ترجمه بید، در زبان گورمکهی مصنفه لاله بهاری لال -
۱۳ - گنت منجری علم حساب بزبان گورمکهی مصنفه لاله بهاری لعل -
۱۴ - گرامر هندی گورمکهی مصنفه لاله بهاری لال -
۱۵ - لغات سنسکرت و هندی مصنفه پنڈت رادها کشن -
۱۶ - دهابوبهات سنسکرت مصنفه پنڈت رادها کشن -
۱۷ - ادویات (هندی) مصنفه پنڈت رادها کشن -
۱۸ - مارل فلاسفی یعنی اخلاق مصنفه پنڈت بسنت رام -
۱۹ - دستور جدید هندی مصنفه پنڈت بسنت رام -
۲۰ - پنڈت بهان دت صاحب نے ۲۲ حصه اول کا هندی میں ترجمه کیا -
۲۱ - ترجمه برگ سنگره بزبان هندی مصنفه پنڈت بهان دت -
۲۲ - ترجمه بزبان هندی از بیدانت سار مصنفه پنڈت بهان دت -
۲۳ - ترجمه تیگاترگ سنگره بزبان هندی مصنفه پنڈت روپ چندر -
۲۴ - در علم طب بزبان هندی، مصنفه روپ چندر -
۲۵ - انتخاب پورانهای بزبان سنسکرت مصنفه پنڈت دیا رام -
۲۶ - بابو تاسه موندی بزبان هندی مصنفه پنڈت بهگوانداس

لیکچر :

انجمن پنجاب نے رفاہ عام اور طلبہ کے استفادے کے لیے کچھ لکچروں کا بھی انتظام کر رکھا تھا ۔ اس کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی کہ ڈاکٹر لائٹنر صاحب ۱۲ اگست ۱۸۶۵ء کو صاحب کمشنر بہادر لاہور سے ملے ۔ ان دنوں لاہور میں بلکہ پنجاب میں جہاں دو پڑھے لکھے آدمی آپس میں ملتے تھے ، انجمن پنجاب کا تذکرہ ضرور آ جاتا تھا ۔ کمشنر صاحب سے بھی انجمن کا ذکر آ گیا انھوں نے فرمایا : ''ابھی تک کوئی تجویز قابل پیشی سرکار کے آپ کی انجمن کی طرف سے نہیں ہوئی اور نہ کوئی اعتراض کسی سرکاری کام کے متعلق ہوا ہے اور کوئی پبلک لیکچر بھی نہیں ہوا'' ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو کا ذکر انجمن کے جلسے میں فرمایا اور تجویز کیا : ''بعضے اہم مراتب کے متعلق اگر لیکچر بھی ہوا کرے تو مفید ہے'' ۔ ارباب انجمن نے اس تجویز کو قبول کیا ۔ فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر لائٹنر صاحب پہلا لیکچر خود ۱۵ دسمبر کو دیں گے اور یہ لیکچر ''عادات باشندگان ترکستان'' کے بارے میں ہوگا ۔

لیکچروں کا یہ سلسلہ مدتوں تک جاری رہا ۔ مسٹر اسٹن نے اس سلسلے میں دس لیکچر دئیے ۔ پہلے چار لیکچر کرۂ زمین کے بارے میں تھے ۔ دوسرے چار لیکچروں میں آئرلینڈ، انگلینڈ، سکاٹ لینڈ اور ویلز کے جغرافیائی اور تاریخی حالات بتائے گئے ۔ نویں لیکچر میں ''احسن طریقہ تعلیم و ترقی علم'' پر خیالات کا اظہار کیا گیا ۔ اور دسویں لیکچر میں انھوں نے تمام دنیا کا مختصر حال بیان فرمایا ۔

۲۳ اگست ۱۸۶۵ کے جلسۂ خاص میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ لیکچر دینے کے لئے ہمیں ایک لائق شخص کو ملازم رکھنا لازم ہے ۔ ہماری رائے میں مولوی محمد حسین صاحب بہت لائق شخص ہیں اور وہ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔ چند صاحبان (انگریز) نے مل کر لیکچر فنڈ میں ۳۰ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا ہے ۔ اگر انجمن کی آمدنی میں سے ۵۰ روپے ماہوار خرچ کیے جائیں تو ۸۰ روپے مولوی صاحب کے لیے کافی ہوں گے ۔ سب ممبروں نے اس تجویز پر اتفاق کیا اور مولوی صاحب سے رضامندی لینے کا فیصلہ ہوا ۔ لیکن مولوی صاحب اس وقت کسی کام سے کلکتہ جا چکے تھے اس لئے معاملہ کھٹائی میں پڑگیا ۔ تجویز ہوا کہ دو مرتبہ ڈاکٹر رحیم خاں لیکچر دیں اور برانڈرتھ کمشنر صاحب راولپنڈی کو لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جائے ۔

مستقل لیکچرار رکھنے کے لئے ''کوہ نور،، میں اشتہار دیا گیا ۔ اس میں لیکچرار کی قابلیت اور فرائض کی حدود یہ مقرر کی گئی تھیں : ''مضمون علمی بعبارت دلچسپ اردو میں لکھے اور پڑھ کر انجمن میں سنایا کرے اور باشندگان لاہور کو ترغیب دیا کرے اور انگریزی زبان سے آگاہ ہو ۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ ہوگی اور آئندہ ۵۵ روپے تک ترقی ہوسکے گی ۔

۳ نومبر ۱۸۶۵ کی تعلیمی کمیٹی میں ڈاکٹر صاحب نے عہدۂ لیکچرری کے متعلق جس قدر کام ہونے چاہئیں ان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا :

۱ ۔ ''لکچرر کا فرض ہوگا کہ جو مضامین پسند اور منظور

ہو چکے ہوں ان کو عوام میں مشتہر کرے۔

۲ - ہفتہ بھر میں دو تین مرتبہ تقریر (لیکچر) حسب منشا کمیٹی پڑھا کرے۔

۳ - تحریری لیکچر بھی عبارت سلیس و دلچسپ اردو میں بنا کر پیش کیا کرے۔

۴ - رؤسا کے مکانوں پر حاضر ہوکر ادب کے ساتھ مضامین مذکورہ سنایا کرے اور ہر نوع کی ترغیب و تحریک کرے۔ (۱)

۵ - اس کے علاوہ رسالے کے چھپوانے اور ترتیب دینے اور مضامین کو درست کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔،،

لیکچرار کی اسامی کے لئے مرزا خاور، منشی جمنا پرشاد، منشی بدھ سنگھ، پنڈت بشمبر ناتھ اور غلام محی الدین کی درخواستیں آئیں۔ ان کو لکھا گیا کہ ایک ایک مضمون لکھ کر پیش کریں اور سارٹیفکیٹ بھی بھیجیں - اگر ان کو انتخاب کرلیا گیا تو کرایہ آمدو رفت بھی دیا جائے گا۔

بہرحال انجمن میں مدت تک کوئی باقاعدہ لکچرار نہیں رکھا گیا - مختلف ممبر لیکچرر کے فرائض انجام دیتے رہے مسٹر اسٹن کو دس روپے فی لیکچر کے حساب سے معاوضہ دیا گیا - مولوی محمدحسین صاحب جب کلکتہ سے واپس آئے تو انجمن نے بڑے جوش سے ان

۱ - رؤسا کے دیوان خانوں میں محفلیں لگتی تھیں - ان میں عالم اور ادیب جمع ہوتے تھے - شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے - ڈاکٹر لائٹنر ان محفلوں سے فائدہ اٹھا کر عوام و خواص کے دلوں میں تحصیل علم کا شوق پیدا کرنا چاہتے تھے -

کا استقبال کیا اور انہوں نے بڑی نہایت محبت بھرے الفاظ میں انجمن اور ارباب انجمن سے جدائی کی شکایت کی ۔ ایک جلسے میں انہوں نے مجلس اسلامی کلکتہ کے حالات سنائے اور اس سے ارتباط پیدا کرنے کی تجویز کی۔ اس کے بعد مولوی صاحب کو بطور لیکچرار انجمن نے ۵۰ روپے پر ملازم رکھ لیا اور جولائی ۱۸٦۷ء سے مولوی صاحب نے لیکچرار کے فرائض انجام دینے شروع کردئیے۔

مجھے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ لیکچر آخر تک کس عمارت میں ہوتے رہے ۔ اس سلسلے میں تحقیق کی آنکھ ۳ اکتوبر ٦۵ء کے جلسے کی روئداد پر پڑتی ہے ۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ ڈائرکٹر صاحب مدارس دریافت کرتے ہیں کون سا مکان لیکچر کے لئے درکار ہے ۔ حاضرین نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا عجائب خانے کا مکان اس کام کے لئے نہایت عمدہ رہے گا ۔ عجائب خانہ کہاں تھا ؟ انہی رسائل سے پتہ چلتا ہے کہ عجائب خانہ انارکلی کی کسی عمارت میں تھا ۔

مولوی محمد حسین صاحب نے ۱۰ جولائی ٦۵ء کے جلسۂ خاص میں تجویز پیش کی تھی کہ ”ہر ہفتے میں شنبہ کے دن شام کے وقت مکان سکشا سبھا میں شائقین کا ایک جلسہ ہوا کرے اور اس میں شعرائے سلف کا تذکرہ ہوا کرے۔ “

یہ تجویز اس وقت ارباب انجمن نے پسند کی تھی لیکن پتہ نہیں کن وجوہ سے اس پر عمل نہیں ہوسکا تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب کو اس موضوع سے شروع سے دلچسپی رہی ہے ۔ جب وہ انجمن کے لیکچرار مقرر ہوئے تو سب سے پہلے اپنی اس تجویز کو عمل میں لائے ۔ پہلے لیکچر میں انہوں نے زبان اردو کی تاریخ اور نشوو نما پر ایک سیر حاصل لیکچر دیا ۔ دوسرا لیکچر اصلیت

زبان اردو پر ہوا - تیسرا لیکچر نظم اور کلام موزوں کے باب میں تھا - چوتھا لیکچر شمس ولی اللہ، موجد شاعری اردو پر ہوا - اس کے بعد انھوں نے شاہ حاتم، شاہ ہدایت، ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق وغیرہ پر لیکچر دئے - ان لیکچروں کے سلسلے میں مولوی صاحب نے چھ لیکچر درہم، دینار، روپیہ، اشرفی اور دوسرے سکوں کے متعلق دیے - یہ سلسلہ ختم کرنے کے بعد ایک اور سلسلہ تقریروں کا شروع کیا - اس سلسلے کی پہلی تقریر یہ تھی کہ زبان سلف میں ہند و عرب و فارس میں اہل فضل نے علوم و فنون میں کس طرح ترقی کی - اس سلسے کا دوسرا لیکچر بھی اپنی نوعیت کا خاص لیکچر تھا - اس میں بتایا گیا تھا کہ مسائل فلسفہ تحقیقی و صحیح کیونکر حاصل ہوتے ہیں اور کیا سبب ہوا کہ کتب عربیہ اور فارسیہ کے مصنف اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے میں جا پڑے -

اپریل ۱۸۶۸ء میں مولوی صاحب نے طبعی مسائل پر لیکچر دینے شروع کیے - اس میں کچھ سائنس کے تجربات بھی دکھائے گئے تھے - ان لیکچروں کا موضوع تھا "تفصیل خواص ذاتیہ اجسام معہ بعض اقوال اختلافی فلاسفہ عرب و مسائل علمی طبعی" - دوسرے لیکچروں میں کشش ارضی و جذب مرکزی اور تفصیل و تمثیل اس امر کی کہ کوئی چیز اوپر سے نیچے کیوں گرتی ہے -

اس سلسلۂ تقاریر کی تکمیل پر مولوی صاحب عہدہ لیکچری سے سبکدوش ہوگئے - ان کے بعد منشی کرم الہیٰ محاسب انجمن نے لیکچر دینے کا کام اپنے ذمے لیا - پہلا لیکچر انھوں نے فضیلت علم پر دیا اس کے بعد پانچ لیکچروں میں اثبات واجب الوجود،

پیدائش حیوانات، نباتات اور معدنیات سے صفات خدائے تعالیٰ کو بدلائل عقلی ثابت کیا۔ اس سلسلے کے تیسرے پانچ لیکچر تربیت اطفال، ورزش بدنی، قبائح مسکرات، نتائج مسکرات اور فوائد علم التواریخ کے متعلق ارشاد فرمائے۔

انجمن کے رسائل سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی جلسوں میں حاضرین کی تعداد کم و بیش سو ہوا کرتی تھی۔ طلبہ اور عوام بڑے شوق سے ان لیکچروں کے سننے کے لئے آتے تھے۔ حاضرین جلسہ مین اکثر انگریز افسر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ جن لیکچروں میں عملی تجربات سائنس کے دکھائے جاتے تھے۔ حاضرین جلسہ انہیں بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔

ممبران انجن :

کسی انجمن کی اہمیت اور مقبولیت کا انرازہ اگر ممبروں کے ناموں سے ہوسکتا ہے تو مین کہوں گا یہ انجمن ہندوستان کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مقبول انجمن تھی۔ تمام پنجاب کے بڑے بڑے، عہدہ دار، کیا انگریز اور کیادیسی، سب اس کے ممبر تھے۔ ریاستوں کے راجہ اور مہراجہ نواب اور رئیس نیز علم و فن سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات اس انجمن میں شامل تھے۔

۱۸۶۸ء کی رپورٹ میں انجمن کے ممبروں اور عہدیداران کے نام شائع ہوئے۔ ان کو دیکھ کر آپ خود ھی اندازہ لگا لیں گے کہ یہ انجمن کس قد اہمیت اور مقبولیت کی مالک تھی۔

جناب ڈونلڈ میکلوڈ صاحب بہادر ۔ سی بی ۔ لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب ۔ پیٹرن

جناب ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو ۔ لائٹنر صاحب بہادر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور ۔ پریسیڈنٹ

جناب ہیڈن پول صاحب بہادر جج عدالت خفیفہ لاہور ۔ وائس پریسیڈنٹ

فقیر سید جلال الدین صاحب ۔ بابو نوبین چندر رائے صاحب ۔ آنریری سکرٹری

مولوی محمد حسین صاحب بھی ابتدائے اپریل ۶۷ء سے جون ۱۸۶۸ء تک بعہدۂ سکرٹری بمشاہرہ ستر (۷۰) روپے ماہوار ملازم رہے ۔

شیخ نظام الدین صاحب منشی ۔

شیخ کرم الہی ۔ نیٹو اکونٹنٹ ولائبریرین ۔

لالہ گوبند رام خزانچی تحصیل لاہور ۔ تحویلدار خزانہ ۔

۱۸۶۸ء میں ۲۸ انگریز افسر اور ۱۱ راجہ اور نواب اس میں شامل تھے ۔ لاہور کے ممبروں کی تعداد ۹۶ تک پہنچی تھی ۔ ۱۲۳ ممبر بیرونجات کے تھے ۔ اس کے علاوہ ۱۰ طالبعلموں کے نام بھی ممبروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں ۔ یہ طلبہ گورنمنٹ سکول اور گورنمنٹ کالج میں تعلیم پا رہے تھے ۔ مجموعی طور پر اس انجمن کے ۲۶۸ ممبر تھے ۔

اگر کوئی ممبر فوت ہوجاتا تھا تو انجمن کی طرف سے اظہار تعزیت کیا جاتا ۔ متوفی کے وابستگان سے مرحوم ممبر کے حالات ابتدائے پیدائش سے معلوم کیے جاتے اور تمام سوانح عمری مع ان کوششوں

کے جو انجمن کے لئے اس کے دم قدم سے ظہور میں آئیں۔ مفصل بیان ہوتیں اور رسالے میں اندراج پاتیں ۔

مختلف کمیٹیاں :

انجمن کا کام روز اول ہی سے دن بدن بڑھتا چلا جاتا تھا ۔ کثرت کار کی وجہ سے بہت سے امور ہر بر وقت عملدرآمد نہیں ہو سکتا تھا ۔ کام کی رفتار کو تیز اور بر وقت لانے کے لئے ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے تجویز کیا کہ ہر کام کے لئے ہمیں سیلکٹ کمیٹیاں بنا دینی چاہئیں ۔ ان کمیٹیوں میں اگر دو دو چار چار ممبر مل کر کام کریں گے تو ہمیں بہت سی سہولتیں ہو جائیں گی ۔ سب ممبروں نے س تجویز کو پسند کیا ۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۵ء کے جلسۂ عام میں مندرجۂ ذیل کمیٹیاں بنائی گئیں :

۱ ۔ کمیٹی حفظ صحت
۲ ۔ کمیٹی تنقیح مراتب ترقی سررشتۂ تعلیم ۔
۳ ۔ فنانشل کمیٹی ۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف کمیٹیاں حسب ضرورت بنتی رہیں ۔ جب امتحان لینے کے مواقع پیدا ہوئے تو حسب ذیل کمیٹیاں منتخب ہوئیں :

۱ ۔ اردو کمیٹی ۲ ۔ فارسی کمیٹی ۳ ۔ عربی کمیٹی ۴ ۔ سنسکرت کمیٹی ۵ ۔ ہندی کمیٹی ۶ ۔ گورمکھی کمیٹی اس کے بعد ایک قانونی کمیٹی بھی بنائی گئی جس کے ذریعے بل حقیت مزارعانہ میں چند نہایت اہم تبدیلیاں کرائی گئیں ۔

پنجاب یونیورسٹی :

پنجاب یونیورسٹی کیونکر قائم ہوئی ؟ کون کون حضرات تھے جنھوں نے پنجاب میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کوشش کی ؟ سب سے پہلے یہ نیک خیال کس کے دل میں آیا ؟ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یونیورسٹی کو دریا دلی سے چندے دیے؟ عوام نے تعمیر یونیورسٹی میں کیا کیا حصہ لیا ؟ اس قسم کے سینکڑوں خیالات یونیورسٹی کا نام سن کر دل میں آتے ہیں لیکن اس وقت کہیں سے کوئی شافی جواب نہیں ملتا ۔ انجمن پنجاب کے رسائل یونیورسٹی کے ابتدائی حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں ۔ ان کی مدد سے اگر ہم چاہیں تو یونیورسٹی اور اس کی تدریجی ترقیوں پر ایک مستقل کتاب لکھ سکتے ہیں ۔ اس باب میں بھی میں بہت زیادہ اختصار سے کام لوں گا۔ تفصیلات میں جانے کی بجائے میں صرف ان بڑے بڑے مراحل کا ذکر کروں گا جو انجمن پنجاب کو یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے سے پیشتر طے کرنے پڑے ۔

۱۸۶۵ء میں پنجاب گورنمنٹ کے سکرٹری نے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کو ایک چٹھی لکھی ۔ اس میں انھوں نے سید احمد خاں کی ''مجلس علمی ممالک مغربی و شمالی'' کو سراہتے ہوئے نواب لفٹنٹ گورنر کی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ تعلیمی معاملات میں عوام کی کوششوں کے باوجود گورنمنٹ کی منشا ہے کہ اس بارے میں ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ رہنمائی کی جائے ۔ اس سلسلے میں عوام کی رائے معلوم کر کے گورنمنٹ سے سفارش کی جائے کہ کس قدر روپیہ تعلیم کے لیے درکار ہے ۔ ہر چند گورنمنٹ کے پاس روپیہ تھوڑا ہے لیکن جس قدر رقم کی آپ

سفارش کریں گے اس کو منظور کر کے نواب ممدوح حد درج مسرور ہوں گے،، ۔

ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اس چٹھی کو بطور سرکار تمام تعلیمی اداروں کو رائے عامہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا ۔ یہ سرکار دفتر انجمن میں بھی موصول ہوا ۲۲ اگست ۱۸۶۵ء کے جلسۂ خاص میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر نے تجویز کیا : ''اس سرکار کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے ۔ جس میں رؤسا کی امداد سے سب طرح کے فنون اور علوم مشرق و مغربی طلبہ کو سکھائے جائیں ۔ پنجاب کے رئیسوں اور راجوں مہاراجوں سے چندہ لیا جائے ۔ ،، ارباب انجمن نے بخوشنودئی تمام اس تجویز کی داد دیتے ہوئے خیر مقدم کیا ۔ قرار پایا کہ ایک جلسہ خاص رئیسان لاہور کا طلب کیا جائے ۔ انجمن کی طرف سے ہر دو سکرٹری، بابو شاما چرن اور محمد برکت علی علی خاں تحصیلدار لاہور اس میں شامل ہوں ۔ اس کے بعد جنرل سکرٹری کی منظوری سے اس سرکار کا جواب گورنمنٹ کو لکھا جائے ۔

اس جلسے کے بعد ہر محفل میں یونیورسٹی کے چرچے ہونے لگے ۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے ، چٹھیاں لکھی گئیں، اخبارات میں مقالات شایع ہوئے ۔ ہوتے ہوتے انگلستان تک قیام یونیورسٹی کی خبریں پہنچ گئیں ۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۶۵ء کے جلسے میں ڈاکٹر صاحب نے مسٹر ٹربر کی چٹھی پڑھ کر سنائی ۔ یہ چٹھی ولایت سے آئی تھی ۔ مسٹر ٹربر انگلستان کے نامی گرامی رئیس اور ایک پریس کے مالک تھے ۔ مسٹر ٹربر نے لکھا تھا : ''لاہور میں یونیورسٹی کے قائم

ہونے کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی - یہ بہت عمدہ اور اعلیٰ تجویز ہے - مجھے اس کی مفصل کیفیت لکھئے - میں ولایت میں بھی اس کی ترقی اور امداد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کروں گا،، -

جب ارباب انجمن نے سنا کہ ولایت تک ان کے بلند ارادوں کی خبریں پہنچ رہی ہیں اور انگریز ہماری مدد پر آمادہ ہیں تو سب کے دل بڑھ گئے اور حاضرین جلسہ میں ایک خوشی اور جوش کی لہر دوڑ گئی - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا : ''مجھے امید ہے کہ اس کار نیک سے انجمن اور ارباب انجمن کی توقیر بڑھے گی اور شہرت ہوگی،، - سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ یہ فخر انجمن کو آپ ہی کی بدولت حاصل ہوا ہے - آپ انجمن کے مفصل حالات لکھ کر بھیجیں اور آئندہ بھی انجمن کی کیفیت صاحب موصوف کو لکھتے رہیں -

اسی طرح ۲۱ دسمبر کے جلسۂ خاص میں ڈاکٹر صاحب نے گریسن دی تاسی (Gracin de Tasi) پروفیسر فرانس یونیورسٹی کی چٹھی پڑھ کر سنائی - ۲۶ دسمبر کے جلسے میں ڈاکٹر صاحب نے اعلان کیا کہ ولایت کے ایک نامی گرامی اخبار نے انجمن پنجاب اور یونیورسٹی کے متعلق ایک نہایت حوصلہ افزا مقالہ سپرد قلم کیا ہے -

غرض یونیورسٹی بنانے کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی جس کے سکرٹری لائٹنر صاحب منتخب ہوئے - یونیورسٹی کے اخراجات کے لئے اہل پنجاب سے چندے لئے گئے - راجوں مہاراجوں اور نوابوں کی خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجے گئے - ماہ جنوری ۱۸۶۶ء میں وائسرائے ہند یعنی سرجان لارنس نے مبلغ دو ہزار روپیہ سال

بسال یونیورسٹی کے مصارف کے لیے دینا منظور فرمایا ۔ گورنر پنجاب سر ڈی میکلوڈ بھی ایک ہزار روپیہ سالانہ مرحمت فرماتے رہے ۔ ان کے علاوہ مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ کپورتھلہ، مہاراجہ نابھہ، نواب مالیر کوٹلہ، راجہ فرید کوٹ وغیرہ نے دل کھول کر یونیورسٹی کے خزانے کو بھرا ۔ ڈپٹی محمد حیات خان صاحب نے لاہور کے زمینداروں کو جمع کر کے فوائد یونیورسٹی اور ترقیٔ علوم قدیم پر آکسایا ۔ ڈپٹی صاحب کی پر اثر تقریر سے زمیندار بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے بخوشی جمع دیہات پر ۸ آنے سینکڑہ چندہ دینا قبول کیا ۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ سارے پنجاب میں پھیل گئی ۔ ہر ضلع کے زمینداروں نے اس مفید تحریک کے لیے کھلے دل سے چندے دئیے ۔ ۱۸۶۸ء تک، یونیورسٹی فنڈ میں ایک لاکھ اور کئی ہزار سے زیادہ چندہ جمع ہو چکا تھا ۔

ماہ مئی ۱۸۶۶ء میں تین ماہ کے لیے ایک یونیورسٹی کالج اور مدرسہ کھولا گیا ۔ عربی فارسی اردو سنسکرت اور ہندی پڑھانے کے لیے معلم رکھے گئے ۔ عربی کے معلم کو ۶۰ روپے دیے گئے ۔ اور اردو فارسی کے معلموں کو تیس تیس ۔

۱۸ مئی ۱۸۶۷ء کو گورنر پنجاب جلسۂ یونیورسٹی کمیٹی میں تشریف لائے ۔ پہلے انھوں نے کتب خانے کی سیر فرمائی ۔ پھر کالج و مدرسہ کا معائنہ فرمایا ۔ اس وقت عربی فارسی کی جماعتوں میں ۱۲۷، سنسکرت اور ہندی میں ۶۳ اور گورمکھی میں ۳۶ طلبہ حاضر تھے ۔ اس کے بعد گورنر صاحب جلسۂ انجمن میں شریک ہوئے ۔ مولوی محمد حسین صاحب نے ''حال زبان عربی کا اور اس کے تغیرات آج تک'' پڑھ کر سنایا ۔ اس مضمون کو سن کر نواب لفٹنٹ گورنر محظوظ ہوئے اور تحسین فرمائی ۔

۱۲ جولائی ۱۸۶۸ء کو بنظر انتظام اور سفارش یورپین کمیٹی کالج اور مدرسہ بند کر دیا گیا ۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب کی سفارش سے وہ مولوی اور پنڈت جو کالج اور مدرسہ میں کام کر رہے تھے، گورنمنٹ سکول میں منتقل کر دیے گئے ۔ بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ جس قدر چندہ رئیسان لاہور دیں گے اتنا ہی سرکار سے ملے گا اور پھر وہ گورنمنٹ کالج لاہور پر صرف ہوگا ۔

اس نئے انتظام سے چندہ دینے والوں کے دل سرد ہوگئے ۔ جگہ جگہ سے رپوٹیں آئیں کہ جب سے امتحان کا طریقہ منسوخ ہوا ہے، عوام چندہ دینے میں پیشقدمی نہیں کرتے۔ پھر بھی جس قدر چندہ جمع ہوا کرتا تھا اس کے پرامیسری نوٹ خرید لیے جاتے تھے ۔

۱۲ ماہ مارچ ۱۸۶۷ء کو پھر لارنس ہال میں جلسہ ہوا ۔ اس میں نواب لفٹننٹ گورنر بھی شامل تھے ۔ ضروری گفتگو کے بعد اس جسلے میں مندرجہ ذیل مراتب طے ہوئے :

۱ ۔ جہاں تک ہو تعلیم کو بذریعہ زبانہاے دیسی ترویج دیا جائے ۔

۲ ۔ اعلیٰ درجہ تربیت کے لیے انگریزی تعلیم کی ترغیب دی جاۓ گی ۔ لیکن جو لوگ انگریزی زبان سے ناواقفیت کے باوجود فضلیت اور علمیت کے حامل ہیں، یونیورسٹی ان کی بھی توقیر کرے گی ۔

۳ ۔ زمرۂ منتظمان میں کسی قدر وہ اشخاص بھی ہوں گے جو کہ منجملہ تعلیم یافتگان ملک ہذا سے ہیں ۔

آخرکار یونیورسٹی بنانے کی درخواست گورنر جنرل ان کونسل کی خدمت میں بھیجی گئی - گورنر پنجاب اور اپنی کونسل کے ممبروں سے آزادانہ گفتگو کرنے کے بعد جناب محتشم الیہ نے فیصلہ کیا کہ فی الفور یونیورسٹی بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی - ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہی ڈگریاں جو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیاں دیتی ہیں - اگر پنجاب میں تھوڑی لیاقت والوں کو دی گئیں تو دوسری یونیورسٹیوں کی حیثیت اور قدر کم ہوجائے گی - اس لیے پنجاب کی یہ مجلس ابھی یونیورسٹی کی مکمل صورت اختیار نہ کرے - ڈگریوں کے بجائے صرف سرٹیفیکیٹ دیا کرے - جب پنجاب میں کثرت تعلیم اور حسن تعلیم پیدا ہو جائے تو یونیورسٹی بنا دی جائے گی - فی الحال اگر مناسب خیال کیا جائے تو سینٹ بنا دی جائے اور اس کے زیر نگرانی کالج کو یونیورسٹی لاہور کا نام دیا جائے - اس طریق کار سے یہ امر ظاہر رہے گا کہ یہ انتظام سرسری ہے اور آئندہ زمانے میں یونیورسٹی کا تقرر متصور ہے لیکن یہ کالج بدستور کلکتہ یونیورسٹی سے متعلق رہے گا - ارباب انجمن کہتے تھے یہ صورت نہایت تکلیف دہ ہے - ہمارے طلباء اتنی دور امتحان دینے کے لیے نہیں جا سکتے - کلکتہ کالج صرف انگریزی علوم کو ترقی دیتا ہے اور ہم دیسی زبانوں کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے ہیں -

اس سلسلے میں مدتوں گورنمنٹ سے گفت و شنید ہوتی رہی - ان دنوں لیپل گریفن صاحب انجمن پنجاب کے صدر اور یونیورسٹی کمیٹی کے سکرٹری تھے کیونکہ ڈاکٹر لائٹنر انگلستان گیے ہو۔ تھے - انہوں نے ان اعتراضات کے جوابات گورنر پنجاب کو لکھے - وہاں سے جواب آیا کہ وائسرائے ہند نے جو فیصلہ دیا ہے اس

پر نکتہ چینی کرنا سوء ادب ہے اور یہ فیصلہ بہت غور و خوض کے بعد کیا گیا ہے ۔ اس چٹھی کی دفعہ ۱۱ مشرقی علوم کی ترقی اور انجمن کے اصلی مقاصد سے خاص تعلق رکھتی ہے ۔ میں اسے بجنسہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں :

''اعتراض کمی حیثیت ڈگری کی جو کہ دفعتاً تقرری یونیورسٹی کی نسبت ہوئی ہے وہ صرف ان ڈگریوں کی نسبت ہو سکتی ہے جو کہ ڈگری یونیورسٹی کلکتہ کے مطابق ہیں ۔ لیکن یہ ہماری تجویز مجوزہ کا ایک آدھا حصہ ہے اور وہ آدھا حصہ بھی کچھ بہت مقدم نہیں ۔ اگر یونیورسٹی پنجاب محکمہ تعلیم میں شامل ہو جائے جو کہ ہمارے پسند طبع ہے تو کلکتہ کی یونیورسٹی کی ڈگری مثل بی ۔ اے ۔، ایم ۔ اے ۔ وغیرہ کی ضرورت ہوگی تاہم یہ ڈگری تعلیم عام میں ایسی مقدم نہیں جیسے کہ وہ خطاب اور اعزاز جو کہ قابلیت زبانہائے مشرق اور دیسی کے لیے مثلاً پنڈت بیدیا وہیس، کنک، سلبی، مولوی، ممتاز مہندس وغیرہ کے بخشے جانے کی تجویز ہے اور اگر یہی مناسب سمجھا جائے کہ ڈگری مثل یونیورسٹی کلکتہ کی بخشش کے اختیارات دینے کا ابھی وقت نہیں ہے تو ہم اس بات کے آرزومند ہیں کہ اختیارات بخشش خطاب و اعزاز دیسی کے ہم کو مل جائیں،،۔

اس چٹھی کا جواب ارباب انجمن کی آرزو کے مطابق موصول ہوا اور تعلیم بذریعہ زبان انگریزی کی شرط بھی ہٹا دی گئی ۔ آخرکار شکریے کے ساتھ انجمن نے ان تمام مراتب کو منظور کر لیا جو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر باقاعدہ یونیورسٹی بننے سے پہلے امتحاناً طے کرانا چاہتے تھے ۔

اس تمام بحث و تمحیص اور گفت و شنید سے ظاہر ہے کہ ارباب انجمن پنجاب درحقیقت پنجاب میں دیسی زبانوں کی یونیورسٹی قائم کرنے کے آرزو مند تھے لیکن حکومت چاہتی تھی کہ مغربی تعلیم کی یونیورسٹی جاری کی جائے ۔ اس کشمکش میں آخرکار حکومت ہی کی فتح ہوئی ۔ ارباب انجمن کے خواب شیریں کی تعبیر الٹی نکلی اور ان تمام کوششوں پر پانی پھر گیا جس کے لئے ۶۵ء سے ہاتھ پاؤں مارے جارہے تھے ۔ ۱۸۶۹ء میں انجمن کو یونیورسٹی کالج کھولنے کی اجازت دی گئی لیکن صرف مغربی سائنس کی اشاعت کے لیے، وہ بھی جہاں تک ہو سکے صوبائی زبانوں کے ذریعے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اشک شوئی کے لیے ملکی لٹریچر کی اشاعت اور ترقی کے لیے تھوڑا سا راستہ دے دیا گیا ۔ ظاہر ہے اروپائی علوم و فنون کی نقد قیمت کے مقابلے میں دیسی اور قدیم مشرقی علوم کا بازار سرد پڑتا چلا گیا ۔ آج پنجاب یونیورسٹی کی جو کچھ حالت ہے اسے آپ بچشم خود ملاحظہ فرما رہے ہیں ۔ مجھے اس کے متعلق کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن یہ یونیورسٹی اس یونیورسٹی سے بالکل مختلف ہے جس کا خیال ہمارے بزرگوں کے دلوں میں آیا تھا ۔ اگر آج ان میں سے کوئی بزرگ اس دنیا میں آ کر پنجاب یونیورسٹی کو دیکھیں تو حیران ہی رہ جائیں ۔ ان کے اندازے تو صرف اس قدر تھے کہ ایک عالیشان مکان بنایا جائے جس کا نام یونیورسٹی ہو ۔ اس میں ایک کتب خانہ اور ایک بڑا مکان جلسے کے واسطے ہو ۔ دفاتر کے لیے جدا جدا مکان ہوں ۔ ایک دوسرا مکان کالج کے واسطے بنے جس میں ہر ایک زبان کا درس جدا جدا ہو اور ایک کمرۂ کلاں اجلاس ممبران کے لئے ہو اور کئی کمرے جدا جدا پروفیسروں

کی نشست کے لئے ہوں۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس تمام عمارت پر قریباً پچاس ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ کالج یونیورسٹی لاہور اور امرتسر کے نام سے مشہور ہوگا۔ پنجاب میں جہاں جہاں اور کالج کھولے جائیں گے ، وہاں کے باشندے چندہ جمع کرکے خود مکانات کالج تعمیر کریں گے۔

ڈاکٹر لائٹنر صاحب:

روز افتتاح سے انجمن کے صدر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر صاحب منتخب ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی زبانوں میں ماہر تھے۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامی کالجوں سے انہوں نے منصب اعلیٰ فضیلت و حکمت، ماسٹر آف آرٹس اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ وہ انگلستان سے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوکر آئے تھے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے تعلیمی اور معاشرتی معاملات سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ماننا پڑے گا کہ پنڈت من پھول صاحب نے انجمن پنجاب کی صدارت کے لئے نہایت ہی قابل اور صحیح ہستی تلاش کی تھی۔ پنڈت صاحب نے جب ان کا نام نامی صدارت کے لئے انتخاب کیا تو یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے: ”ڈاکٹر صاحب نے اپنے کمال شوق اور توجہ دلی سے ہماری اس درخواست کو منظور کیا ہے اور سر پرست اور حامی اس مجلس مفید کے ہوئے ہیں اس بات کو ہم اگر اس مجلس اور اس شہر بلکہ تمام ملک کی خوشنودی سمجھیں تو بجا ہے“۔

انجمن پنجاب کے ذریعے سے ڈاکٹر صاحب نے جو فائدے ملک کو پہنچائے، اس کی فہرست نہایت طویل مگر دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی انجمن پنجاب تھا اور

حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی اسی انجمن کی وجہ سے خاص و عام میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

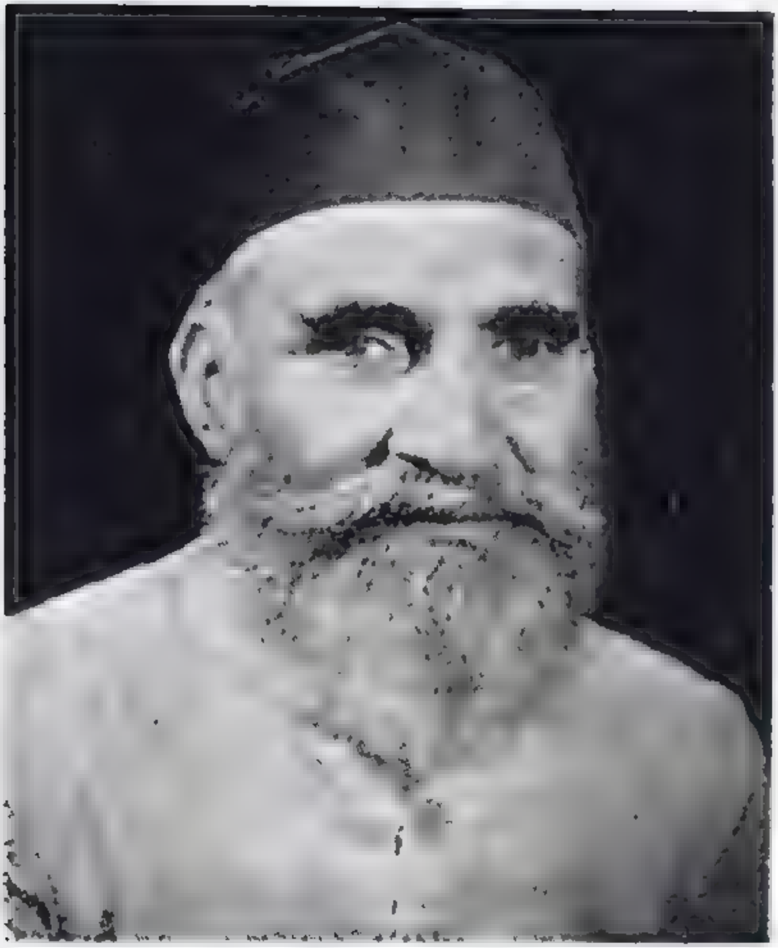
ڈاکٹر صاحب نے پانچ سال مسلسل گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی اور انجمن کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس قلیل مدت میں وہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اس قدر مقبول ہوچکے تھے کہ ان کے انگلستان واپس جانے کے وقت جو رخصتی جلسہ ہوا اس میں طالب علم، انجمن کے اراکین، لاہور کے انگریز اور دیسی افسر غرض سب کے سب بے اختیار ہو کر رونے لگے تھے۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں متعدد ایڈریس اور سپاسنامے پیش کئے گئے۔ ان میں سے اکثر ایڈریس انجمن کے رسالے میں شائع ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ دردناک اور پرجوش سپاسنامہ مولوی محمد حسین صاحب کا ہے جو انھوں نے انجمن کی طرف سے پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے بامروت اور علم دوست بزرگ تھے۔ اپنے فرائض کو بڑی جانفشانی سے ادا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت نے علم دوست طبقے میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ ان کی بدولت انجمن پنجاب چندروز میں صدر انجمن بن گئی۔ پنجاب کے ضلع ضلع بلکہ تحصیلوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں۔ اس کے ذریعے حاکم و محکوم میں خوشگوار تعلقات قائم ہوئے۔ علوم قدیم کیا عربی اور کیا سنسکرت، چراغ سحری ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان بجھے ہوئے چراغوں کو اس طرح روشن کیا کہ چند سالوں میں ان کی روشنی تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں ہی سے لاہور میں یونیورسٹی قائم ہوئی اور ایک رقم کثیر اس کے لئے جمع ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک عالیشان کتب خانہ قائم ہونا

اور ہر ہفتے بیسیوں اخباروں کا آنا پنجاب میں کتب بینی کے شوق کا باعث ہوا ۔ انہوں نے لاہور میں ینگ پنجاب ایسوسی ایشن جاری کر کے نوجوانوں کو علم مجلسی کی صحیح تعلیم دی ۔ ڈاکٹر صاحب کے ایماء سے عالمانہ لیکچروں کا انتظام ہوا ۔ ڈیبیٹنگ کلب اور مشاعرہ جاری ہوا ۔ لداخ وغیرہ کی سیاحت میں انہوں نے ہندوستان کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، وہاں سے بیشمار نفائس اور عجائبات لاکر عجائب خانہ لاہور کی نظر کئے ۔ اگرچہ یہ سیاحی صرف چھ مہینے کی تھی لیکن اس قلیل عرصے میں انہوں نے چار نئی زبانیں سیکھیں اور ان کے قواعد منضبط کر کے ثابت کیا کہ ہندوستان کی قدیمی زبان سنسکرت ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے انجمن پنجاب کے ذریعے حاکم ومحکوم کو شیروشکر کی طرح ملادیا ۔

ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی کوشش سے پنجاب میں یونیورسٹی کا درخت بار آور ہوا ۔ وہ شروع میں یونیورسٹی کمیٹی کے سکرٹری تھے بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے ۔

(فروری، مئی ۱۹۴۴)



امتیاز علی خان عرشی

امتیاز علی عرشی

اردو زبان اور اس کے الفاظ کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر

اردو زبان افغانیوں کی آمد ہندوستان کا نتیجہ ہے ۔ نہ یہ منچلے غزنوی، غوری، خلجی، لودھی، سوری، ابدالی اور روھیلہ لباس میں جوق در جوق یہاں آکر بستے اور نہ یہ زبان معرض وجود میں آتی ۔

عربی الفاظ :

یہ نووارد عربی، فارسی، ترکی اور پشتو چار زبانیں لے کر آئے تھے اس لئے ان ھی چاروں کے الفاظ کی اردو میں بہتات ہے ۔ لیکن پردیس میں پہنچ کر بہت سے الفاظ کی ھیئت لفظی و معنوی پر بھی اثر پڑا کرتا ہے ۔ افغانستان آکر عربی لفظوں میں بھی یہ تغیرات ھوئے اور جب اردو میں یہ لفظ آئے تو ان تغیرات کو اپنے ساتھ لے کر آئے۔ ھمارے عوام ابتر کو اوتر، اعجوبہ کو

اجوبہ، تنور کو تندور، خرج کو خرچ، سقایہ کو سقاوہ یا سقابہ، سیر کو سیل، شرکت کو شراکت، قفل کو قلف یا کلف، مزاح کو مزاخ، مشعل کو مشل یا مشال اور معصوم کو ماشوم اس لئے بولتے ھیں کہ انھوں نے افغانیوں کو ایسا ھی کہتے سنا تھا ۔

عربی لفظوں کے معنوی تغیر کی مثال میں یہ چند الفاظ پیش کئے جاسکتے ھیں ۔

۱ - ''امام،، کے معنی عربی میں پیشوا کے تھے - پشتو میں تسبیح ''سرکرہ،، کو امام کہنے لگے - ھم بھی اس معنی میں بولتے ھیں ۔

۲ - ''حجامت،، عربی میں پچھنے لگانے کو اور ''حجام،، پچھنے لگانے والے کو کہا جاتا ھے ۔ پشتو میں نائی کو حجام اور خط بنانے کو حجامت کہا گیا ۔ ھم بھی انھیں معنی میں استعمال کرتے ھیں ۔

۳ - ''حجت،، عربی میں دلیل کہلاتی ھے ۔ پشتو میں پہنچ کر اس سے مراد ھوا جھگڑا یا تکرار ۔ ھم بھی حجت اور حجتی، جھگڑے اور جھگڑالو کے معنی میں بولا کرتے ھیں ۔

۴ - ''خلاء،، عربی میں خالی ھونا اور ''ملاء،، بھرا ھونا ھے ۔ فارسی میں آس نے ''خلا ملا،، کی صورت اختیار کی اور خلوت و جلوت معنی ٹھہرے ۔ پشتو میں اس سے مراد ھوا گہرا دوست ۔ اردو میں آ کر گہری دوستی کے لئے مستعمل ھونے لگا ۔

۵ - ''خیرات،، عربی لفظ ''خیرۃ،، کی جمع ھے اور اس کے معنی

ہیں نیکیاں ۔ پشتو میں صدقہ کا مترادف قرار پایا اور ''خیرات کول،، کے معنی ہوئے خیرات کرنا یا صدقہ دینا۔ ہم بھی خیرات اور خیرات کرنے سے یہی مراد لیتے ہیں ۔

۶ ۔ ''رحل،، عربی اور فارسی میں اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں ۔ افغانیوں نے اسے رحیل بنا کر قرآن مجید کی لکڑی کی بیٹھک کے لئے استعمال کیا ۔ اہل اردو بھی اسی مطلب کو ادا کرنے کے لئے بولنے لگے ۔

۷ ۔ ''شئوم،، عربی میں نحوست کا مترادف ہے ۔ افغانستان میں کنجوس کو ''شوم،، کہا گیا تھا ۔ اردو میں بھی یہی مفہوم آ گیا ۔

۸ ۔ ''عرصہ،، بمعنی مدت ''غریب،، بمعنی مفلس اور ''محنت،، بمعنی مشقت و جدو جہد بھی پشتو ہی سے آئے ہیں۔

۹ ۔ ''منت،، بمعنی خوشامد' ''وبا،، بمعنی طاعون و ہیضہ اور ''وصال،، بمعنی وفات بزرگان دین کی بھی یہی صورت حال ہے ۔ ہم نے انہیں پٹھانوں ہی کی زبان سے سیکھا اور بولا تھا، اس لئے وہی معنی اردو میں قرار پائے جو پشتو میں مراد ہوتے تھے ۔

فارسی الفاظ :

فارسی کے بھی سیکڑوں لفظ افغانستان سے تغیر قبول کر کے آئے ہیں ۔ یہ تغیرات افغانی اور ایرانی فارسی کے درمیان مابہ‌الامتیاز کی حیثیت رکھتے اور افغانیوں ہی کی وساطت سے ہمارے عام و خاص سب کے زبان زد ہوئے ہیں ۔ عام طور پر انہیں تورانی

کہا جاتا ہے ۔ لیکن اہل علم واقف ہیں کہ جس علاقے کو یہ لوگ توران کہتے ہیں وہ در اصل فارسی زبان افغانیوں کا وطن ہے اور اس لئے ان تغیرات کو تورانی کی جگہ افغانی کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ افغانی فارسی کے یہ مابہ‌الامتیازات حسب ذیل ہیں :

۱ - بہت سے لفظ ایرانی لہجے میں ''گ'' سے شروع یا اس پر ختم ہوتے ہیں، اور افغانی اور ان کے اتباع میں ہندی انہیں عربی میں ''ک'' سے بولتے ہیں، جیسے گشادن سے کشادن ۔ گشنیز اور کشنیز گبک اور کبک، سرشگ اور سرشک ۔

۲ - ایرانی لہجے میں یای مجہول اور نون غنہ بھی سنائی نہیں دیتا ۔ اس کے برخلاف افغانی اور ہندی فارسی میں اس کا التزام کیا جاتا ہے ۔ مثلاً نیست اور نیست، پیش اور پیش، جہن اور جہان، مندم اور ماندم ۔

۳ - اسی طرح ایرانی لہجے میں ضمہ و کسرۂ مجہول بھی نہیں ملتے ۔ افغانستان اور ہندوستان کی فارسی میں ان کی بھی بہتات ہے، جیسے پوست اور پوست، دل من اور دل من ۔

۴ - جن لفظوں کے شروع میں‌ایرانی مد بولتے ہیں، افغانی و ہندی ان کو اکثر بے مد استعمال کرتے ہیں جیسے آچار و اچار، آستر و استر ۔

۵ - حرف علت کے بعد کی حرکت کو ایرانی بولتے اور افغانی و ہندی گرا دیتے ہیں ۔ جیسے آفرین اور آفرین، آمادگی اور آمادگی ۔

۶ - ایرانی لہجے میں جہاں دو ساکن جمع ہو جاتے ہیں افغانی و ہندی ان میں کے دوسرے کو بحرکت بولتے ہیں، جیسے آرج مند اور ارجمند -

۷ - بہت سے لفظوں میں ایرانی ''ب یا ک،، اور افغانی و ہندی ''پ یا گ،، بولتے ہیں مثلاً انکندن اور افگندن، شکوفہ اور شگوفہ، تب اور تپ، اسب اور اسپ، بادشاہ اور پادشاہ -

معنوی تغیر کی مثال میں حسب ذیل الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں :

۱ - ''آتش بازی،، فارسی میں آگ کا کھیل تھا - افغانستان میں اس لفظ سے انار پھلجھڑی وغیرہ مراد لئے گئے - اردو میں بھی یہی معنی ہیں -

۲ - ''پیچک،، ایران میں ''پیچ،، کی تصغیر تھی - افغانستان اور اس کے اثر سے ہندوستان میں اس کے معنی ہوئے دھاگے کا گولا -

۳ - ''پری،، فارسی میں جن کا مترادف تھا - مذکور ہو یا مؤنث پشتو اور اردو میں اس سے مراد ہوئی جن کی مونث یعنی جناتی -

۴ - ''جای ضرور،، ایران میں ہر ضرورت کی جگہ تھی - افغانیوں نے اسے عربی کے بیت‌الخلا اور فارسی کے ''ضروری، قدم‌جا یا آب خانہ،، کی جگہ استعمال کیا - اردو میں بھی یہی آخر معنی مروج ہو گئے -

۵ - ''خوار،، فارسی میں کمینہ اور مصیبت زدہ کہلاتا تھا -

پشتو اور اردو میں مفلس اور بے زر کو ''خوار،، کہا جاتا ہے ۔

۶ - ''خون،، فارسی میں لہو، کا مترادف تھا ۔ پشتو میں اسی کے معنی قرار پائے قتل اور ''خون کول،، مصدر کا مطلب ہوا خون کرنا یا مار ڈالنا ۔ اہل اردو بھی خون اور خون کرنا اسی مطلب کے لئے بولتے ہیں ۔

۷ - ''رسد،، فارسی مصدر رسیدن کا مضارع تھا ۔ افغانستان میں ضروریات لشکر کے لئے استعمال ہوا ۔ اور ''رسد رسانی،، ضروریات لشکر کا انتظام کہلایا ۔ اردو معلیٰ نے اسی افغانی مطلب کو اپنایا ہے ۔

۸ - یہی صورت حال ''رسید،، کی بھی ہے کہ ایرانی اس جگہ ''یافت،، بولتے تھے ۔ افغانیوں اور ان کی دیکھا دیکھی ہندیوں نے ''یافت،، کی جگہ رسید بولنا شروع کردیا ۔

۹ - ''گرم،، فارسی میں ''حار،، کا مترادف تھا ۔ افغانیوں نے اس سے مراد لیا ناراض یا خفا، اور ''گرم کول،، سے مراد لیا کسی کو ناراض کر دینا یا تاؤ دینا ۔ اردو میں بھی اس کا یہی مطلب لیا جانے لگا ۔

۱۰ - ''مرغ،، فارسی میں مطلق پرندہ تھا ۔ افغانستان میں تخصیص کے ساتھ ''خروس،، کو مرغ کہا گیا ۔ ہندوستان میں بھی مرغ کا مطلب یہی لیا جاتا ہے ۔

۱۱ - ''نیاز،، فارسی میں عجز کا مترادف تھا ۔ افغانیوں نے اس لفظ کو فاتحہ درود کے لئے استعمال کیا ۔ اس اثر سے اردو میں بھی بزرگوں کی فاتحہ ''نیاز،، قرار پاگئی ۔

۱۲ - یہی صورت حال ''یارانہ، دوستانہ،، کی ہے کہ بمعنی یاری و دوستی افغانستان سے آ کر اردو میں داخل ہوئے ہیں۔

فارسی کے کچھ لفظ ایسے ہیں جن کی لفظی کتر بیونت افغانستان کے پشتو بولنے والے عوام کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے۔ جب یہ لفظ ہمارے عوام نے سنے تو انہیں اسی متغیر شکل میں بے تکلف استعمال کرنے لگے۔ مثلاً باغبان کی جگہ باغوان یا بغوان امرود اور بید اور پلید کی جگہ امروت، بیت اور پلیت، جانور کی جگہ جناور، دیوار کی جگہ دوال، طویلہ کی جگہ طبیلہ، مرہم کی جگہ ملم۔

ترکی الفاظ آلتمغا، چکن، چلم اور چمچہ کو التمغا، چکن، چلم اور چمچہ بولنا بھی افغانیوں ہی کے لہجے کا اتباع ہے۔

پشتو الفاظ :

اردو میں سیکڑوں الفاظ، مرکب مصادر اور محاورات ایسے بھی نظر آتے ہیں جو عربی فارسی یا ہندی کسی دیسی یا پردیسی زبان سے تعلق نہیں رکھتے۔ اردو اہل لغت انہیں اردو ساخت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے بیشتر الفاظ پشتو کے ہیں اور افغانیوں کی وساطت سے اردو میں داخل ہوئے، مثلاً :

۱ - آلے بالے بتانا اور حیلے حوالے کرنا، اردو کے عام محاورے ہیں۔ ہندی کی چندی کرنے والے ''آلے بالے،، کو فارسی ''آرے بلے،، کا مہند قرار دیتے ہیں۔ لیکن فارسی میں آرے بلے یا حیلہ حوالہ کردن دونوں حوالے نظر نہیں آتے۔

پشتو میں ''حیله حواله کول'' اور ''آنے بہانے کول'' کا استعمال موجود ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں محاورے افغانستان سے آئے ہیں ۔ صرف ''آنے بہانے'' نے ''آلے بالے'' کا چولا بدل لیا ہے ۔

۲ ۔ یہی صورت ''ادل بدل'' کی ہے ۔ اردو لغت نویس اسے مہمند کہہ کر اپنا حق ادا کر دیتے ہیں ۔ حالانکہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ یہ لفظ افغانستان میں ڈھل کر ہمارے یہاں در آمد ہوا تھا ۔ ہم نے اس میں مزید تصرف کر کے ادلا بدلا اور ادلا بدلی بھی بنا لیا ہے ۔

۳ ۔ ''بچونگڑا'' آج کل کے لغات اردو میں نظر نہیں آتا ۔ لیکن میر علی اوسط رشک لکھنوی نے نفس اللغه (ص ۵۷) میں اس لفظ کو داخل کر کے بازاری بولی بتایا اور بچہ کا مترادف قرار دیا ہے ۔ یہ لفظ بھی ٹھیٹ پشتو ہے ۔ صرف اتنا فرق ہوگیا کہ وہاں بچونگڑے کہتے ہیں ۔ ہندوستان میں اس یای مجہول نے الف کی شکل اختیار کر لی ہے ۔

۴ ۔ اردو کا ایک لفظ ہے ''بگلو لو'' ۔ پلاٹس نے اس کے معنی بگلے کا بچہ بتائے ہیں ۔ انشاء اللہ خان نے دریائے لطافت (طبع کلکتہ ص ۱۱۶) میں لکھا ہے کہ دلی والے گالی کے طور پر بگلولو کے، بگلولو والے یا بگلولو کے بچے بولتے ہیں ۔ رامپور میں آج تک عورتیں بچوں کو ڈرانے کی غرض سے کہا کرتی ہیں کہ سو جا نہیں تو بگلولو آجائے گی ۔

پشتو زبان کا ایک لفظ ''بگلولئی'' ہے جس سے مراد وہ عورت ہوتی ہے جو بھیس بدل کر بچوں کو ڈرائے ۔ دلی اور رامپور کے

محاورے بتاتے ہیں کہ اردو میں بھی اس کا یہ مفہوم باقی ہے صرف شکل بگڑ گئی ہے، لہذا بگولو کو ہندی قرار دینا اور اس کے معنی بگلے کا بچہ بتانا غلط ہے ۔

۵ - ''پیزار،، جوتی کا مترادف ہے اور ''جوتی پیزار ہونا،، اور ''مری پیزار سے،، وغیرہ محاورات میں عام طور پر بولا جاتا ہے ۔ اسے لغت نویس فارسی بتاتے ہیں ۔ لیکن خود ایرانی بول چال میں کہیں نظر نہیں آتا ۔ پشتو میں البتہ بولا جاتا ہے ۔

۶ - ''صفا چٹ،، اور ''چٹ پٹ،، بھی عام بول چال کے لفظ ہیں مگر ان کی اصلیت بھی لغت نویسوں پر واضح نہیں ہوسکی ۔ در اصل پشتو میں ''چٹ،، اور ''چٹ پٹ،، کے معنی پورا، بالکل اور بتمامہ ہیں اور جب وہ لوگ ''چٹ وٹ،، بولتے ہیں تو اس سے مرگ مفاجات یا اچانک موت مراد ہوتی ہے ۔ پشتو کا حرف ''خ،، اپنی مخصوص آواز رکھتا ہے ۔ اس لئے اردو میں اس کا بدل ہمیشہ چ سے ہی کیا جاتا ہے ۔

اب آپ ''صفا چٹ،، پر غور کریں گے تو یہ یقین ہو جائے گا کہ اس کا مطلب چاٹ کر صاف کر دینا نہیں بلکہ بالکل صاف کر دینا ہے اور کسی کی اچانک موت کو ان الفاظ میں ادا کرنا کہ فلاں ''دم بھر میں چٹ پٹ ہوگیا،، ، اصلاً پشتو محاورے ہی کی نقل ہے ۔

۷ - رنگین، انشاء، اور جان صاحب کی ریختیاں جن کے مطالعے میں رہ چکی ہیں، انہوں نے ایک زنانہ دھتکار ''چل چخے،، ضرور

پڑھی ہوگی ۔ اس کا دوسرا جز چخے بھی پشتو ہے اور کتے کے پلے کو اس لفظ سے دھتکارا جاتا ہے۔

۸ - بال‌خورا، پیاج‌خور، جوتی‌خور، چغلی‌خور، حرام‌خور، ھلال‌خور، خوش خور، رشوت خور، سودخور، شراب خوری، شکرخوری، غوطہ خور، وغیرہ لفظوں کے آخری جز ''خور،، کو فارسی ''خوار،، کا مخفف خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ پشتو کے مصدر ''خوڑل،، سے مشتق ہے جو از روئے معنی فارسی مصدر ''خوردن،، کا مترادف ہے ۔ اور افغانیوں ھی کے ذریعے اس کے بیشتر مرکبات اردو میں داخل ہوئے ھیں ۔ بال خورا اور پیاج خور وغیرہ چند لفظ جن کا جز اول ھندی ہے پشتو مرکبات کی دیکھا دیکھی یہاں ڈھال لئے گئے۔

۹ - گدھے اور گھوڑی کے میل سے جو بچہ پیدا ھوتا ہے اسے سنسکرت میں ''کششر،، ھندی میں ''کھچر،، اور آردو میں خچر کہتے ھیں ۔ پشتو میں یہی لفظ ''قچر اور خچر،، دو شکلوں میں ملتا ہے ۔ ھندوستان میں دوغلے آدمی کو ''خچرہ،، کہنا اور مخلوط النسب لوگوں کو ''قچر خیل،، کا خطاب دینا یہ بتاتا ہے کہ ھم کھچر کے ''کھہ،، کو ''خ،، میں تبدیل کرتے وقت پشتو سے متأثر تھے ۔ ورنہ ''کھہ،، کو ''خ،، کیوں کر لیا جاتا ۔

اردو الفاظ میں کھہ کا خ سے بدل جانا کچھ مذکورہ الفاظ ھی کی خصوصیت نہیں ہے ۔ اور بھی بہت سے لفظ اس اثر کے تحت اپنی شکل بدل چکے ھیں ۔ ان میں سے وہ لفظ زیادہ قابل توجہ ھیں ، جن میں خ کے ساتھ ٹ وغیرہ مخصوص

ہندی حروف پائے جاتے ہیں ۔ چونکہ خ ہندی حرف نہیں اور ٹ وغیرہ فارسی اور ترکی میں نہیں پائے جاتے اس بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''کھ'' کا ''خ'' سے بدل جانا صرف پشتو ہی کا اثر ہے جس میں خ ٹ ڑ وغیرہ سب حرف پائے جاتے ہیں ۔

اس قسم کے الفاظ میں سے چند یہ ہیں:۔ اخروٹ، پٹخ، پٹاخا ٹٹخارنا، ٹخنا، چٹاخ، چٹوخا، جان چٹاخا، چٹخانا، چٹخارہ ۔

۱۰ ۔ اسی طرح وہ لفظ بھی جن میں ''ڈ'' کے ساتھ ''ف'' پائی جاتی ہو ، جیسے ڈف، ڈفلی، ڈفالی، ڈفالچی بھی پشتو لہجے سے بنے ہیں ۔ ورنہ ایرانی ''ڈ'' نہیں بول سکتا ۔ اور ہندی ''ف'' سے بے بہرہ تھا ۔

۱۱ ۔ ''ڈینگ'' کو پلاٹس سنسکرت کے ''ڈمبھ'' (فخر و غرور کا بگاڑ بتاتا ہے ۔ لیکن انشا نے دریائے لطافت (ص ۲۲۳) میں لکھا ہے کہ یہ لفظ بمعنی لاف، نیا اور عوام کی زبان ہے ۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ''ڈمبھ'' سے رشتہ نکالنا نری کھینچ تان ہے جیسے کوئی ڈیکوریشن انگریزی کو ''دیکھو رے شان'' اردو سے بنا ہوا بتا دے ۔

دراصل ''ڈینگ'' پشتو ہے اور اس کے معنی ہیں لوری اور گیت اور ''ڈینگ ڈینگے ویل'' لوری دینے کو کہتے ہیں ۔ پٹھانوں نے طفل تسلی کی جگہ یہاں کے باشندوں کے سامنے بولا ہوگا کہ ''کیا ڈینگ ڈینگے بولتے ہو ۔'' رفتہ رفتہ اس طفل تسلی کے مفہوم نے لاف، شیخی اور غرور کی حیثیت اختیار کر لی ۔

۱۲ - ''شتاہ اور شتاھہ،، اردوئی معلی کی حرم سرا کے منہ چڑھے لفظ ھیں۔ انشا نے دریای لطافت (ص ۱۶۷) میں حرام کار کا مترادف بتایا ہے۔ مگر اور لغت نویس لکھتے کہ یہ خطابات مکار اور چالباز عورت کو بیگمات کی طرف سے عطا ہوا کرتے تھے۔ انشا نے اس کا املا شطاح قرار دیا ہے۔ بعد کے لغت نویس لکھتے تو شتاہ ھیں مگر اصل شطاح ھی بتاتے ھیں اور کہتے ھیں کہ یہ عربی لفظ ہے۔

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، ایک صوفیانہ اصطلاح ''شطحیات،، ضرور تصوف کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر عربی میں ''شطح،، مادے کے موجود نہ ہونے کے باعث یہ لفظ بجائے خود معرب اور مولد کے درجے سے آگے نہیں بڑھتا۔

اب پشتو کو دیکھئے تو وھاں ''شتاہ،، اور ''شتاھہ،، (ت اور ھای ھوز کے ساتھ) موجود ھیں، اور دونوں کے معنی مکار ھیں، البتہ پہلا مذکر دوسرا مونث کے لئے استعمال ھوتا ہے۔ نیز دونوں کی ت مخفف ہے۔ ظاہر ہے کہ ھندوستانی عورتوں میں اس لفظ کا تصوف کی راہ سے داخل ھونا اور اس کے معنی کا اتنے بلند مقام سے اتنے نیچے درجے پر آ گرنا بہت ھی بعید از قیاس ہے۔ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ یہ لفظ بمعنئی مشہور پشتو سے آ کر اردو میں داخل ھوا ہے۔

۱۳ - اسی طرح اردو کے وہ تمام لفظ جن میں غ کے ساتھ ٹ، ڃ، ڑ وغیرہ ھندی حرف جمع ھیں، یا تو براہ راست پشتو سے آئے ھیں اور یا افغانیوں کے اثر سے ''کاف،، یا ''ق،، نے ''غ،،

کی شکل اختیار کر لی ہے - ایرانی یا مغل کا ھاتھ اس میں اس لئے نہیں کہ ان کی زبان میں ٹ، ڑ وغیرہ نہیں ہے - اور ھندی اس لئے اس تغیر سے عاجز تھا کہ اس کا گلا "غ" کو ادا نہیں کر سکتا تھا - جب افغانی نے یہ تغیر کر کے اپنے بچوں کو سکھلایا، تو رفتہ رفتہ شہری ھندی بھی اس کے عادی ھو گئے - گاؤں والے اب تک بھی اکثر جگہ گاف ھی بولا کرتے ھیں - مثلاً یہ لفظ پیش کیے جا سکتے ھیں :

آغوں، غپ، غپ شپ، غپڑ شپڑ، غپی، غٹ، غٹاغٹ، غٹ پٹ، غٹرغوں، غٹکنا، غچ، غچاغچ، غچ بچ، غچا، غچاکا، غچو، غچوپارہ، غچی پارہ، غچلی، غرپ، غلابیاں، غنڈہ، کلغی، نغد (نقد) -

ان لفظوں میں سے غپ (کتے کی بھوں بھوں) غچ، غچاغچ، (آواز) اور غڑپ (گھونٹ) نغد (بجای نقد) تقریباً اردو جیسے مفہوم ھی میں افغانی بھی استعمال کیا کرتے ھیں صرف غنڈا ان کے یہاں "غنڈایہ" بولا جاتا ہے -

۱۴ - اردو کا ایک لفظ ہے "کل کلا" اور اس قسم کے جملوں میں استعمال کیا جاتا ہے میں آپ کو فلاں بات کی پہلے سے اس لئے اطلاع دے رہا ھوں کہ کل کلا کو آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے مجھ سے ہر وقت کیوں نہ کہا تھا - اس لفظ کو ھندی "کل" بمعنی فردا کا مرکب سمجھا جاتا ہے - مگر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس کا تابع مہمل کیوں اور کہاں سے آیا - در اصل یہ بھی پشتو لفظ "کالہ کالہ" میں ذرا سا تغیر کر کے ٹھیک اسی مفہوم میں استعمال ھوتا

ہے جو پشتو میں تھا، یعنی ''کسی نہ کسی وقت، کبھی نہ کبھی'' ۔

۱۵ - ''کالا کلوٹا'' اردو میں سیاہ فام کو کہا جاتا ہے ۔ لغت نویس اس ''کلوٹے'' کو بھی ہندی ہی لکھتے ہیں حالانکہ یہ پشتو سے آیا ہے ۔ افغانی کالے مرد کو ''کلوٹ'' کہتے کالی عورت کو ''کلوٹہ'' کہتے تھے ۔ ہندیوں نے اسے بطور مترادف کالا کے ساتھ استعمال کیا، اور چونکہ ہندی میں الف علامت تذکیر ہے، اس لئے مرد کو کالا کلوٹا اور عورت کو کالی کلوٹی کہنے لگے ۔

۱۶ - گڈبڈ اور گڑبڑ بھی پشتو کے ''گڈوڈ'' سے بنے ہیں اور اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے لغت نویس اسے سنسکرت کے گھٹنا سے مشتق بتاتے ہیں ۔ میری رائے میں یہ ان کی نری گڑبڑ ہے ۔

۱۷ - اسی طرح گنے کی ''گنڈیری'' کو پراکرتی گنڈال، اور سنسکرتی ''گنڈک ال اکا'' سے تراشنا بھی زبردستی ہے ۔ پشتو میں یہی لفظ ''گنڈھیری'' کی سیدھی سادی شکل میں موجود ہے ۔

۱۸ - ''گرگا'' دہلی میں چیلا اور شاگرد کہلاتا ہے اور لکھنو میں بدکار اور بدوضع کو گرگا کہتے ہیں ۔ اس لفظ کو بھی ہندی خیال کر کے سنسکرتی اصل تلاش کی جاتی ہے، اور جب معقول سراغ نہیں ملتا، تو طرح طرح کے تکلفات برتے جاتے ہیں حالانکہ یہ پشتو کے ''گرگے'' سے بنا ہے ۔ معنی

وھی رشے ، تلفظ گرگا ھوگیا -

۱۹ ''گیدی،، اور ''گیدی خر،، بمعنی احمق و بے وقوف کے جز اول کو فارسی بتایا جاتا ھے، حالانکہ گیدی پشتو کے ''گیدے،، (بگاف مکسور و یای مجہول و دال مفتوح و یای مجہول) کا مہند ھے - پشتو میں اس کے معنی ھی گدھا ھیں، اور گدھا دنیا بھر میں احمق مانا جاتا ھے - ھندیوں نے پٹھانوں کی زبان سے ''گیدے،، سن کر اسے یہ نہ سمجھا کہ اس کے معنی ھی گدھا ھیں - صرف بے وقوف کا مطلب اخذ کر کے تنہا اور کبھی اس کے ساتھ فارسی خر شامل کر کے بولنے لگے -

۲۰ - گنجا اور گنجی مشہور لفظ ھیں - مگر ان کے سنسکرتی اصل بتانے سے لغت نویس قاصر ھیں، صرف ھندی لکھ کر چپ ھو جاتے ھیں - حقیقت میں یہ لفظ بھی پشتو ھیں - وھاں ''گنجے،، مرد اور ''گنجی،، عورت تھی، یہاں آ کر دونوں گنجا اور گنجی بن گئے -

۲۱ - یہی صورت حال گونگا اور گونگی کی بھی ھے کہ یہ پشتو میں ''گونگے،، اور گونگئی،، تھے - ان میں بھی معمولی لفظی تغیر ھوگیا ھے -

۲۲ - لتاڑ، اور لتاڑ بتانا اردو کے بہت عام لفظ ھیں یہ بھی پشتو ھی سے آئے ھیں وھاں ''لتاڑ،، کے معنی کھوندا ھوا ، روندھا ھوا ھیں اور تباہ برباد کو بھی لتاڑہ کہتے ھیں - اردو میں آکر اس کے معنی ڈانٹ ڈپٹ ھوگئے -

۲۳ - اردو کا لقا بھی پشتو لقه کا مہند ہے۔ اسے فارسی ''لج،، سے کوئی علاقه نہیں جیسا که ہمارے لغت نویس سمجھتے چلے آئے ہیں۔ ''لقندہ،، خود ہندی ساخت ہے۔

۲۴ - ''میاں،، ہندوستان کا مشہور تعظیمی لفظ ہے اور پیار و احترام دونوں مقصدوں کے تحت بولا جاتا ہے اسے ہمارے لغت نویس فارسی ''میراں،، کا مخفف بتاتے ہیں حالانکه یه پشتو کا لفظ ''میا،، میں نون غنه بڑھانے سے بنا ہے اور میرتقی‌میر کے عہد تک میاں اور میاں دونوں طرح بولا جاتا تھا چنانچه ان کا مشہور مقطع ہے۔

کی زیارت میر کی ہم نے بھی کل
لا ابالی ساھے پر کامل ہے میاں

۲۵ - ''ہارے ہارے کول،، پشتو میں خوشامد کرنے کو کہتے ہیں۔ پلاٹس نے ''ہارے کھانا،، کے معنی خوشامد کرنا لکھے ہیں اور ''ہاڑے،، کو ہندی بتایا ہے لیکن اس کی پراکرتی یا سنسکرتی اصل بتانے سے قاصر رہا۔ دراصل یه ہندی محاورہ پشتو ہی کی راہ سے آیا ہے اور اس کا ثبوت یه ہے که روہیل کھنڈ کی مسلمان مستورات میں ''ہاڑے ہاڑے کرنا،، آج تک بھی بولا جاتا ہے۔

۲۶ - ''ہاہا،، (ٹھٹھا) ''ہاہا بازی،، (دل لگی) ''ہاہو،، (شور) ''ہای‌ہوی،، اور ''ہے ہے،، یه سب لفظ بھی پشتو ہیں ''ہی‌ہی ، ٹھیٹھی ،، البته ہندی ہیں۔

۲۷ - ہله، بھی انہیں الفاظ میں شامل ہے جس کی اصل ہمارے

لغت نویس پر مشتبہ رہ گئی۔ در اصل یہ پشتو کے ''ملہ،، کو مشدد کرکے بنالیا گیا ہے۔

۲۸ - ''اوئی،، اور ''اوھی،، اردو کے مشہور زنانہ الفاظ ھیں جنہیں حیرت و استعجاب کے وقت عورتیں زبان سے نکالتی ھیں اور اس وقت علی‌العموم ناک پر ایک انگلی بھی رکھ لیا کرتی ھیں۔ یہ بھی پشتو کے لفظ ''ھوئی،، (کلمۂ حیرت) سے بنے ھیں۔

۲۹ - ''ھوبہو،، کو لغت نویس فارسی بتاتے ھیں اور اس کے ثبوت میں میرزا احسن ایجاد کا ایک شعر پیش کرتے ھیں جو ھندوستان کا ایک فارسی گو شاعر ہے۔ اھل ایران کے کلام میں باوجود تلاش مجھے یہ مرکب لفظ نہیں ملا پشتو میں البتہ یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ھوں کہ عربی کے ''ھوھو،، سے افغانیوں نے ھوبہو بنایا تھا۔ جب ان کے ساتھ ھندوستان میں یہ لفظ آیا تو ھندی فارسی دانوں نے حرف بہ سے دھوکا کھا کر اسے فارسی جانا اور اپنے کلام فارسی میں بھی استعمال کرگئے۔

تذکیر و تانیث:

اردو زبان میں سنسکرت اور عربی کی طرح الفاظ یا مذکر ھوتے ھیں یا مؤنث۔ اھل قواعد نے اس کے اصول استنباط کرکے اردو سیکھنے والوں کے لئے بڑی آسانی پیدا کردی ہے لیکن اھل علم آگاہ ھیں کہ یہ کوشش ابھی تک کماحقہ کامیاب نہیں ھوئی ہے۔ سیکڑوں عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ ان اصول کے برخلاف مذکر یا مؤنث بولے جاتے ھیں۔

چونکہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کا وجود ھی نہیں ھے اس لئے فارسی یا عربی الفاظ پر فارسی اصول تذکیر کے اثر انداز ھونے کا تو سوال ھی پیدا نہیں ھوتا عربی میں البتہ مذکر و مؤنث کی تقسیم موجود ھے مگر اس کے قواعد میں استثناء کی گنجائش نہیں نکلتی - چنانچہ سو سماعی مؤنثات کے علاوہ جس اسم کے آخر میں تاے تانیث الف مقصورہ یا الف ممدودہ پایا جائے وہ مؤنث اور باقی سب مذکر مانے جاتے ھیں -

اس صورت میں اگر کسی فارسی لفظ کو مؤنث یا مذکر بولا جائے گا تو اس کی وجہ اردو کے اصول ھوں گے اور جب کبھی اردو اصول کے برخلاف کوئی فارسی لفظ مذکر یا مؤنث قرار پاچکا ھوگا تو اس استثناء کے اسباب کا سراغ لگانا اھل قواعد کا فرض ھوگا -

اسی طرح عربی کے بھی جو لفظ اپنی اصل کے برخلاف مذکر یا مونث مستعمل ھونگے، اگر یہ اختلاف اصول اردو کے مطابق ھوگا تو خیر ورنہ اس بےقاعدگی کی وجہ بھی تلاش کی جائے گی -

چونکہ اردو میں فارسی عربی کے بہت سے ایسے لفظ پائے جاتے ھیں جو جنسیت میں اپنی اصل اور اردو دونوں کے خلاف ھیں اس لئے اھل فن نے غوروخوض کرکے اسی اختلاف کی ایک وجہ معقول پیدا کی ھے اور وہ یہ ھے کہ جب کوئی نیا لفظ ھماری زبان میں داخل ھوتا ھے تو کبھی جنسیت کی تعین میں اس کے ھندی مترادف کی جنسیت بھی اثر انداز ھوا کرتی ھے - مثلاً ''کلید'' کو ھم اس لئے مؤنث بولتے ھیں کہ اس کا ھندی مترادف ''کنجی'' مؤنث بولا جاتا ھے -

بلاشبہ اس اصول کے تحت بہت سے لفظوں کے تبادل جنسی کی علت کا سراغ لگایا جاسکتا ہے لیکن اس ہفتخوان کے طے کرنے میں ایک مشکل راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندی قواعد نویس ایسی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہندی لفظوں نے بھی غیر ہندی الفاظ کے اثر سے تذکیرو تانیث کا تبادل کیا ہے۔ مثلاً بیار، بستو اور پستک اصلاً مذکر تھے۔ اردو مترادفات ہوا، چیز اور کتاب کے اثر سے مؤنث بولے جانے لگے اسی طرح دیہ کی تذکیر و تانیث کے اختلاف میں بھی اس کا مترادف بدن مزکر بولا جاتا ہے۔

اگر یہ خیال درست ہے اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تو پھر یہ کس طرح یقین کیا جا سکے گا کہ جس لفظ کو ہم بخیال خود ہندی مترادف کے اثر سے جنس تبدیل کرتا دیکھ رہے ہیں، اس کا واقعی سبب بھی بس یہی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کے برخلاف ہندی لفظ نے بدیسی اثر سے اپنی جنسیت بدل ڈالی ہو اور اگر اس منزل کو بھی کسی نہ کسی طرح سر کرلیا جائے تو بھی کچھ لفظ ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن کی کوئی تاویل نظر نہیں آتی مثلاً غذا کا ہندی مترادف کھاجا مذکر ہے مگر ہم اسے بھی مؤنث ہی استعمال کرتے ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ جتنے پردیسی لفظ ہماری زبان میں پٹھانوں کی وساطت سے داخل ہوئے ہیں ان کی تذکیر و تانیث کی تعیین میں ہمارے بڑے بوڑھوں نے اپنے انہیں افغان استادوں کی پیروی کی ہے اور اس لئے بہت سے الفاظ ہمارے اصول زبان کے برخلاف مذکر یا مؤنث مروج ہوگئے ہیں۔ چنانچہ جتنا جتنا ماضی کی طرف پلٹتے

جائیے یہ اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور جتنا حال کی طرف آتے جائیے پشتو اصول سے جگہ جگہ انحراف پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً عربی کے وہ لفظ جو تفعیل وزن پر آتے ہیں، سوائے ایک تعویذ کے، اردو میں سب مؤنث بولے جاتے ہیں لیکن اس کے برخلاف پشتو میں ان کی تذکیر کا رواج ہے۔ اب اگر آپ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور ابن نشاطی وغیرہ دکونی شعراء کا کلام پڑھیں تو شاید بلا استثناء بالکل پشتو کے مطابق ان سب کو مذکر پائیں گے۔

اسی طرح آج آپ طاقت وغیرہ ان عربی لفظوں کو جن کے آخر میں تاے مصدری ہے مؤنث بولتے اور لکھتے ہیں لیکن دکنی شعراء ان سب کو اور میر تقی کے عہد تک کے شاعر بعض کو مذکر لکھتے تھے جو پشتو کے عین مطابق ہے۔

''آواز،، کو سارے اردو بولنے والے مؤنث بولتے ہیں لیکن رامپور میں ہر کہ و مہ ''اس کا اچھا آواز' اس کا بلند آواز،، وغیرہ ترکیبوں میں مذکر بولتا ہے۔ یہی تذکیر دکن میں بھی پائی جاتی ہے اور ولی دکنی تک نے اسے مذکر باندھا ہے۔ پشتو میں بھی یہ لفظ مذکر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی اور مثالیں بھی اس طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ پشتو کے اصول تذکیروتانیث کا ہماری زبان کے لفظوں پر خاصہ اثر ہے۔ اب آپ پشتو کا قاعدۂ جنسیت ملاحظہ فرمایئے اور اس کے پیش نظر اردو کے قدیم و جدید ادب کا جائزہ لیجئے۔ پھر دیکھئے کہ کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

پشتو کا قاعدۂ تذکیر و تانیث :

پشتو کا کلیہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ ''الف، و، ہ، ی،، میں سے کسی ایک حرف پر ختم ہو، وہ مونث اور باقی سب مذکر ہوتے ہیں (۱)۔

غور کرنے سے آپ کو اندازہ ہو گا ۔ کہ یہ قاعدہ عربی کے بڑی حد تک مطابق ہے۔ یعنی تای تانیث، الف مقصورہ اور الف ممدودہ، عربی علامات تانیث کی جگہ پشتو میں الف اور ہای ہوز تانیث کی علامات ہیں۔ گویا پشتو کا الف، عربی کے دو الفوں کے قائم مقام اور ہای ہوز اور تای تانیث کی بجائے ہے جو عربی زبان میں اس طرح (ۃ) لکھی جاتی اور حالت وقفی میں (ہ) بن جاتی ہے۔ نیز اس امر میں ہندی کے مطابق ہے کہ ی معروف ہندی کی طرح پشتو میں بھی علامت تانیث ہے۔

اب اس اصول کے تحت اردو زبان کے ان الفاظ پر غور فرمائیے جو مذکورہ بالا حروف پر ختم ہوتے اور اردو قواعد کے برخلاف مذکر یا مونث بولے جاتے ہیں ۔

(الف) اردو کے الف پر ختم ہونے والے لفظ مذکر مانے جاتے ہیں ۔ سوائے ان لفظوں کے :

---

۱ ۔ میں نے اس قاعدے کو کلیہ کہتے وقت کرنل راورٹی کی گرامر کی تفصیل کو قصداً نظرانداز کر دیا ہے ۔ اس لئے کہ ماخن فیہ پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑتا ۔ اہل تحقیق کو تفصیل کی خاطر مذکورہ کتاب خود ملاحظ فرما لینا چاہئے ۔

آسیا، جا، پروا، شمنا، قرنا، کیمیا، نوا، مرحبا، ھیجا، یغما، صل علا، صہبا، سیما، دینا، عقبیٰ، حمیٰ، کربلا، واویلا، چون و چرا، رعایا، برایا، املا، انشا، ایذا، ابتدا، انتہا، اشتہا، اعتنا، اکتفا، التجا، امتلا، استدعا، استرضا، تمنا، ادا، بقا، فنا، بلا، جلا، وغ، دلا، دغا صدا، قضا، جفا، حنا، دوا، دعا، صبا، حنا، عبا، قبا، سزا، جزا، ریا، فضا -

(ب) ایسی ھی آردو کے و پر ختم ھونے والے لفظ مذکر بولے جاتے ھیں - سوائے ان لفظوں کے :

ھجو، نحو، ضو، آبجو، آبرو، ابرو، بو، ترازو، جر، خو، دارو، جستجو، گفتگو، شست‌وشو، نازبو، شبو، کوکو، تگاپو، پرستو، زلو، رو، قلمرو، تگ‌ودو، روارو، گو -

(ج) ہ پر ختم ھونے والے لفظ بھی اردو میں مذکر استعمال ھوتے ھیں سوائے ان کے :

آہ، باہ، راہ، کاہ، واہ، پناہ، نگاہ، گیاہ، رداہ، نگہ، سپاہ، کلاہ، خردہ، درگہ، روباہ، رسم و راہ، دستگہ کارگہ، بارگہ، تن خواہ، خانقاہ، نانخواہ، مہرگیاہ، مردم‌گیاہ، واویلاہ، بسم اللہ، شکوہ، کوہ، جہ، شہ، براہ، گرہ، زہ، کنہ، تہیہ، پہیہ، شبیہ، توجہ، تنبیہہ، تنزیہ، توجیہ، نوبہ، توبہ، دفعہ، فضہ، زہرہ، فاختہ -

کیا ان الفاظ کی بےقاعدگی کو پشتو کے زیر اثر کہنا بے جا ھوگا - ان میں سے آپ وہ سب لفظ کاٹ دیجئے جو ھندی مترادف کی وجہ سے خلاف قاعدہ چل رہے ھیں - لیکن کیا بقیہ الفاظ پر بھی آپ کو پشتو کا اثر ماننے میں تامل ھوگا - اگر خدانخواستہ

آپ اثبات میں جواب دیں گے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ آپ کے خیال میں محمود غزنوی کے وقت سے بارھویں صدی تک افغانستان سے کوئی شخص بھی یہاں آ کر نہیں بسا، یا بسا تو دنیا بھر کے اصول معاشرت کے برخلاف ہندیوں نے افغانیوں کا اثر بالکل قبول نہیں کیا ۔ اس صورت میں آپ سے میں یہ دریافت کروں گا کہ

عربی مکسر جمعوں کی جنسیت :

اردو میں بہت سے عربی کے جمع مکسر لفظ واحد مذکر استعمال کئے جاتے ہیں اور یہ وحدت اور تذکیر دونوں اردو اصول کے تحت بھی نہیں ہیں ۔ مثلاً اشراف، اوصاف، آداب، احوال، احکام، اخبار، اسباب، اولیا، شمائل، حقوق ۔ بھلا آپ ان کی کیا توجیہہ فرماتے ہیں ۔ بظاہر اس امر میں کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جا سکتی، سوائے اس کے کہ پشتو میں یہ لفظ واحد مذکر بولے جاتے تھے، ہم نے بھی پٹھانوں کی زبان سے واحد مذکر سن کر واحد مذکر ہی مان لیا ہے ۔

نیز میں یہ دریافت کروں گا کہ عربی کے جو لفظ افعال، افتعال، استفعال، تفعل، اور تفاعل وزن پر آتے ہیں، اردو میں مذکر مانے گئے ہیں ۔ پھر حسب ذیل کی تانیث کی علت کیا ہے :

افعال : املا، انشا، ایذا، ایما، اصلاح، الحاح ۔

افتعال : ابتدا، اشتہا، وغیرہ الف پر ختم ہونے والے اور اصطلاح، اطلاع ۔

استفعال : استدعا وغیرہ الف پر ختم ہونے والے ۔
تفعل : تمنا، تسلی، تجلی، ترق، تجزی، توجہ، تفرع، توقع،
تفاعل : تحاشی، تراضی، تواضع ۔

ان میں سے حرف ی پر ختم ہونے والے لفظوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تانیث کا سبب یہ ہے کہ اردو میں ی علامت تانیث ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ آخر ہاتھی، دہی، گھی، آدمی، بھنگی، بہشتی وغیرہ بھی تو ی پر ہی ختم ہوتے ہیں ۔

قدیم اردو پر پشتو کا اثر :

نیز میں یہ عرض کروں گا کہ قدیم اردو میں حسب ذیل الفاظ کی تذکیر کا سبب کیا ہے :

طلب، مضراب، محراب، شراب، تاب، رکاب، ضرب، جیب، آب، آب و تاب، نقاب، بحث، حدیث، احتیاج، طرح، فرح، شرح، فتح، مدح، روح، صلاح، سرلوح، دوزخ، داد، بنیاد، یاد، باد، مراد، امداد، مسند، مسجد، امید، عید، بکرید، دید، کاید، پند، گرد، سند، حمد، محشر، مجمر، کشور، فکر، بہار، جز، خاطر، خیر، قدر، سیر، سپر، چادر، شکر، کمر، بصر، زنار، گفتار، نروار، عار، نیشکر، سطر، یادگار، دیوار ۔

طرز، دہلیز، پرواز، آواز، جنس، ہوس، ناموس، مجلس، نرگس، آتش، سفارش، خورش، تابش، عرض، بساط، شرط ۔

طبع، نزاع، صنع، شمع، متاع، تیغ، زلف، صف، سیف، لاف ۔

خلق، برق، شفق، خاک، خاشاک، کاک، کمک، عمک، مرگ۔

مثال، مجال، سلسبیل، عقل، دلیل، دلیل، مشکل، آب وگل، بلبل، مشعل، جنگ و جدل، نقل، غزل، حمائل، قال و قیل، مثل۔

فہم، خاتم، زمام، رسم، قلم، رقم، چشم، بزم، شرم۔

سوزن، زین، معدن، انجمن، شان، زبان، جان، میزان، کمان، میان، داستان۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے، ان الفاظ کی سابقہ تذکیر اور موجودہ تانیث کی کوئی ایسی علت خیال میں نہیں آتی، جو مسکت ہو، سوائے اس کے کہ اسے پشتو کا اثر مانا جائے اور اسے ہندی ترادف کا نتیجہ جانا جائے، یا بعض الفاظ کی حد تک معاملے کو ہنوز مبہم تصور کیا جائے۔

مختلف فیہ الفاظ :

اسی طرح میں یہ بھی گزارش کروں گا کہ اردو میں بہت سے لفظ ایسے بھی ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں دہلی و لکھنؤ کے استاد آج تک اختلاف رکھتے ہیں اور اس لئے ان کی دونوں جنسیں اصولی تسلیم کر لی گئی ہیں۔ ان میں سے یہ لفظ ابھی تک دہلی میں مذکر بولے جاتے ہیں۔ یا غدر سے پہلے تک کے اساتذہ نے انہیں مذکر باندھا ہے :

خراش، ململ، سیر، حد، دشنام، ایجاد، ہار، پرواز، پیداوار، پیش قبض، تاب و تواف، خلش، خلط، زہب، سیل، غور، فتراک،

فکر، قامت، قلم، مخمل، شکن، پند، پیکان، بہشت، جراحت، زنار وغیرہ -

آخر اس اختلاف کا باعث کیا ہے، اور کیوں اس قسم کے بیشتر لفظ دھلی میں مذکر استعمال کئے جاتے ہیں -

چونکہ ان لفظوں کو رامپور اور روھیلکھنڈ کے ان شہروں مین جہاں پٹھانوں کی نسل زیادہ آباد ہے زیادہ تر مذکر ھی بولتے ھیں اور پشتو میں بھی یہ مذکر ھیں اس لئے میں یہ قیاس کرتا ھوں ان کی تذکیر کی وجہ پشتو کا اثر ہے - چونکہ مغربی ھندوستان پر پٹھانوں کا اثر نسبتاً زیادہ رھا ہے اس لئے صرف روھیلکھنڈ ھی کی زبان نہیں مغربی یو - پی اور دھلی کے اضلاع بھی تذکیر و تانیث میں پشتو سے زیادہ متاثر ھیں -

جو کچھ سطور بالا میں عرض کیا گیا وہ بالکل نیا خیال ہے اس لئے یہ احتمال ہے کہ میں نے سوچ بچار کرتے وقت بعض جگہ ٹھوکر بھی کھائی ھو لیکن یہ امر یقینی ہے کہ کہیں بھی رائی کو پربت بنانے کی کوشش نہیں کی - اگر اس سلسلے میں اھل علم نے تحقیقی قدم اٹھایا تو بہت جلد حقیقت اپنی قرار واقعی شکل میں ظاھر ھو جائے گی اور آج تک ھمارے مورخین ادب اور محققین زبان جو کچھ کہتے چلے آئے ھیں اس میں خاصی ترمیم کرنا پڑے گی - چونکہ اب اس زبان کے بہی خواہ آزاد ھوچکے ھیں اور ان کے سامنے اس زبان کو اس کا واجبی حق ادا کرنا ہے اس لئے توقع یہ ہے کہ میری جسارت بے وقت کی راگنی شمار نہ کی جائے گی -

چونکہ افغانوں نے اپنے دور عروج میں پورے ھندوستان

میں گھوڑے دوڑا دئے تھے اس لئے میرے اس خیال کے پیش نظر ہندوستان کی دوسری صوبائی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ کی نئی جانچ پڑتال کی گئی تو ان میں بھی افغانوں اور ان کی فارسی و پشتو کے حیرت انگیز اثرات کا سراغ مل جانا یقینی امر ہے ۔ خدا کرے اہل علم اس طرف توجہ کریں اور افغانوں کے ان لسانی اثرات کا پتہ چلا کر داد تحقیق بھی دیں اور ان مرحومین کا شکریہ بھی ادا کریں جنہوں نے ہماری زبانوں کی اصلاح و ترقی میں بیش از بیش حصہ لیا تھا ۔

آخر میں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں کرنل راورٹی کی لغت پشتو گرامر کے علاوہ نواب محبت خان اور نواب اللہ یار خان کے پشتو لغات اور اردو و فارسی کے تمام مطبوعہ لغات و قواعد کو پیش نظر رکھا گیا ۔

(مئی ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر محمد باقر

جرمن شاعر فراسو کا قصۂ عشق افزا

اردو کے غیر ملکی شعرا اور ان کے محسنوں کی تاریخ میں بیگم سمرو اور اس کے دربار کو خاص اہمیت حاصل ہے - بیگم سمرو در اصل ایک کشمیری نژاد مسلمان عورت تھی جس نے ۱۷۸۱ء(۱) میں ایک عیسائی والٹر رین ہارڈ سومبر(۲) سے شادی کی - جس وقت بیگم سمرو کی شادی سومبر سے ہوئی اس وقت اس کی پہلی بیوی فوت ہوچکی تھی جو مسلمان تھی- یہ بیوی ایک لڑکا چھوڑ کر مری جس کا نام ظفریاب خان تھا - ظفر یاب خان نے باھو بیگم سے شادی کی - اس باھو بیگم کی ھمشیرہ (جس کا نام معلوم نہیں ھوسکا) اور ایک جرمن آگسٹین گاٹلیب کوین(۳) کے ہاں

---

1. Banerjee B., *Begam Samru.* (Calcutta, 1922).
2. Walter Reinhardt Sombre.
   نام کے آخری حصے کو بگاڑ کر لوگ سمرو یا شمرو کہنے لگے
3. John Augustine Gotlieb Koine.



ڈاکٹر محمد باقر

۱۷۷۷ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام فرانسوا گوٹلیب کوین(۱) رکھا گیا - اس لڑکے نے بڑے ہو کر اپنے نام کے پہلے حصے کی مناسبت سے فراسو تخلص اختیار کیا - اس کے سوانح حیات کی تفصیل رائے بہادر رام بابو سکسینہ نے اپنی انگریزی تصنیف ''اردو اور فارسی کے یورپی اور ہندی یورپی شعراء'' اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۴ء) میں درج کی ہے - چونکہ سکسینہ اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے متداول ماخذ سے تمام معلومات فراہم کر کے یکجا جمع کردی ہیں اس لئے ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہو گا - خواہشمند اصحاب ادب اردو کی اس تاریخ اور مضمون کو خود ملاحظہ فرماسکتے ہیں(۲) - میں یہاں بحث کو فراسو کی ایک تصنیف تک محدود رکھوں گا جس کا مخطوطہ مجھے قیام پاکستان کے بعد لاہور کے ایک بازار سے ملا ہے - یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ مخطوطہ لاہور میں کیسے اور کب پہنچا - لیکن قیاس کہتا ہے کہ دوران فسادات میں جب لاہور کے بہت سے نجی کتبخانوں کو لوٹا گیا اس وقت یہ نسخہ بھی کسی کتب خانے سے نکل کر بازار میں پہنچ گیا - یہ مخطوطہ فراسو کا قصۂ ''عشق افزا'' ہے -

''عشق افزا'' کا یہ نامکمل مخطوطہ فول سکیپ ساڑھے سات انچ ضرب ساڑھے گیارہ انچ تقطیع کے ۹۲ (۳) اوراق پر مشتمل ہے - دیسی کاغذ کو استعمال کرنے کی متداول رسم کے علی الرغم

1. Francois Gotlieb Koine.
2. Ram Babu Saksena, *Europeu and Ind-European Poets of Urdu and Persian*. (Lucknow, 1941)
۳ - ہر صفحہ پر ۱۵ سطور ہیں اور ہر سطر میں تقریباً ۱۶ لفظ ہیں -

اس مخطوطے پر انگریزی ساخت کا دبیز کاغذ صرف کیا گیا ہے جس کے اوراق پر یکے بعد دیگرے دو قسم کے نشان آب (Water Mark) بنے ہوئے ہیں - جن میں ایک میں ملکۂ انگلستان (وکٹوریا) کو عصائے شاہی کے ساتھ بیٹھا ہوا دکھایا ہے اور دوسرے میں دل کی شکل بنی ہوئی ہے، جس کے نوکیلے حصے پر لندن (London) لکھا ہوا اور محرابی حصے کے دائیں بائیں انگریزی میں ۱۸۳۹ کے اعداد مندرج ہیں - ان نشانات آب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کاغذ ۱۸۳۹ء میں انگلستان میں بنایا گیا تھا - اور کاتب کی رسائی اس ولائیتی کاغذ تک تھی جو غالباً انگریزوں کے سرکاری کاموں کے لئے ہی ہندوستان میں استعمال ہو رہا تھا - چونکہ مخطوطہ کاغذ کے سن ساخت یعنی ۱۸۳۹ء کے بعد لکھا گیا ہے اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ فراسو نے خود ہی یہ کاغذ کاتب کو دیا ہو کیونکہ فراسو ۱۸۶۱ء تک بقید حیات تھا - چونکہ قصہ کے آغاز یا اختتام پر اس کی تاریخ تصنیف یا تاریخ کتابت درج نہیں اس لئے معین طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قصہ کب لکھا گیا - البتہ زیر بحث نسخہ کی کتابت کا سن کاغذ کی تاریخ سے اس حد تک معین کیا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۳۹ء کے بعد مرتب ہوا -

عشق افزا کے مطالب

فراسو نے بسم‌اللہ کی بجائے مخطوطہ کا آغاز روح القدس سے کیا ہے اور اس عنوان کے تحت تقریباً تین صفحات پر نثر میں اور دو صفحات پر نظم میں حمد باری تعالیٰ بیان کی ہے - نظم میں حمد کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

اگر حمد ایزد نہ کیجے رقم
زبان قلم یک‌قلم ہو قلم

اور یہ حمد تیس اشعار پر ختم ہوتی ہے ۔

حمد کے بعد فراسو نے دوسرا عنوان یوں قائم کیا ہے ۔

''نعت سلطان الانبیا حضرت عیسیٰ روح اللہ ذات خدا،،

اور اس عنوان کے تحت نثر میں چند سطور لکھنے کے بعد ۱۷ شعر نعت کے لکھے ہیں ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

گرچہ بھیجے ہیں بہت حق نے رسول (۱)
جان و دل سے سب کئے ہم نے قبول

لیک بھیجا حضرت عیسیٰ کو جب
ہو گیا روشن جہان تاریک سب

بے پدر پیدا ہوا وہ ماہ ہے
بیشک اس کی ذات روح‌اللہ ہے

اس نعت کے بعد ''تصویر حضرت عیسیٰ روح اللہ،، کا عنوان قائم کرکے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کاتب یا مصنف کا ارادہ اس خالی جگہ پر تصویر بعد میں بنانے کا تھا لیکن کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا یہ التزام سارے مخطوطے میں قائم ہے رکھا گیا ہے اور جابجا تصویروں کے لئے جگہ خالی چھوڑی ہوئی ہے ۔

حضرت عیسیٰ کی نعت کے بعد ''شاہ کشور لندن،، کی

۱ ۔ عشق افزا : ورق ۳ الف

مدح سرائی کی گئی ہے اور معمول کے مطابق اس مدح کا آغاز نثر سے اور اختتام نظم پر ہوتا ہے ۔ نظم کے ابتدائی اشعار سنئے :

شہ دار عالم بدور جہاں
فلک جس کے ایوان کا سائباں

معلیٰ جناب و مقدس خطاب
جہانگیر چوں پنجۂ آفتاب

وہ ہے منبع فیض و انصاف و داد
بر آتی ہیں اوس سے دلوں کی مراد

اس مدح سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت (۱۸۳۷ء-۱۹۰۱ء) سے پہلے ہی لکھا جاچکا تھا ۔ چونکہ شاہ لندن کا نام نہیں لکھا گیا اس لئے شاہ لندن کا تعین بھی یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا ۔ ہرچندپور ضلع میرٹھ میں فراسو کی جو قبر ہے ، اس کے کتبہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فراسو ۱۷۷۷ء میں پیدا ہوا تھا ۔ یہ زمانہ جارج سوم کے عہد حکومت (۱۷۶۰ء-۱۸۲۰ء) کا ہے ۔ جارج سوم کے مرنے تک فراسو ۴۳ برس کا ہوچکا تھا اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس عہد میں ہی یہ قصہ لکھا گیا ہو لیکن فراسو چونکہ جارج چہارم (۱۸۲۰ء—۱۸۳۰ء) اور ولیم چہارم (۱۸۳۰ء—۱۸۳۷ء) کے عہدوں میں بھی زندہ رہا اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ مندرجہ بالا قصیدہ میں ان میں سے کوئی بادشاہ اس کا ممدوح ہو اور قصہ ان کے عہد میں لکھا گیا ہو ۔

---

۱ - عشق افزا : ورق ۵ ب

مدح کے بعد ''تصویر شاہ لندن،، کے لئے جگہ چھوڑ دی گئی ہے - اس کے بعد ''نظم دو توحید و حمد ربانی بکلام ہندی اردو معلیٰ،، درج ہے - آغاز ملاحظہ فرمائیے :

خدایا کر مجھے وحدت سے آگاہ(۱)
اسیر دام کثرت ہوں میں ہر راہ

جہاں آئینہ آسا پر صفا ہے
ترے ہی عکس سے جلوہ نما ہے

اپنے گناہوں کی بخشش کی التجا کرتے ہوئے اس نظم سے آگے فراسو نے تیرہ شعر ''در صفت عشق،، لکھے ہیں جن کا آغاز یوں ہوتا ہے :

رکھ اپنے عشق میں مجھ کو ہمیشہ(۲)
مرے دل کو تو کردے عشق پیشہ

ترا ہی عشق ہردم رہنموں ہو
مرا دل غنچہ آسا غرق خون ہو

صفت عشق کے بعد ''مرتبہ عشق و محبت،، میں ۲۷ اشعار نظم کئے گئے ہیں جن میں سے دو اشعاو درج ذیل ہیں :

کرے سارا جہاں مجھ کو ملامت(۳)
نہ آوے عشق بازی سے ندامت

---

۱ - عشق افزا : ورق ۶ ب
۲ - ایضاً : ورق ۸ ب
۳ - عشق افزا : ورق ۷ ب

رہے سر پہ مرے سودا کا سایہ
جنوں ہردم رہے دل میں سمایہ

اس کے بعد ''در صفت سخن'' کے عنوان کے تحت فراسو نے اپنے سخن کی تاثیر کے لئے یوں دعا مانگی ہے :

الہی دے سخن میں میرے تاثیر(۱)
کہ ہو جیوں قند شیریں میری تقریر

سخن میں نالۂ بلبل کا ہو ڈھنگ
کہ مثل گل ہو اوس پر آب اور رنگ

. . . .
. . . .

مرے شعروں کو یارب نغز کردے(۲)
معانی سے انہیں پرمغز کر دے

سخن کے باغ کو دے آب اور رنگ
فراسو کو کہانی کا ہے آہنگ

کہانی کی کرے تاثیر موزوں
کہ جس سے سننے والے کا ہو دل خوں

کہے بلبل نمط رنگیں حکایت
او کھاڑے اک نیا گنج محبت

نئی بات اور نیا طرز بیاں ہو
نیا راز دل عاشق عیاں ہو

---

۱ - عشق افزا : ورق ۹ ب
۲ - عشق افزا : ورق ۱۰ ب

اس التجا کے بعد فراسو نے اپنا اور قصۂ عشق افزا کا تعارف یوں کرایا ہے :

ہیچمدان ناتوان فراسو کوین ولد جان گوٹلب کوین قوم الیمان اگرچہ لیاقت و استعداد اس قدر نہیں رکھتا کہ آپ کو بزمرہ اہل علم نظم نثر جانے، مگر باتفاق ہنگام ایام بیدلی و پریشان حالی بہ عشق لیلیٰ وشی جور زمانۂ بوقلموں سے چندے عالم تنہائی و گوشہ گیری میسر ہوا، اوسوقت خیال دل دردمند پر گذرا کہ ایک افسانہ رنگین و دلچسپ تازہ و ہر درد بصد شکرنگاری تحریر کرے . . . . آخر کار بہزار حسن و خوبی نام اس قصہ کا عشق افزا موسوم کیا ۔ (۱)

اور اس بیان کے بعد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی ہے جس کے اوپر سرخ سیاہی سے عنوان قائم کیا ہے :

''تصویر مصنف کتاب فراسو کوین قوم الیمان ساکن ولایت ہولینڈ''

اس عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ فراسو نسل کے لحاظ سے جرمن تھا لیکن ایسا جرمن تھا جس کے آبا و اجداد نے مستقل طور پر پولینڈ میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔

ان ابتدائی ابواب کے بعد داستان کا آغاز ہوتا ہے اور شروع

---

۱ ۔ عشق افزا : ورق ۱۰ ب و ۱۱ الف

میں فراسو نے نظم اور نثر میں دہلی کی تعریف کی ہے۔ نظم در صفت شہر دہلی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

شہر دہلی یوں ہے ہندوستان میں
جیسے ہو رنگین چمن بستان میں

اس کا اس رونق پہ ہر بازار ہے
جیوں نمود اک تختۂ گلزار ہے

بیچ میں بازار کے اک نہر ہے
آب کوثر کی سی جس میں لہر ہے

یوں کناروں پر شجر ہیں سایہ‌دار
جن کے اوپر کیجے طوبیٰ کو نثار

مالنیں سب اون درختوں کے تلے
بیٹھی ہیں پھولوں کے ہاروں کو لئے

. . . .
. . . .

. . . .
. . . .

جابجا بیٹھے ہوئے صراف ہیں
وہ بھی اپنے کام میں حراف ہیں

ایک جانب اشرفی کا ڈھیر ہے
جس کو دیکھے سے طبیعت سیر ہے

اور روپوں کا اک طرف انبار ہے
جس کا جلوہ گرمئ بازار ہے

پیسے کی دلی نہیں ہرگز کمی
اپنے گھر کنگال بھی واں ہے غنی(۱)

دلی کی تعریف کے ساتھ ساتھ چاندنی چوک کی تعریف نظم کی ہے اور اس وقت کے چاندنی جوک کی زندہ تصویر قارئین کے سامنے پیش کردی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

چاندنی چوک اوس کے ہے درمیان میں
خوب ہے اپنی ادا و آن مین

هووے ہے وقت سہ پہری جس گھڑی
آگے هوتی ہے وهاں خلقت کھڑی

اوس جگہ جو ہے پراچہ کی دوکان
بیچتے ہیں ٹوپیاں اور دولمیاں(۲)

وه پری بٹوه تمامی طاش کے
هاتھ میں دلبر کے هوویں کاش کے

اور کوئی بیٹھا کہیں حسب صلاح
بیچتا ہے رکھ کے دوکان پر صلاح

بیٹھے ہیں هرجا بساطی با نشاط
کہتے هیں اپنی بھی ہے کچھ تو بساط

بیٹھے رهتے هیں جدهر چنے فروش
چین کے بازار کا رهتا ہے جوش

ہے کہیں پکتا کباب اور شیر مال
جس سے دل ہے نوش کا هووے بحال

۱ - عشق افزا : ورق ۱۱ و ۱۲
۲ - دول اور میان سے مرکب ہے بمعنی بٹوه جو کمر پر باندھا جائے۔

اودھر (اوڑھ) برقہ (کذا) آتیاں مغلانیاں
تا کہیں جاویں نہ وہ پہچانیاں

کرتیاں انکیاں کشیدہ کی دکھا
لیتی ہیں ہر ایک کے دل کو لبھا

سقہ کہتے ہیں کٹوروں کو بجا
ٹھنڈا پانی ہے پیو دریاؤ کا

خوانچہ والے پھریں ہیں سوبسو
اپنی اپنی وضع کی کر گفتگو

کوئی کہتا ہے کہ خاصہ سیب ہیں
حادثہ سے غم کے بے آسیب ہیں

کوئی بیچے فالسہ اور رنترے
ہے کھڑا کوئی کسی کونے لگے

کوئی میٹھے بیچتا ہے راہ راہ
کوئی کم رکھتا ہے ان باتوں کی چاہ

کیا شریفہ خوب اور انگور ہیں
شربت شیریں سے سب معمور ہیں

ناشپاتی ہے بہی ہے اور انار
عام ہے جامن کے اوپر بھی بہار

اک طرف کیلہ اکیلہ ہیں دھرے
ایک سو آڑو چنگیرے میں بھرے

ہے غرض بازار پر یہ آب و رنگ
دیکھ کر جس کو چمن ہو جاوے دنگ!

۱ - عشق افزا : ورق ۱۳ -

افسانه

اس کے بعد جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ پر بالترتیب دو نظمیں ہیں جن کے بعد افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔ قصہ کا پلاٹ ان دنوں کے روایتی قصوں کے پلاٹ سے مشابہ ہے۔ زمانۂ سلف میں ایک بادشاہ مسعود شاہ نامی تھا جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا تو ایک درویش سے ملاقات ہوئی جس نے اسے ایک سیب دیا۔ بادشاہ نے یہ سیب ملکہ کو کھلایا تو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ماہ رو رکھا گیا۔ لڑکا بڑا ہوا تو وزیر زادہ دل افروز کے ساتھ مکتب جانے لگا۔ جوان ہوا تو محفل عیش و نشاط رچانے لگا۔ اسی طرح کی ایک محفل طرب ایک روز شاہی باغ میں منعقد ہوئی۔ اور جب:

"مجمع نازنینان سراپا ناز و خوبان خوش آواز برنگ شعلۂ جوالہ سرگرم رقاصی ہوئے قلوب سایر حضار چرخزن ہو کر روتی اور جس ساعت شاہدان نغمہ ساز بہ قانون دلربائی آہنگ ساز ترنم کو آراستہ کرتے ہوش سر کوچک و بزرگ سے کھوتے۔ لحن دلکش ماہ رویان بے مہر سے ناہید فلک پر گربجوش ہوا۔ طرب الادای سنبلین مویان گلچہر سے جمشید زیر زمین بے ہوش ہوا۔ اس ہنگام عشرت فرجام میں کہ در و دیوار مست کیفیت و سرخوش بادۂ ترنم تھے فراش روزگار نے پرتو ماہ سے بساط نقرہ باف فرش کیا اور ساقیان شوخ و شنگ نے جام بلورین آب آتش سے دماغ اہل بزم کو پیغام خرمی دیا۔ شاہزادہ نے مسرت اندوز سیر مہتاب

ہو کے دختر رز کو کہ مانند نور بصر مدام حجاب زجاجی و نقاب غیبی میں مستور تھی یاد فرمایا ۔ فوراً جلوہ افروز حجلۂ پیالہ ہوئی و ہر یک کو سرشار کیفیت حسن و پر دماغ حسن کیفیت کیا ۔ تا نصف شب حاضران انجمن عیش صدائے زیر و بم مطربان باربد نوا و تماشائے جمال لولیان زہرہ لقا سے محظوظ ہوئے ۔ ہر یک کو عطائے بیڑہ پان و عطر سے رخصت فرمایا ۔ اور آپ وہ رشک ماہ و مہر مانند ہلال عید لب بام پر آیا اور پہلو بستر استراحت سے آشنا کر کے آرام فرمایا ۔،، ۱

اسی رات پریوں کا ایک گروہ اُڑتا ہوا اس باغ میں پہنچا اور سرخیل پریزادان گیتی آرا کی تجویز پر سوئے ہوئے شاہزادہ کو دوسری پریاں اڑا کر شہزادی مہر نگار کے پاس لے گئیں جو ایک اور مملکت کی شہزادی تھی اور اپنے باغ میں سوئی ہوئی تھی ۔ ماہ رو کو مہر نگار کے پہلو میں لٹا کر پریوں نے دونوں کو جگا دیا اور نظر سے اوجھل ہو کر تماشہ دیکھنے لگیں ۔ مختصراً یہ کہ ماہ رو اور مہر نگار ایک دوسرے کو دیکھ کر معاً ایک دوسرے پر فدا ہو گئے اور شہزادی نے اپنا مقنع زرتار شہزادے کو دیا اور اس سے دوشالہ اور انگشتری لی ۔ کچھ دیر کے بعد دونوں پھر سو گئے اور پریوں نے پھر ان کو علیحدہ کر دیا ۔

صبح شاہزادہ ماہ رو بیدار ہوا تو رات کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا ۔ شہزادی کو پاس نہ پا کر پہلے حیران ہوا اور پھر

---

۱ ۔ عشق افزا : ورق ۲۲ و ۲۳ ۔

پریشان ہوا۔ جب آرزوئے محبوب حد سے تجاوز کرنے لگی تو وزیرزادہ دل افروز کو ساتھ لے کر کوچۂ یار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ابھی سفر کا آغاز تھا کہ لشکر کے سامنے ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا گذرا۔ شہزادہ اور وزیرزادہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور اپنے لشکر سے جدا ہوگئے۔ لشکر روتا پیٹتا مسعود شاہ کے پاس پہنچا اور ماہرو اور دل افروز کا قصہ کہہ سنایا۔ ہرن دونوں دوستوں کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ جب یہ واپس ہونے لگے تو نشان راہ کا پتہ نہ ملتا تھا۔ لق و دق صحرا میں بالآخر اپنے گھوڑوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے اور چلتے چلتے جب ایک دریا پر پہنچے تو اسے عبور کرنے کے لئے ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ دریا میں طوفان آیا تو کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر غرق ہوگئی۔ صرف ایک تختہ بچا جس پر دونوں دوست سوار ہوکر کنارے لگے اور دشت نوردی کرنے لگے۔ اس صحرا میں تمازت آفتاب سے جب شاہزادہ بیقرار ہوا تو وزیرزادہ اسے ایک درخت کے نیچے بٹھا کر خود پانی کی تلاش میں نکلا۔ جب وزیرزادہ شام تک نہ لوٹا تو ماہرو درخت پر چڑھ گیا تاکہ درندوں سے محفوظ رہ کر رات بسر کرے۔ اتفاق دیکھئے کہ رات کو اسی درخت کے نیچے پریزادوں نے ایک مجلس منعقد کی جس میں ”خنیاگران خوش آواز،، اور ”رقاصان زنگولہ نواز،، نے شرکت کی۔ اور جب انہوں نے یہ غزل پڑھی:

مجنوں کی طرح مجھ کو دیا دیس نکالا
اے عشق بتاں سلمہ اللہ تعالیٰ

ابرو نہ ہو کیوں تیغ، مژہ کیوں نہ ہو بھالا
اب تو بت نادان نے مرے ہوش سنبھالا

گل کی طرح کیونکر نہ کروں چاک گریباں
دل پر مرے دوری کا تری داغ ہے لالا

کس رنگ بچے یار یہ صید دل عاشق
ابرو تو تری تیغ ہے مژگاں تری بھالا

جیوں برق چمکتا ہے پڑا اے مہ عالم
بالا ہے ترے کان کا ہالے سے نرالا

کھائے ہیں ترے داغ یہاں تک بت‌گلرو
از بسکہ شگفتہ مری تربت پہ ہے لالا

نت آہ و فغاں‌گریہ و زاری ہے مرےساتھ
رکھتا ہوں سدا ساتھ یہ اپنے میں وسالا

ارمان رہا اس کے ہی ملنے کا فراسو
اس نے نہ کہا ہائے کبھی اس کو بلالا

تو ''اتفاقاً چند قطرۂ اشک اس سوختہ آتش عشق کے دوش جانستاں پر پڑے،، جو ان پریوں کی سردار تھی - بس پھر کیا تھا جانستاں نے ماہرو کو درخت سے اتارا اور اسے دوش ہوا پر لے کر اپنے باغ میں پہنچ گئی - جانستاں نے ماہرو کو اپنے باغ میں چھپا دیا اور درپردہ اس سے عشق کرنے لگی - کچھ دیر کے بعد جانستاں کی ماں لعل پری پر یہ راز کھلا تو اس نے دونوں کو الگ الگ قید کردیا - چند دنوں کے بعد گیتی آرا پری لعل پری سے ملنے آئی تو اسے جانستاں کے قید ہونے کا حال معلوم ہوا - جب اس نے مزید تفحص کیا تو اسے معلوم ہوا کہ جانستاں جس مردم زاد پر فریفتہ ہے وہ وہی ماہرو ہے جس سے وہ ایک دفعہ پہلے بھی مذاق کر چکی ہے - گیتی آرا نے لعل پری کی منت سماجت کر کے جانستاں کو تو قید سے رہائی دلائی اور پھر جانستاں سے اجازت لے کر

ماھرو کو واپس وطن پہنچانے کے لئے اپنے دیووں کو تاکید کی - جب دیو ایک تخت پر ماھرو کو لے کر اڑ رہے تھے تو ان کا گزر 'فرحت افزا' باغ سے ھوا - شہزادہ نے اسی باغ میں آترنے کی خواھش ظاھر کی اور باغ میں آتر کر دیووں کو رخصت کر دیا - شہزادہ باغ میں آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی پلنگ پر سو رھی ھے - شہزادہ نے اسے جگایا تو معلوم ھوا کہ وہ شہزادی 'مہ جبیں' ھے جسے ایک دیو اڑا لایا ھے اور اس مکان میں لا کر اس نے اسے قید کر دیا ھے - ایک دوسرے کی کہانی سن کر دونوں وھاں سے نکل پڑے اور دیو کی نظروں سے بچتے بچاتے شہر کی طرف چل پڑے - کچھ دنوں کے بعد مہ جبین کے شہر پہنچ گئے جہاں ماھرو اسے روتا دھوتا چھوڑ کر ایک گھوڑے پر سوار ھو کر آگے بڑھ گیا - چلتے چلتے وہ ایک مرغزار میں پہنچا جہاں اس ملک کا ملک زادہ شکار کھیل رھا تھا - دونو کی ملاقات ھوئی اور کچھ دیر کے بعد دونو نے ایک ھرن کے تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے - اتفاق یہ کہ ھرن تو نظروں سے غائب ھوگیا لیکن دفعتاً ایک شیر نے ان پر حملہ کر دیا - دونوں نے شیر کو مارنے کی کوشش کی لیکن شیر نے پہلے ھی حملہ میں ملک زادہ کو تو مار دیا البتہ ماھرو نے اپنی تلوار سے شیر کو مار گرایا - لیکن ابھی وہ شیر کے کان کاٹ کر آگے بڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ملک زادہ کا لشکر اس کو تلاش کرتا ھوا وھاں آ پہنچا اور انھوں نے ماھرو کو اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ اس نے ملک زادہ کے زر و جواھر چھیننے کے لئے اسے قتل کر دیا ھے - ماھرو کو پابجولاں بادشاہ کے پاس پہنچایا گیا تو اس نے سارا قصہ سن کر شاھزادہ کو بری کر دیا اور رھنے کے

گئے ایک مکان دے دیا ۔ اس عرصہ میں اُس بادشاہ کی لڑکی ماہ‌طلعت نے کہیں ماہرو کو دیکھ لیا اور وہ اس پر دل و جان سے فدا ہوگئی ۔ اُمرا وزرا نے بادشاہ کے ایما پر ماہرو سے اصرار کیا کہ وہ ماہ طلعت سے شادی کر لے لیکن شہزادے نے صاف انکار کر دیا ۔

کچھ دنوں کے بعد شہزادہ شکار کھیلنے نکلا تو جنگل میں دل افروز سے ملاقات ہوگئی جو بحال تباہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ۔ شہزادے نے اُس سے اپنا قصہ بیان کرنے کو کہا تو اُس نے بتایا کہ میں تم سے جدا ہوکر جب پانی کی تلاش میں چلا تو مجھے پہلے روز تو کہیں پانی نہ ملا اور دوسرے دن مجھے گھومتے شام ہوگئی لیکن کچھ فاصلہ پر چند پرندوں کی آوازیں سنائی دیں ۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک تالاب کے گرد بہت سے پرندے جمع ہیں ۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور تمہارے لئے بھی پانی لے کر لوٹا لیکن تمہیں درخت کے نیچے نہ پا کر بہت مایوس ہوا اور تمہاری تلاش میں چل کھڑا ہوا ۔ چند دنوں کے بعد میں ایک باغ میں پہنچا اور وہاں سے صحرا کو ہولیا ۔ کچھ دیر کے بعد ایک مہیب آواز پیدا ہوئی ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شیر کی دھاڑ ہے ۔ ابھی میں اپنے حواس مجتمع ہی کر رہا تھا کہ شیر نے بڑھ کر مجھ پر حملہ کر دیا ۔ قریب ہی ایک کنواں تھا ۔ میں نے شیر سے بچنے کے لئے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی اور ایک پتھر پر گر اٹک گیا ۔ شیر کچھ دیر تو غراتا رہا پھر جنگل کی طرف چلا گیا ۔ اتنے میں ایک ایک اژدھا کنوئیں سے نکلا اور باہر کی طرف بڑھنے لگا ۔ میں اُس کی دم سے لپٹ گیا اور اُس کے سہارے کنوئیں سے باہر نکل

آیا - جونہی میں کنوئیں سے نکلا، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ایک چشمہ پر جا کر دم لیا - اتنے میں رات ہوگئی - احتیاطاً ایک درخت پر چڑھ گیا - آدھی رات کے قریب ایک افعی اس درخت کے نیچے آیا جو اپنے سامنے ایک مہرۂ تابناک رکھ کر کھیلنے لگا - میں درخت سے اترا اور تلوار کے ایک وار سے میں نے افعی کو پارہ پارہ کر دیا اور مہرہ اٹھا کر آگے چل پڑا - کچھ دور ایک باغ ملا اور اس باغ کے درمیان ایک مکان تھا - مکان میں داخل ہوا تو دیکھا ایک مسند جواہر نگار بچھی ہے - جس پر ایک دختر سیمبر بیٹھی ہے - سراپا سنئے:

بکھرائے پری بال دھواں نازو ادا گرم
چتون میں بھرا جادو نگہ اس سے بلا گرم

ابرو کی لچک سو خم شمشیر سے خوں ریز
پلکوں کی چمک ہے بت کافر کی سدا گرم

گالوں کی نزاکت پہ فدا کیجے گل سرخ
بالی کی چمک قہر ستم تس پہ جڑا گرم

وہ مانگ کہ سو راہ سے دل مانگ لے دم میں
لپٹا ہوا جوڑا وہ فتح پیچ کندھا گرم

وہ چین جبین چھین لے جی لعبت چین کا
رخسار مہ و مہر سے بھی نام خدا گرم

وہ ناک کہ غم ناک رکھے ایک جہاں کو
نتھنوں کا پھڑکنا ہے غضب سحر بھرا گرم

وہ لب کہ کریں آتش یاقوت کو شیدا
تابش سے گہر کی ہے وہ دانتوں کی صفا گرم

آودی سی وہ مسی کی دھڑی نام خدا زور
اور سرخی پان بستہ ہے کیا جلوہ نما گرم

وہ سلک گہر قہر وہ پھولوں کا ستم ہار
اورگردن مینا سے دو چنداں وہ گلا گرم

. . . .
. . . .

وہ ساق بلوریں وہ سونے کے کڑے، زور
وہ رنگ حنا گرم وہ ستھرے کف پا گرم

وہ کفش جھلا بور لگے جس پہ ستارے
اور تسپہ وہ اٹکھیلی سے چلنے کی ادا گرم[۱]

میں اس نازنین سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک جوہری کی لڑکی ہے اور یہ افعی جو میں نے ابھی مار گرایا تھا یہ دراصل ایک دیو تھا جو اسے اٹھا لایا تھا۔

راقم کے پاس جو نامکمل مخطوطہ ہے وہ یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

(مئی ۱۹۵۰ء)

---

۱ - عشق افزا ورق ۸۶ و ۸۷

ڈاکٹر محمد باقر

اردوئے قدیم

(سید یوسف علی خان یوسف کی ہندوی تصانیف)

استاد گرامی حافظ محمود خان صاحب شیرانی کا خیال تھا ''اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے،، اور اس خیال کی تائید میں آپ نے حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی سنہ ۹۰۲ھ (مطابق ۱۴۹۶ء) کے رسالہ ''خوش نغز،، کے کچھ اشعار نقل فرمائے ہیں جن میں زبان کو ''ہندی،، کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

یہ ہندی بولوں سب　　　اس ارتوں کے سبب (۱)

متحدہ ہندوستان اور پاکستان کی اس قومی زبان اور اس کے نام کا اولین ذکر محمد عوفی کی تاریخ ''لباب الالباب،، میں ملتا ہے جو ۱۲۲۸ء میں مرتب کی گئی تھی ۔ پنجاب کے ایک شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان کے کوایف حیات میں عوفی لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ حافظ محمود شیرانی : ''پنجاب میں اردو،، ص ۴۲، ۴۳ ۔

"او را سه دیوان است، یکی بتازی و یکی بپارسی و یکی به هندوی" (۱)

امیر خسرو نے بھی عوفی کی اطلاع کو دہراتے ہوئے اپنی تصنیف "غرة الکمال" کے دیباچہ میں مسعود سعد سلمان کے دواوین کے سلسلہ میں "ہندوی" کا لفظ استعمال کیا ہے:

"پیش ازین شاہان سخن کسی را سه دیوان نبود مگر مرا که خسرو ممالک کلامم۔ مسعود سعد سلمان را اگرچه هست اما آن سه دیوان در عبارت عربی و فارسی و هندوی است"۔ (۲)

عوفی سے تقریباً پانچ سو سال بعد تک بھی زبان کے لئے یہ نام استعمال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً سید محمد میر اثر اپنی مثنوی "خواب و خیال" کے اشعار گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں
باقی اشعار مثنوی سو ہیں(۳)

لیکن ان منتشر بیانات اور اطلاعات کے علاوہ ابھی تک اردو کی اس ابتدائی شکل یعنی ہندوی میں لکھی ہوئی بہت کم تصانیف منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ راقم کو اگلے دن اپنے ہمکار جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے کتاب خانہ سے اردو کا ایک مفید مخطوطہ ملا جو زبان کے اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب اس کو ہندوی بھی پکارا جاتا تھا۔ چونکہ زبان کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ

۲ - محمد عوفی: "لباب الالباب" جلد دوم، ص ۲۴۶ -
۲ - امیر خسرو: "کلیات" ورق ۳۲ الف -
۳ - سید محمد میر اثر: "مثنوی خواب و خیال" ص ۹ -

مخطوطہ بہت اہمیت رکھتا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ وہ تمام معلومات یہاں پیش کی جاتی ہیں جو اس مخطوطہ سے فراہم کی جا سکی ہیں۔

ہندوی کا یہ مخطوطہ(۱) سید یوسف علی خان یوسف کی آٹھ منظوم تصانیف پر مشتمل ہے۔ سید یوسف علی خان یا اُن کی تصانیف کے متعلق متداول تذکروں میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی اس لئے اُن کے متعلق جو معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں وہ اُن کی تصانیف سے حاصل کی گئی ہیں۔

مصنف :

سید یوسف علی خان ریواری کے رہنے والے تھے، جیسا کہ انھوں نے چند مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے :

سمت اٹھارہ سو برس سنتالیس کے انت(۲)
کہو ریواری نگر میں بوجھو سب گنونت

سوم بار اکھیں بندھے ریواری سیہ تھان(۳)
سنگرہ کیو گرنتھ کوں بوجھو سکھ سجان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ہندوی کے علاوہ فارسی کے بھی شاعر تھے کیونکہ ایک تصنیف میں جہاں اُنھوں نے فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے وہاں اپنے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ اُن کا اپنا شعر درج ہے :

---

۱ - ۱۰۵ اوراق، تقطیع ۸ انچ x ۵ انچ -
۲ - سید یوسف علی خان یوسف : ''گرنتھ سین چتکلا'' ورق ۶۵ -
۳ - سید یوسف علی خان یوسف : ''گرنتھ سبھابلاس'' ورق ۱۰۳ ب -

بلبل اگرچہ شیفتۂ نکہت گلست(۱)
گل ہم ہمیشہ گوش بر آواز بلبلست

یوسف کی ان تصنیفات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جلال‌الدین شاہ عالم ثانی کے دور حکومت یعنی ۱۱۷۳—۱۲۲۱ھ مطابق ۱۷۵۹—۱۸۰٦ء میں بقید حیات تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

گیارہ کم بارہ صدی بیتے ہوئے سال(۲)
۱۱۸۹ مت پلٹی پلٹی ہر کت پلٹو سب کو حال

اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے یوسف نے اپنی ایک تصنیف کا سال تصنیف ۱۸۴۷ بکرمی مقرر کیا ہے جو ۱۷۹۰ء کے مطابق ہے۔

زیر نظر مخطوطہ کا کاتب سید اشرف علی ہے۔ یہ بھی مختلف تصنیفات پر ۱۷۸۷ء تک مصنف کے زندہ ہونے کی نشان دھی کرتا ہے مثلاً ''گرنتھ نیہہ نواس'' کے اختتام پر درج ہے :

'' تمت تمام شد گرنتھ نیہہ نواس تصنیف سید یوسف علی خان صاحب مدظلہ و دام اقبالہ، بتاریخ ششم جمادی‌الاول بروز جمعہ بوقت نماز ظہر سن ھجری ۱۲۰۲ مطابق سن ۲۹ شاہ عالم بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ، بخط عاجز اشرف علی با تمام پزیرفت''۔(۳)

اور اس سے بعد میں نقل کی ہوئی ایک تصنیف کے متعلق درج ہے :

---

۱ - سید یوسف علی خان یوسف : ''گلشن ھند'' ورق ۸۴ ب۔
۲ - یوسف : ''لکت نواس'' ورق ۲ ب۔
۳ - یوسف : ''گرنتھ نیہہ نواس'' ورق ۴۲ ب۔

" تمت تمام شد گرنتھ سین چٹکلا تصنیف خان صاحب سید علی خان مغفور" ۔ (۱)

افسوس ہے اس اندراج کا سن حذف ہوگیا ہے ۔ ورنہ یوسف کی تاریخ وفات کے متعلق کچھ اندازہ ہو سکتا ۔

ان معلومات کے علاوہ یوسف کے کوایف حیات کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا ۔

مجموعہ تصانیف :

قیاس کہتا ہے کہ آٹھ مختصر تصانیف کا یہ مجموعہ یوسف کی ہندوی کلیات ہیں کیونکہ ایک حاشیہ میں مندرجہ ذیل عبارت اور اشعار درج ہیں :

تعداد گرنتھ مولوفہ

سبھا بلاس ۱ اور نیہہ نواس ۲
رس پرکاش ۳ اور یکٹ نواس ۴

نیہہ چٹکلا ۵ گلشن ہند ۶
نین چٹکلہ ۷ چوں اربند

بہیروں سین چٹکلا ۸ نبان (کذا)
جن دیکھا جہوں رس لیان

یوسف است سدھئی کہے
جو سمجھے بوجھے سکھ لہے (۲)

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ اشعار یوسف کے اپنے ہیں یا کاتب کے، بہر صورت ان اشعار میں جن آٹھ تصانیف کا ذکر ہے

۱ ۔ یوسف : "گرنتھ سین چٹکلا" ورق ۹۵ ۔
۲ ۔ یوسف : "گرنتھ سین چٹکلا" ورق ۹۵ ۔

وہی اس مجموعہ میں شامل ہیں اور انہی کی تفصیل ابھی پیش کی جائے گی۔

۱ ۔ بکٹ نواس :

اس مخطوطہ میں پہلی تصنیف ''بکٹ نواس،،(۱) ہے جس کا لفظی ترجمہ ''آستانۂ عالیہ،، ہے۔یہ تصنیف چند دوہوں اور کبتوں پر مشتمل ہے۔ جن میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد اور خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی نعت کہی گئی ہے۔ اور بعد میں حضرت شاہ عزیزاللہ رحمت اللہ، شاہ غلام علی اور حضرت غوث ہمدانی کی مدح میں چند کبت کہے گئے ہیں۔ غالباً نفس مضمون کی رعایت سے اس کا نام ''بکٹ نواس،، رکھا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز مندرجہ ذیل دوہروں سے ہوتا ہے :

*رب کریم سن لیجیو میری یہ فریاد
صدقے پاک رسول کے جن کی پاک اولاد
یا(۱) جگ میں پت(۲) راکھئی وا(۳) جگ میں نستار(۴)
دو جگ میں کرپا کرو تم کریم کرتار
دین(۵) دونن میں چاہئیں مومن پنجتن پاک
جو ان سر(۶) مور ہیں سو صاحب لولاک
یوسف بھی سیوک(۷) بھیو(۸) دھریو ہے تب نام
من ان(۹) اچھا ہوجے سبھی اور سرے(۱۰) سب کام

(۱) ورق ۱—۱۱۔
* ''بکت نواس'' ورق ۲، ۳ (۱) یہ ۔ اس (۲) عزت
(۳) وہ ۔ اس (۴) نجات دے (۵) دین و دنیا
(۶) سروشانہ (۷) سیوا کرنے والا (۸) ہوا
(۹) دل بے آرزو (۱۰) مکمل ہوجائے

گیارہ کم بارہ صدی بیتے ہوئے سال
مت(۱) پلٹی(۲) پلٹی پرکت(۳) بلٹو(۴) سبکو(۵) حال

یہی وسیلا جان کے استت(۶) کرے بنائے
علی شاہ مردان جو تمہیں ہو سہائے(۷)

ہوں سیوک دربار کوی(۸) کو(۹) ہوا مکت(۱۰) کی آس
سیوا کریں جو آس دھر کیوں کر ہوت اراس(۱۱)

استت شاہنشاہ کی مو(۱۲) سے کبھی نجائے
جیسیں نیر(۱۳) سمند(۱۴) کوا نجلی(۱۵) میں نہ سمائے

ناں ویسا کوئی ہوا ناں ایسا اب ہوے
علی ولی کو مرتبا جانت ہے سب کوے

میرو تو والی وہی علی شاہ مردان
واکے گھر کاموں سدا اور دھروں وہ دھیان

ان دوہوں کے بعد حضرت رسول کریم کی نعت کے چند کبت ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

دین(۱۶) کے ستون اور مالک ہیں دنا کے سرجے (۱۷) سب ایک پر نیارے نیارے نام ہیں۔

جن ہنکے بہت تین پر تیت(۱۸) دومو(۱۹) عالم میں ظالم جو آنکے وے لعنت کروھام(۲۰) ہیں

---

۱ - عقل ۲ - بدلی ۳ - تعلق ۴ - بدلا
۵ - سب کا ۶ - مدح ۷ - دوست
۸ - شاعر ۹ - شاعر ۱۰ - نجات
۱۱ - نا امید ۱۲ - منہ ۱۳ - پانی
۱۴ - سمندر ۱۵ - اوک
۱۶ - ”بکت نواس“ ورق ۳ ۱۷ - سردار - خداوند
۱۸ - شہرت ۱۹ - مجھے ۲۰ - ہم

ذات اور صفات ایسے قدر قیوم دیئے جن کی پر نام(۱) بولیں علیہ السلام ہیں ۔

سیوک جن سوچ کروسنکٹ(۲) میں دھیرو(۳) هریو تمرے سہائے(۴) وہی بارھوں امام ہیں

اس تصنیف کے آغاز میں اس کا نام نہیں دیا لیکن ان دوھوں اور کبتوں کے انجام میں یوسف نے اس مجموعۂ اشعار کا نام یوں درج کیا ہے :

یا(۵) ھی تیں اس گرنتھ کو کہی بکٹ نواس
جو پانچے(۶) ھت(۷) تم سوں تاہ مکٹ کی آس

اس کے ساتھ ھی یوسف نے ان تصانیف کی زبان یعنی ''ھندوی،، کے متعلق بھی ایک توضیحی شعر لکھا ہے :

بولی(۸) ھندوی فارسی عربی ہے سرمور(۹)
جو جانے سو کہے کہاں سے لاوے اور

یعنی ''ھندوی بولی کا سر اور شانہ تو عربی فارسی ہے ۔ اس نے وھی کچھ کہا ہے جو وہ جانتا ہے اس کے سوا اور زبان کہاں سے لاتا،، ۔

مدح حضرت غوث ھمدانی کا ایک کبت ملاحظہ ہو :

*غوث ھمدانی محبوب سبحانی تم ایسے ھی بنے ھو مقبول کرتار کے
جنھوں کو نام لئیں کام سریں عالم کو لاگے سیوک گن گاؤں آس سید سردار کے

---

۱ - سلام
۲ - مصیبت
۳ - صبر
۴ - مددگار
۵ - بکٹ نواس، ورق ۹ ب
۶ - پہنچے
۷ - ھاتھ
۸ - ''بکٹ نواس،، ورق ۹ ب
۹ - سروشانہ
* ''بکٹ نواس،، ورق ۱۰ ب

دین دونیں(۱) آسرو(۲) تہارو ہے موہے کون(۳) تمہیں تیں(۴) پاپ کٹیں سگرے، (۵) سنسار کے
سید محی‌الدین کہالوں ہوئے بڈھائی کروں تم تو سپوت پوت حیدر کرار کے

۲ ۔ نیہہ نواس :

اس مجموعہ کا دوسرا مخطوطہ ''نیہہ نواس،، (۶) ہے ۔ اس عنوان کے لفظی معنیٰ ''آستانۂ محبت،،(۷) ہے اور اس میں محبت کے متعلق کبت ہیں ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :

پریم آسکت نایکا کے بچن نایک کی سکھی سوں

ہم تو برھا نال تاپ تپیں اون کے نہیں روم پسیجت ہیں
ہم کو ٹک یاد کریں او پکار چھپے ایک نہ وے او پتیجت ہیں
ھٹی لاکھ رو کھائی دھریں ھرجو ہم نیہہ کے مینہ میں بھیجت ہیں
سدھ لیہو نہ لیہو کہا بس ہے ہم اپنی ریجھ پہ ریجھت ہیں

دلدادۂ محبت محبوبہ کا خطاب چاہنے والے کی سہیلی سے

ہم تو آتش فراق سے جل رہے ہیں اور وہاں کسی کو خبر لک نہیں ۔ وہ ہم کو کچھ یاد کریں تو ہماری مدد ہوجائے لیکن وہ تو کچھ بھی نہیں کرتے ۔ وہ ہم سے لاکھ روکھے پن سے پیش آئیں ہم تو محبت کی بارش میں بھیگ رہے ہیں ۔ تم ہماری خبر لو نہ لو ہم تو اپنی ریجھ پر نازاں ہیں ۔

---

۱ ۔ دین دنیا ۲ ۔ آسرا
۳ ۔ مجھے ۴ ۔ سے
۵ ۔ کل، سارا ۶ ۔ ورق ۱۲ ب ۔ ۲۳
۷ ۔ ''نیہہ نواس'' ورق ۱۶

۳ ۔ نیہہ چٹکلا :

اس مجموعہ کی تیسری تصنیف "نیہہ چٹکلا" (۱) یعنی محبت کے چٹکلے ہیں ۔ تصنیف کا نام یوں بیان کیا ہے :

یوسف تل برنن کیو بر نون ٹھانو نہہ تھانو
باہر تیں یا گرنتھ کو نیہہ چٹکلا نانو

نیہہ چٹکلا میں ۱۵۲ دوہرے ہیں جن میں تل یعنی خال کی تعریف کی گئی ہے :

(۲) سو پچاس دو دوہرے ایک ایک آپے سمان
سمت تہوتیہ روپ دوہ کا وہ نکاسے آن

ان دوہروں میں تل کو مختلف شاعرانہ زاویوں سے دیکھا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے ۔ نمونے ملاحظہ ہوں :

تل برنن

(۳) تیرے تل کے بس بھئے من موہن برج راج
نگر دوہائی پھرے ہے تل راجا کی آج

خال کی تعریف

(من موہ لینے والے (۴) برج کے راجا تیرے تل کے بس میں ہو گئے ۔ آج شہر میں تل راجا کی دھائی ہے)

جگ میں کوئی نہ سہ سکے تیرے تل کی چوٹ
اک چوٹ میں (۵) سیام جو بھے لوٹ اور پوٹ

۱ ۔ ورق ۲۶ ب ۔ ۳۲ ۲ ۔ نیہہ چٹکلا : ورق ۲۶ ب
۳ ۔ نیہہ چٹکلا : ورق ۳۰ ۴ ۔ متھرا اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ جہاں مہاراج کرشن کا بچپن گذرا ۔ برج راج انہی سے مراد ہے ۔
۵ ۔ سیاہ : مراد کرشن مہاراج سے ہے ۔

(دنیا میں تیرے تل کی چوٹ کوئی کیسے سہہ سکتا ہے جب کہ کرشن ایک ہی چوٹ میں لوٹ پوٹ ہوگئے ہیں)

قدرتی تل کے علاوہ مصنوعی تل کے متعلق بھی کچھ اشعار درج ہیں ۔ ایک دوھرا ملاحظہ ہو :

(۱)تیرے تل کی دھوم سن گھر گھر باڈھو چاؤ
بھیو ایک کو چوگنوں اب کا جرکو بھاؤ

(تیرے تل کی دھوم سن کر گھر گھر تل بنانے کا شوق بڑھ گیا ہے یہاں تک کہ کاجل کا بھاؤ اب چوگنا ہوگیا ہے کیونکہ اسی سے یہ تل بنائے جانے والے ہیں)

دولھے کے تل کی تعریف ملاحظہ فرمائیے :

۱ دولھے کی تل سوبھہ سن دیکھن آیو گانو
گھر میں تنک رھی نہیں تل دھرنے کی ٹھانو

(دولھے کے تل کی شہرت سن کر سارا گاؤں دیکھنے آگیا ہے اور وھاں یہ حالت ہے کہ گھر میں تل رکھنے کی جگہ نہیں)

اور ایک کیف آور تل کا ذکر سنئے :

۱ یہ تل ٹھوڈی کاڈ کو نپٹ کرے انیاے
پڑی کوئے میں بھانگ ہے جو دیکھے بورائے

(یہ لمبی تھوڑی والی کا تل بے حد ظلم کرتا ہے یہ تو کنویں میں بھنگ پڑی ہوئی ہے جو اس کو دیکھتا ہے چکرا جاتا ہے)

یہ تصنیف ۱۸۳۵ سمت مطابق ۱۷۷۸ء میں مکمل ہوئی اور ریواڑی میں ختم ہوئی ۔

۱ - ''نیہہ چٹکلا'' ورق ۲۰

۱ سمت اٹھارہ سو برس اور آئے پن تیس
یوسف تل برنن کیوتل ابھرن کو ایس

بہادوں سدے دوار سے مار برسب جان
کمہوریواری نگر میں پانچو سکھ سبحان

کاتب نے سن تصنیف سے آٹھ سال بعد اس کو نقل کیا ہے :

تیمت تمام شد گرنتھ نیہہ چٹکلا تصنیف خان صاحب سید یوسف علی خان مدظلہ‌العالی بخط عاجز اضعف‌العباد سید اشرف علی حیدری بتاریخ (۲)بست و پنجم شہر صفر یکشنبہ ۱۲۰۱ھ مطابق سن ۲۸ جلوس شاہ عالم بادشاہ

۴ ۔ گلشن ہند :

کلیات میں چوتھی تصنیف(۳) ''گلشن ہند'' شامل ہے ۔ اس تصنیف میں معروف فارسی شعرا کے اشعار کا ہندوی اشعار میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے ۔ فارسی کے اشعار کے انتخاب میں صوفیانہ کلام کو ترجیح دی گئی ہے ۔ شاعر نے اپنے کامیاب تجربے کی تفاصیل یوں بیان کی ہیں :

''از مدتی این عاصی ہیچمدان سید یوسف علی خان را ہوس اشعار فارسی و ہندوی در سر است ۔ در خیال آمد کہ شعر فارسی با شعر ہندوی کہ بھاکا [است] بر جائی مضامین باہم مطابق و موافق می آید یا نہ ، اگرچہ تفاوت در اصطلاحات فریقین ہم بسبب تفاوت زبانی و نیز موافق رسم استادان ہر دو فن بعد بسیار بنظر آمدہ بتلاش تمام چہار

۱ ۔ ''نیہہ چٹکلا'' ورق ۳۲
۲ ۔ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۷۸۶ء
۳ ۔ ورق ۳۴—۵۴ ۔

شعر اُستادان و چهار دوهره هو هو بهمرسیده، چنانچه نوشته می شود :

شعر خواجه حافظ :

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمده
باز گردد یا برآید چیست فرمان شما

دوهره اُستاد این است:

پیتم تمرے درس(۱) کوں ادهر(۲) رهوجیه(۳) آئے
اب کیا اگیا هوت هے گهٹ(۳) میں رهے که جائے

دوم شعر میان ناصر علی مرحوم :

هر که زما پیام برد دید بچشم ما رخش
حیرت چشم قاصد است عینک دوربین ما

دوهره اینست از(۵) ست سیا بهاری :

واهی کے جت چڑھ گئے(٦) مل مندیس وه بال
دوربین عینک کئے قاصد کے درک(۷) لال

سیوم خان زمان امانی :

---

۱ - دیکھنے ۲ - لب، هونٹ
۳ - جان ۳ - جسم

۵ - ڈاکٹر اعظم کریوی اپنی گراں‌قدر تصنیف 'هندی‌شاعری' میں رقمطراز هیں : عاشق مزاج بهاری قوم کے برهمن اور متھرا کے رهنے والے تھے - ان کی تاریخ پیدائش یا وفات کا پته نهیں چلا - بس اتنا معلوم هو سکا ہے که بهاری نے سنه ۱۶۶۳ء میں اپنی ایک 'ست سہی' ختم کی - جس کے صله میں مهاراج جے پور نے ان کو سات اشرفیاں انعام میں دی تھیں - یه بھی هندی کے 'نورتن' میں سے هیں - (ص ۷۹) -

٦ - پیغامبر ۷ - آنکھیں

به پای تا به سرش هر کجا که می نگرم
کرشمه دامن دل می کشد که جا این‌جاست

دوهره ست سیا بهاری :

جت دیکھوں(۱)تت ہی رہوں انک تسپار(۲)
نکھ سکھ (۳)لوں کبہوں سکھی سکی نه گنت تہار

چهارم شعر طاهر :

لطف و دشنام تو تسکین دل مدهوش است
آتشی از آب چه گرم و چه خنک خاموش است

دوهره کسی استاد :

رس کے رس کے روس کے تیری سبھی سہائے
تاتی سری نیرجوں ذارات (کذا) اگ بجھائے

بعد ازان در خاطر فاتر رسیده که شعر موزون نموده چند دوهره بموجب مضامین اشعار استادان باید گفت ۔ الحمدالله و المنة . . . . دو صد و پنج بیت استادان بهم رسانیده و موافق جمان بیت‌ها دوهره‌ها سر انجام یافت ۔ این عاصی از شعرای هر دو فن امیدوارست که اگر جائی سهوی نموده است بتوجه و اخلاق اصلاح فرمایند و انگشت را بر آن نگذارند ۔ و این رساله را ”به گلشن هند،، (۴)موسوم ساخته ۔

گلشن ہند کے اشعار کا مختصر سا انتخاب ملاحظہ فرمائیے :

امیر خسرو :

۱ - سر سے لے کر پاؤں تک
۲ - اسی طرف
۳ - اس سے بڑھ کر
۴ - ”گلشن ہند،، ورق ۴۳ -

اول ز کشتن من طبعی تو شاد باشد(۱)
آخر شوی پشیمان این حرف یاد باشد

پہلیں موہے مار کے اب تو کرو کلول
پھو پاچھیں پچتاؤگے یاد رہے یہ بول

میرزا اصغر :

بمیزان نظر حسن ترا با ماہ سنجیدم(۲)
میان این و آن فرق از زمیں تا آسمان دیدم

تیرومکھ تو لو سکھی ڈینٹھ(۳)چندے پاس
چند پلا ہلکو پرو اوٹھ چڈھ گیو اکاس

میرزا صاحب :

وقتی آن کس خوش که چون برق از گریبان وجود(۴)
سر برون آورد و بر وضع جہان خندید و رفت

سوئی سکھی سنسار میں دیکھ جگت بیوہار
بجلی جوں ہنس کے گیو پلک نہ لاگی بار

ابو طالب کلیم :

طبعی بہم رسان که بسازی بعالمی(۵)
یا ہمتی که از سر عالم توان گذشت

ساجن بن کے سیتل کر بھلے برے سون میل
کے جھوٹھے سنسار کون پاین ہیں تو بیل

نظیری نیشا پوری :

۱ - ''گلشن ہند'' ورق ۳۴ ب ۲ - ''گلشن ہند'' : ورق ۳۵ -
۳ - ترازو ۴ - ''گلشن ہند'' : ورق ۳۵ ب -
۵ - ''گلشن ہند'': ورق ۳۵ ب -

بروز حشر نظیری ز باز پرس مترس (۱)
تو بیکسی و غریبی ترا که می پرسد

یوسف برلی بھیٹ تیں ناحق من ڈرپات
تو سےویں آوین گے کو پوچھت ہے بات

رومی :

من با تو نمی گفتم کم کن دو سه پیمانه (۲)
من مستم و تو مستی اکنون که برد خانه

من توں سوں ناھیں کہیو سمجھ پیالہ دیہہ
ہم تم متوارے پیا کو پہنچاوے کیہہ

حافظ :

گناہ گرچه نبود اختیار ما حافظ(۳)
تو در طریق ادب کوش و گو گناه منست

جان بوجھ کو لیت ہے آپ دوس کو بھار
پی یوں چاھت بندگی دوس اپنے سر ڈار

یوسف علی خان :

بلبل اگرچه شیفتهٔ نکہت گلست (۴)
گل هم همیشه گوش بر آواز بلبلست

بلبل بوری پھول کی کہے رسیلے بین
گل بھی کان لگائے کے سنے ھیں سب دین رین

سرج الدین خان آرزو :

ای بی‌خبر بوقت سحر دیده بازی کن(۵)
خواهی پیاله پر کن و خواهی نماز کن

---

۱ - گلشن ہند : ورق ۳۸ ۲ - گلشن ہند ورق ۴۰ -
۳ - گلشن ہند : ورق ۴۵ ۴ - گلشن ہند ورق ۴۸ ب -
۵ - گلشن ہند : ورق ۵۰ -

اے بھورے نت بھور بھئی نیناں کھول تہار
کے تو کیجو بندگی کے تو تور خمار

شعر فارسی :

دل وا شود ز دست تو بی منت کلید(۱)
این قفل ابجدست بنام تو بسته اند

تیرے هاتھ میں من کھلے تالی کونے کام
ابجد کا تالا بناں بندھو تمھارے نام

۵ - نین چٹکلا :

اس مجموعہ کا پانچواں مخطوطہ ''نین چٹکلا''(۲) ہے۔ اس میں آنکھوں کی ایک سو ایک پہیلیاں ھیں اور یہ کتاب ۱۸۴۳ سمت (مطابق ۱۷۸۶ عیسوی) میں ریواری میں ختم ھوئی ہے۔

کہی پہیلی سو اور ایک(۳)
ایک بات اور جگت انیک

نین چٹکلا یا کو کہیں
جو بانچیں (۴) سمجھیں سکھ لہیں

سمت اٹھارہ سو برس آئے تین تالیس
کہو ریواری نگر میں سب کب دئیی اسیس

چند پہیلیاں ملاحظہ فرمائیے :

(ورق ۵۵ب)

ایسی پہیلی لاج کی بالا انکھوں دیکھت کریں چھنالا
بنا ڈٹھای نانہیں سوجھے جن سوجھے سو تل میں بوجھے

---

۱ - گلشن هند : ورق ۴۵
۲ - ورق ۵۵—۶۰
۳ - نین چٹکلا : ورق ۶۰ -
۴ - بانچنا : سمجھنا - جان لینا - پڑھنا

روپ متی اور روپ لبھانی رسیا بناں بھریں نت پانی
رسیا ہو تو من بندھ جائے کھول یہ بیٹھے کریں اوپائے

دو پوتری ایسی ہم دیکھیں ناچیں اور نچاویں ری
کبھی نہ کاویں سبھی رجھاویں سنین بھاو بتاویں ری
(ورق ۵۹ ب)

بدھ نان کرے سبھی من بھائے چند چکور اک ٹھور بنائے
تا پر پرکت ہی نت رہے دیکھ پہیلی یوسف کہے

٦ - سین چٹکلا :

سین چٹکلا(۱) میں ایک سو ایک پہیلی عینک کے متعلق کہی گئی ہے - یہ تصنیف ۱۸۴۷ سمت (مطابق ۱۷۹۰ عیسوی) میں مکمل کی گئی ہے -

سمت اٹھارہ سو برس سینتالیس کے انت(۲)
کہو ریواری نگر میں بوجھو سب گنونت

تصنیف کا آغاز ''منگلا چرن،، یعنی حمد سے ہوتا ہے - ملاحظہ فرمائیے :

دھن دھن یہ کرتار بڈائی جن ان نینن سین بنائی
اک سین میں ماری برہن اک سین(۳)میں سدھ بدھ ہریں
نین سین کو یہ پرتاپ جاہ ملیں لیں ہوئے ملاپ
سہنن کارن عینک ساجی بوڈھی بوڈھے ہوئے سب راجی
یا تیں نینن لاگی رہے یوسف بھید اور کیا کہے
کہوں پہیلی سو اور ایک نانو چٹکلا بھاو اپک

۱ - ورق ۶۰-۶۵
۲ - سین چٹکلا : ورق ۶۵
۳ - سین چٹکلا : ورق ۶۰

چند پہیلیاں سنیئے ۔
(ورق ۶۰ ب)

اک اوجل نرمل سی ناری   جو راکھے تاھی کی پیاری
اونرا کھے واہ کوں سوئے   جو اندھر کسے نکتا ھوئے

(ورق ۶۱)

دو نین پا چھیں دو نین آگے
آگیں کی سوئیں پا چھیں کی جاگے
ناک کا گہنا آنکھ کا لہناں
سوجھ جائے تو پھر کیا کہناں
اس ترق کا بھید نہ بوجھا
آنکھ لگی تب سب کچھ سوجھا
آنکھ لگائیں سب کچھ سوجھے
جس کوں سوجھے سو ھی بوجھے

(ورق ۶۳)

ایسی ناز سلکھنی آنکھوں کی اونہار
جاہ ملیں ھیں ھوتے ھے نینن کو او پکار

(ورق ۶۴)

دیکھے نہ دکھاوے   منہ مانگے دام پاوے

۷ ۔ رس پرکاش :

"رس پرکاش،، (۱) اس مجموعہ کا ساتواں مخطوطہ ھے ۔ اور سمت ۱۸۳۰ مطابق ۱۷۷۳ء میں مکمل ھوا ھے :

سمت اٹھارہ سو برس اور تیس کے انت (۲)
سنگرہ کیو گرنتھ میں جو ریجھیں گنونت

---

۱ ۔ ورق ۶۶—۷۳   ۲ ۔ رس پرکاش: ورق ۷۳

رس پرکاش مختلف دوہروں کا مجموعہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

نت ہیں پرکت درس کوں بسر گئے سکھ چین(۱)
پیتم تو مکھ چند کی میں چکورے نین

(میں تمھارے دیدار میں اس قدر مضطرب ہوں کہ میرا سکھ چین حرام ہو گیا ہے۔ اے محبوب تیرا چہرا چاند کی مانند ہے اور میری آنکھیں چکور کی طرح جو ہمیشہ اس کو دیکتی رہتی ہیں)۔

آچھ کٹا چھن سوں بھری او ہر بھری مسکیان(۲)
انگ انگ چھب سوں بھرے نین بھرے کلکان

[(اے محبوب تیری) آنکھ ہلاکت سے بھری ہے اور مسکراہٹ تکلیف سے۔ (تیرا) ہر عضو خوبصورتی سے بھرا ہوا ہے اور آنکھیں دلکش سیاہی سے]۔

پیتم(۳) آیو دور تیں ہیونت(۴)رت کے انت
بھولی بھولی بھرت ہے مالوں سدا بسنت

(اے محبوب تو سرما کے موسم میں دوڑ کر آ گیا ہے۔ اور سدا بسنت محبوبہ اب پھولی نہیں سماتی)۔

انگیا(۵) بھری گلال تیں کیو دیکھ من پھول
کیونکر او بھجو کنول مدھ گل لالا کو پھول

۱ - رس پرکاش: ورق ۶۵ ب ۲ - رس پرکاش: ورق ۶۹
۳ - رس پرکاش ورق ۷۰
۴ - ہیونت یا ہیمنت ہندوؤں کے سال کا پانچواں موسم ہے جو ربیع اور خریف کے درمیان یا ہندوانہ مہینہ پوس یعنی نومبر دسمبر میں ختم ہوتا ہے۔ موسم سرما کے دنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
۵ - رس پرکاش: ورق ۷۰

(تیری انگیا گلال سے بھری ہوئی ہے جس کو دیکھ کر میرا دل بےقابو ہوگیا ہے ۔ کنول کی شراب گل لالہ کے نشے سے کیسے مقابلہ کر سکتی ہے) ۔

پیتم(۱) کو مکھ چند ہے میرے نین چکور
اوڈ نسکین پر کت رھین پڑے پریم جھکور

(محبوب کا چہرہ چاند ہے اور میری آنکھیں چکور ۔ یہ اڑ نہیں سکتیں کیونکہ انہوں نے محبت کا صدمہ اٹھایا ہے) ۔

۸ ۔ سبھا بلاس :

''سبھا بلاس،، (۲) اس مجموعہ کا آخری اور سب سے طویل مخطوطہ ہے، جو سمت ۱۸۲۲ مطابق ۱۷۶۵ء میں نظم کیا گیا ہے ۔

سمت (۳) اٹھارہ سو برس اور بیتے بائیس
یوسف کیو گرنتھ یہ رسکن دے اسیس

اس مجموعۂ اشعار کا نام اور اس کی تعریف یوں لکھی ہے :

یوسف(۴) نانو گرنتھ کو راکھیو سبھا بلاس
جو بانچے چت چاہ سوں کرے پدھ پرکاس

بن سیکھیں رس کی کتھا کو اونجانے بھوگ
کٹے سانپ کی لیک کوں پیٹت ھیں سب لوگ

(یوسف نے اس کتاب کا نام سبھا بلاس یعنی ''عیش محفل،، رکھا ہے ۔ جو اس کو دلی محبت سے پڑھے گا وہ کھلے بندوں

---

۱ ۔ رس پرکاش : ورق ۷۰ ۔ ۲ ۔ ورق ۷۳ - ۱۰۵ ۔
۳ ۔ سبھابلاس : ورق ۱۰۴ ب ۴ ۔ سبھا بلاس : ورق ۷۳

لوگوں سے مقابلہ کر سکے گا۔ انجان آدمی رسیلی کہانی سے کیسے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ وہ تو سانپ کی لکیر ہی پیٹتے رہتے ہیں)۔

سبھا بلاس میں پہیلیاں اور کچھ دوہرے جمع کئے گئے ہیں۔ جوڑے کی پہیلی ملاحظہ ہو۔

(ورق ۷۳)

ناری ایک پہو نکم پکڑا بہت جتن وہ جوڑا جکڑا
تا پر بیٹھو پھن اوکسائے واہی ڈسے جو دیکھنے جائے

(عورت نے ایک سانپ پکڑا جس کو اس نے بصد مشکل باندھا۔ پھر وہ پھن پھیلا کر اسی پر بیٹھ گیا۔ اور جو اسے دیکھنے جاتا ہے اسے وہ ڈس لیتا ہے)۔

آنکھ کی ڈیٹھ برنن (نگاہ کی تعریف)

(ورق ۷۶)

بن سر اور بن پھال ہے بناں پرن کو تیر
جاہ لگے جانے وہی پیاری وا کی پیر

(نہ اس کا کوئی سر ہے نہ اس کی نوک ہے۔ یہ تیر بغیر پروں کے ہے۔ لیکن جس کو لگتا ہے کچھ وہی اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا درد کتنا میٹھا ہے)۔

کھڑاؤں برنن (کھڑاؤ کی تعریف)

(ورق ۸۰)

دو ناری میں ناہیں بھید ایک ایک میں دو دو چھید

ایک دوہرہ ملاحظہ ہو:

(ورق ۱۰۳ ب)

جو پاوے سوئی بڈہ بھاگن جن وہ چاہے سوہی سہاگن

(جسے محبوب مل جائے وہی خوش قسمت ہے۔ اور جسے محبوب چاہے وہی سہاگن ہے)

سید یوسف علی خان یوسف کی یہ ہندوی کلیات ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کلیات کو اردو کی کوئی انجمن شائع کرے۔ ڈاکٹر ابواللیث کا یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کا بیشتر حصہ شاعر کی زندگی میں ہی نقل کیا گیا ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کا اور کوئی نسخہ کہیں محفوظ نہیں اور اگر ہے تو منصۂ شہود پر نہیں آیا۔

اس مضمون کی تدوین میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱ - پنجاب میں اردو : از حافظ محمود شیرانی، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ء -

۲ - لباالالباب : از محمد عوفی، مطبوعہ لندن ۱۹۰۳ء -

۳ - کلیات امیر خسرو : از امیر خسرو، مخطوطہ مملوکہ انڈیا آفس لندن، شمار 51 E 1186 -

۴ - مثنوی خواب و خیال : از سید محمد میر اثر، مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۲۶ء -

۵ - کلیات : از سید یوسف علی خان یوسف، مخطوطہ مملوکہ ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی، پروفیسر، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور -

(فروری ۱۹۵۱ء)

ملک ابو یحییٰ امام خان نوشہروی

۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں

اردو کے طرحی رسالے

اس نوزائیدہ زبان (اردو) نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ترقی حاصل کی، کہ چشم فلک بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی! وہ لشکری بولی تھی جس نے لشکر ہی کی طرح ہر زبان کے الفاظ حاصل کئے اور رفتہ رفتہ مستقل بالذات بولی بن گئی ۔ اس کا گہوارہ پنجاب یا دکن کوئی بھی سہی مگر عام طور پر اسے دلی اور لکھنؤ کی بولی ہی سمجھا گیا ۔

اردو (لشکری بولی) عوام کے حلقوں اور دائروں کا محور بنی ۔ بادشاہوں کے محلوں میں دخل درآمد کے بعد اس قدر عروج حاصل ہوا کہ جس طرح مسکوک سکوں کی شناخت شاہی ضرب سے کی جاتی ہے ، اسی طرح اس زبان کے مشتبہ محاوروں میں شاہی محلوں کی سند حرف آخر قرار پائی ۔

وہ اپنے ان گہواروں سے نکلی تو بنگال کی وادیوں میں گھیلنے لگی ۔ آج بمبئی اس کے زیر نگین ہوا تو کل مدراس پر اس نے اپنا سکہ جما لیا ۔ اس کی فتوحات خود اس کے کمالات کا صدقہ تھیں ۔ مدراس سے بڑھ کر اس نے راس کماری تک کو اپنی سلطنت کا باجگذار بنالیا ۔

ادھر ''پنج آب،، میں اس کا بیڑا لنگر انداز ہوا۔ اور بچے بچے نے اس کے حضور خراج اطاعت پیش کیا۔ پھر وہ کچھ اور آگے بڑھی اور پشاور جیسی سنگلاخ سر زمین میں بھی اس کا جھنڈا نصب ہو گیا۔

اور ان تمام خطوں میں عنوانے بعنوانے اس کا ادب پھیلنا شروع ہوا۔ من جملہ دوسرے شعبوں کے طرحی رسالے بھی اس کے مقبوضات کے اکثر و بیشتر شہروں اور قریوں سے جاری ہوئے۔

مدراس سے ذلۂ عشاق (۱۸۸۳ء) کے نام سے ایک طرحی رسالہ نے جنم لیا۔ (ملاحظہ ہو فہرست رسائل طرحی (نمبر : ۹۰—۹۱ :) ۱۸۸۳ء ہی میں ''شمع انجمن،، بنگلور سے روشن ہوئی (نمبر : ۲۱ :) صوبہ برار کے ایک قریہ کہولا (بروزن مولا) پور ضلع امراوتی سے ۱۹۸۳ء میں رسالۂ ''فیروز نگار،، سے اس انگشتری کو زینت تابناک حاصل ہوئی (نمبر : ۸ :)۔ بمبئی سے ''گلدستۂ ناز،، (نمبر : ۱۵ :) ۱۸۸۳ء میں محو خرام نظر آنے لگا۔ ادھر ''کلبد جنت،، (قتیہ) لاہور کے حصہ میں آگئی (نمبر : ۱۷ :)۔ دلی، آگرہ، لکھنو اور ان کے ملحقات کا کیا ذکر، وہ تو طرحی رسالوں کا گلبن ہی تھے۔ صرف لکھنو سے نصف آخر انیسویں صدی میں، پندرہ طرحی رسالے جاری ہوئے (از نمبر: ۷۲ : تا نمبر : ۸۶ :) اور اس مقابلہ میں سب سے پہلے جو طرحی رسالہ جاری ہوا، وہ بھی اسی لکھنو سے نکلا (نام : دیوان گلدستہ: (نمبر : ۷۱ :)۔

اہل یقیں کو اس حقیقت پر بھی ایمان لانا ہی پڑا کہ شعر و شاعری کی بہترین تربیت طرحی رسالوں اور مشاعروں سے حاصل ہوتی رہی۔ آخر ایک زمین پر اساتذۂ فن اور نو آموز

شاگردوں کے "حسن البیان" کے گل بوٹے مشام روح میں کہاں تک بالیدگی پیدا نہ کریں گے ! دو تین طرحی رسالے پڑھے، طبیعت مچلنا شروع ہوئی ۔ خیالات میں تموج پیدا ہوا ۔ تصور میں مضامین کروٹیں لینے پر اتر آئے ۔ ان سب نے اتفاق و اتحاد کیا تو الفاظ نے انہیں مصرعۂ موزوں کا مقام بخشا ۔ ذرا اور توجہ کی اور دوسرا مصرعہ ہوگیا ۔ ہمت نے دستگیری فرمائی تو اس زمین میں چند اور شعر کہہ ڈالے ۔ اب ایسے دوستوں کی طرف رجوع ہوا جن سے داد ملنا آسان تھی ۔ انھی کے مشورے سے دو ایک لفظ ادھر سے اُدھر کر دئے ۔ آخر یہ صلاح قرار پائی کہ خدا کا نام لے کر ان میں سے پانچ شعر تو "پیام یار" میں بھیج ہی دیجیئے ۔ ان میں سے تین شعر اس میں چھپ کر آگئے ۔ اب دوسرے رسالہ کے مصرعۂ طرح پر زور لگایا ۔ اس مرتبہ پہلے سے زیادہ آسانی کے ساتھ کئی اور شعر ہوگئے ۔ جن میں سے (۵) "پیام یار" میں چھپ گئے ۔ دوستوں کے اصرار اور قاعدہ کے مطابق کسی صاحب فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی فکر ہوئی ۔ استاد کی توجہ سے یہ خاک اکسیر بننے کو ہے ۔ آج وہی صاحب مشہور مشاعرہ . . . میں اپنی غزل پڑھیں گے ۔ شمع ان کے سامنے رکھی گئی ۔ یہ "نو وارد بساط عشق" تو تھے ہی، ہر ایک کی نظر ان پر جم گئی ۔ صف اول کے بیٹھے والوں میں سے ایک دو ایک نے کسی نہ کسی مصرعہ پر سر ہلا دیا ۔ مگر ان کے حلقۂ احباب سے واہ! واہ! سبحان اللہ! مکرر! کی آوازوں نے ان کا دل اس طرح بڑھایا کہ انہیں آج سے خود پر اعتماد سا ہوگیا ۔ یہ غزل رسالہ "نامۂ یار" رتلام (نمبر : ۲۶ :) میں بھیجی تو نو کے نو شعر ہی چھپ گئے ۔ مشاعرہ میں داد مل چکی تھی، رسالہ

میں طبع ہونے سے دو گونہ تقویت حاصل ہوگئی ۔ اب تو باقاعدگی سے فکر کرنے لگے ۔ آخر انہی لوگوں میں سے ایک میر (میر تقی مرحوم) کے نام سے چمکا ۔ دوسرا انشاء (سید انشاء اللہ خاں) بن کر آشکارا ہوا ۔ تیسرے سودا کہلا کر شہرت دوام سے ممتاز ہوئے ۔ ایک نے غالب بن کر سب کے دلوں پر اپنا سکہ جما لیا ۔ جن میں سے ہر ایک کے کلام کا صحیفہ یوں بزبان حال نغمہ زن ہے کہ :

میرے حسن بیاں سے اک جہاں تصویر حیرت ہے
مرقع یار کا ہے جو غزل ہے میرے دیواں میں

طرحی رسالوں کا منبع بڑے شہر ہی نہ تھے ۔ معمولی قصبوں اور قریوں نے بھی ان کے اجرا کی سعادت حاصل کی ۔

۱ ۔ قصبۂ سید پور ضلع غازی پور سے ''گلدستہ شفق'' نمودار ہوا (پر نمبر : ۵۰ :)

۲ ۔ قصبۂ سہسوان ضلع بدایوں سے ''گلکدۂ بہار'' کا شگوفہ پھوٹا (پر نمبر ۱۳ :)

۳ ۔ قصبۂ شیو راج پور ضلع کان پور کے ''ریاض النبوی یا نالۂ زخمی'' (پر نمبر : ۶۲ :) نے عشق و محبت نبی صلی اللہ علیہ و سلم کا ہنگامہ برپا کیا ۔

۴ ۔ قصبۂ قائم گنج ضلع فرخ آباد کے گلدستۂ نعتیہ'' (پر نمبر : ۹۴ :) ہر حور و ملک نے صل علیٰ پڑھا ۔

۵ ۔ قصبۂ سیہور (بھرت پور) کے رسالۂ ''سحر آفرین'' (پر نمبر : ۲۴ :) نے اک جہان پر اپنا جادو کر دکھایا ۔

نعتیہ طرحی رسالے:

صرف نعت رسول مقبول صلوات اللہ علیہ و آلہ و سلم میں آٹھ طرحی رسالے جاری ہوئے۔

۱ - ریاض النبوی : (ار نمبر : ۴۲ :) ایڈیٹر مہاراج بہادر زخمی مرحوم! اللہ رے ولائے محمد کی ہمہ گیری! کہ مہاراج بہادر تک اسے نجات دارین کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

صبا نے وہ وہ سبق پڑھائے کہ یاد رکھیں گے جن کو غنچے
پڑھے گا ہر برگ اس کو فرفر یہ داستاں بر زباں رہے گی

۲ - گلزار خلد : از قنوج (ار نمبر : ٥٦ :) اس کی لوح پر یہ شعر کندہ ہے :

اچھا نہ ہو یا رب کبھی بیمار محمد
کم ہو نہ کبھی خواہش دیدار محمد

۳ - گلدستۂ نعتیہ : (ار نمبر : ٥۴ :)
۴ - وظایف خلد : (ار نمبر : ۹۲ :)
٥ - کلید جنت : (ار نمبر : ۷۱ :)
٦ - ریاض المصطفیٰ : (ار نمبر : ٦۴ :)
۷ - ولایت خلد : (ار نمبر : ۹۲ :)
۸ - بہار بے خزاں : (ار نمبر : ۹۳ :)

مرثیوں کا طرحی رسالہ :

اس دور (نصف آخر صدی انیسویں) کے رسائل میں ایک قسم مرثیوں کے طرحی رسالہ کی بھی نظر آتی ہے۔ اس (رسالہ) کا نام ”دارالسلام“ ہے اور آگرہ سے جاری ہوا (ار نمبر: ٦ :)۔

اس دور کا سب سے پہلا طرحی رسالہ (مقالۂ زیر تسوید میں) "دیوان گلدستہ" (بر نمبر : ٢٧ :) ہے - اور آج کے مضمون میں ایسے رسالوں کے (٩٥) نام ہیں جو طرحی تھے اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں جاری ہوئے - ترتیب اضلاع وار لکھی جاتی ہے -

نمبر	مقام اشاعت	رسالہ کا نام	مالک	مہتمم	مطبع	تاریخ اجرا	سال اجرا
١ -	اجمیر	نالۂ عشاق (١٢ ورق خورد)	سید نظیر حسین سخا	عبدالغفار ثنا	مطبع سیٹھ نظیر علی اجمیر	یکم نومبر	١٨٨٣ء
٢ -	اجمیر	داغ	مادھو پرشاد بھارگو	. . .	مطبع مادھو پرشاد اجمیر	یکم جنوری	١٨٨٨ء
٣ -	آرہ (محلہ پھاٹک سادات بلگرام)	صفیر[١] (٣ ورق خورد)	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	سید خورشید احمد	مطبع نور الابصار آرہ	. . .	١٨٨٣ء
٤ -	آگرہ (محلہ حکیماں)	گلدستۂ سخن	احمد خان صوفی	وزیر خان ایڈیٹر سید لیاقت علی	مطبع مفید عام آگرہ	١٥ اکتوبر	١٨٨٧ء

١ - رسالہ ضیاء الابصار

۵ - آگرہ (کٹڑہ حاجی حسن)	گلدستہ زینت سخن	مرزا اشتیاق احمد نظم		...	مطبع انیس ہند آگرہ	۱۵ ستمبر ۱۸۸۳ء
٦ - ،، ،، ،،	دارالسلام۲	،،	،،	مرزا عاشق حسین بزم	مطبع انیس ہند آگرہ	یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء
۷ - ،،	نسیم جنت	صادق علی تہمز		نثار علی	...	یکم مارچ ۱۸۸٦ء
۸ - امراؤتی (قصبہ کھولا پور: کھولا بروزن مولا)	فیروز نگار	...		ایڈیٹر منشی صادق علی قیصر	قیصر المطابع لکھنو	یکم نومبر ۱۸۸۵ء
۹ - ،، (،، ،،)	تہذیب سخن	کرشن لعل جوش		...	مطبع صادق المطابع آگرہ	مارچ ۱۸۸٦ء
۱۰ - اندور (چھاؤنی نواب صاحب)	نالۂ دلسوز	...		پنڈت جگ موہن ناتھ شوق	مطبع سرکاری اندور	۱۵ اگست ۱۸۸۵ء

۱ - مرثیوں کا رسالہ

۱۱ - بانس بریلی (قصبہ آنولہ)	چمن سخن (۸-ورق)	حکیم وارث علی	مولوی سید احمد شاہ	مطبع صبح بدایوں:	یکم جنوری ۱۸۸۵ء
۱۲ - ،، ،،	داغ دل (۸-ورق)	حکیم محمد ثمین	...	...	۱۵ جولائی ۱۸۸۷ء
۱۳ - بدایوں (متصل کچہری)	گلدستۂ بدایوں (۴-ورق)	سعیدالدین احمد	لتانند تحصیلدار	مطبع فیض بخش سرکاری پریس بدایوں	۱۵ جولائی ۱۸۸۷ء
۱۴ - سہسوان۔محلہ نیا گنج: (ضلع بدایوں)	گلکدۂ بہار	حافظ متین خاں متین	...	مطبع نسیم سحر بدایوں	یکم اپریل ۱۸۸۵ء
۱۵ - بلندشہر (مکان داروغہ رام رتن)	بہارستان شوخی	بابو گنگا سہائے	...	مطبع گرس گزٹ	۱۵ مئی ۱۸۸۵ء
۱۶ - بمبئی (عمر کھاڑی)	گلدستۂ ناز	بلقیس جہاں بیگم	امیر علی فاطمہ بیگم ایڈیٹر	...	۱۵ جون ۱۸۸۳ء
۱۷ - بمبئی (محلہ پربل روڈ متصل جمشیدجی اسپتال)	برق	نواب علی حسرت لکھنوی	مولوی ابوالحسن جوہر بریلوی	دت پرشاد پریس	یکم جولائی ۱۸۸۵ء

۱۸ - بنارس (محلہ سلیم پورہ)	گلدستۂ بنارس (۲-ورق اوسط)	...	حکیم الدین حسن و منشی فدا حسین	مطبع قمقام الحکمة بنارس	یکم جولائی ۱۸۸۲ء
۱۹ - ,, (محلہ مقیم گنج سقہ گھاٹ)	نالۂ عشاق (۱۰-ورق خورد)	شیخ ولی محمد رضی	ایڈیٹر محمد عمر کلیم	مطبع اکسیر اعظم بنارس	۱۵ اگست ۱۸۸۵ء
۲۰ - ,, (محلہ کتوا پورہ)	نغمۂ عنادل (۸-ورق خورد)	حکیم سید فدا حسین	... ...	جواہر اکسیر اعظم پریس بنارس	یکم اکتوبر ۱۸۸۶ء
۲۱ - بنگلور	شمع سخن (۸-ورق خورد)	مولانا عبدالحق تحقیق	غلام محمد شریف ادب	چام راج پریس بنگلور	۳۰ اپریل ۱۸۸۳ء
۲۲ - بنگلور	آفتاب سخن (۸-ورق)	محمد ابراہیم طپش	عبدالقادر راز	مطبع گلزار ہند پریس بنگلور	یکم جون ۱۸۸۵ء
۲۳ - قصبۂ بہار (محلۂ مصادپور) (صوبہ بہار)	گلدستۂ بہار (۲۳-ورق)	خیرات حسین رئیس و سید حاجی شاہ عطا حسین	شاہ محب حسین	...	۲۷ دسمبر ۱۸۸۳ء

۲۴ - بھرت پور (از قصبہ سیوہور)	سحر آفرین	حیدر حسن آفرین	...	مطبع گلشن عالم آگرہ		مئی	۱۸۸۶ء
۲۵ - پرتاب گڑھ (یو-پی)	ریاض رنگین (۸-ورق)	حکیم محمد ظاہر افسر کاکوروی	...	مطبع اسماعیلیہ الہ آباد	۱۵	مارچ	۱۸۸۵ء
۲۶ - پیلی بھت (از قصبہ رتلام)	نامۂ یار (۱۰-ورق)	فیاض خان	مشرف یار خان	مطبع رتن پرکاش پیلی بھت	۲	مئی	۱۸۸۳ء
۲۷ - ،، ،، (از قصبہ رتلام)	بہار سخن	بابو رام کشن جوش	سید قادر علی شوق	،، ،،	یکم	جنوری	۱۸۸۵ء
۲۸ - پٹنہ (محلہ صدر گلی مکان حاجی مولوی سید احمد حسن)	نالۂ عشاق (۱۰-ورق)	شیخ عابد حسین عابد	...	مطبع احسن المطابع پٹنہ	یکم	ستمبر	۱۸۸۵ء
۲۹ - ٹونک	نوبہار	غالب علی خان	...	محمدی پریس ٹونک	یکم	مئی	۱۸۸۵ء

۳۰ - جوالپور (محلہ خواجگی ٹولہ)	معنی	بشارت علی بشر	ایڈیٹر سید غلام حسین	مطبع اعظم المطابع جونپور	۲۸ فروری ۱۸۸۸ء

(ریاست حیدر آباد کے طرحی رسالے)

۳۱ - حیدرآباد دکن (محلہ مغلپورہ)	کلدستۂ عشاق	مشتاق احمد	...	...	اجرائے اشتہار ۱۵ جون ۱۸۸۳ء
۳۲ - حیدرآباد دکن (محلہ مغلپورہ)	مذاق سخن (۲۲ورق)	مشتاق احمد	...	مطبع علوم و فنون حیدرآباد	۱۵ ستمبر ۱۸۸۳ء
۳۳ - حیدرآباد دکن (ازسکندرآباد(رجمنٹ بازار محلہ عبدالرزاق)	گلزار سخن (۴۰ورق)	نورالدین	حاجی عبدالرحیم شرف	مطبع نور دکن	یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء

۳۴- حیدرآباد دکن (بالمقابل پرانی حویلی دفتر اخبار آصفی)	گل و بلبل (۱۶-ورق)	سیدالطاف حسین قابل	سیٹھ عباس مہجور	...	۱۱ دسمبر	۱۸۸۷ء
۳۵- حیدرآباد دکن (از اورنگ آباد)	مطلع سخن	...	بشیرالدین	...	...	۱۸۸۷ء
۳۶- خیرآباد (محلہ میانی سرائے موتی مسجد)	گلکدۂ ریاض	ریاض الدین احمد ریاض (یعنی حضرت ریاض)	ریاض الدین احمد ریاض	مطبع لمع رخشان	...	۱۸۷۹ء
۳۷- خیرآباد (محلہ میانی سرائے موتی مسجد)	کرشمۂ دلبر	منشی سید افتخار حسین مضطر	...	مطبع گلزار محمدی	۱۰ دسمبر	۱۸۸۳ء

(دہلی کے طرحی رسالے)

۳۸- دہلی	بزم سخن	...	...	...	اجرائے اشتہار جنوری	۱۸۸۷ء
۳۹- دہلی (محلہ پیپل مہادیو متصل قاضی حوض)	ریختہ	منشی مہا نرائن	...	مطبع مہاکاشی عرف چشمۂ فیض دہلی	اجرائے اشتہار یکم جنوری	۱۸۸۳ء

۳۰- دہلی (متصل کلاں محل چھتہ حکیم آغاجان)	مشاعرہ (۱۲-ورق)	...	مرزا یعسوب بیگ عامل دہلی	مطبع محبوب المطابع	یکم جنوری ۱۸۷۷ء
۳۱- دہلی ...	فیض سخن	...	...	...	۱۰ جون ۱۸۸۳ء
۳۲- ″ (نظام الدین بستی)	سلام (۸-ورق)	امیر سنگھ	...	...	۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء
۳۳- ″ (نظام الدین بستی)	گلدستۂ کلام	...	...	...	یکم اپریل ۱۸۸۶ء
۳۴- ″ (تراہا بیرم خان)	جادو (۶-ورق)	رکن الدین جادو	سید بدیع الزمان شیون	مجتبائی دہلی	یکم جنوری ۱۸۸۵ء
۳۵- رام پور (ریاست)	ریاض سخن (۱۸ ورق)	احمد علی خان شوق و اصغر علی خان اہل کار ریاست	...	نیر اعظم مرادآباد	۲۰ جنوری ۱۸۸۸ء
۳۶- ″ ″ (ریاست) (محلہ دربیہ)	فرخ (۱۸-ورق)	اسیر پرستی شیخ فضل احمد فرخ	حکیم محمد رضا	مطبع احمدی (رام پور)	یکم ستمبر ۱۸۸۵ء

۴۵- سارن (ضلع چھپرہ بہار)	گلدستۂ سارن	مولوی سید نورالحسن سب جج	...	...	...	۱۸۸۵ء
۴۸- شملہ	غنچۂ مراد (۸-ورق)	مالک و ایڈیٹر منشی عبدالقادر نائب	...	مطبع مطلع الانوار سہارنپور	۱۵ اپریل	۱۸۸۶ء
۴۹- علی گڑھ	شور عنادل	ایڈیٹر و مالک بابو بنواری لال وکیل	لالہ سکن لال	مطبع کائستھ ہرکاش علی گڑھ	...	۱۸۸۷ء
۵۰- غازی پور (سید پور)	گلکدۂ شفق (۸-ورق)	بابو شیو پرشاد	محمد یاسین شفق	مطبع صبح بنارس سید پور ضلع غازی پور	۲۸ فروری	۱۸۸۳ء
۵۱- فرخ آباد	آشوب محشر	یوسف علی خان ظریف و ظہیر	بابو ذوق رام	مطبع گلزار ہند فرخ آباد	یکم جون	۱۸۸۵ء

۵۲ - فتح گڑھ کمپ ضلع فرخ آباد (محلہ تلیا فرخ اعتصام الدولہ)	گلدستۂ شعرا (۴-ورق)	مرزا خان بہادر کلمہ حسین نادر		مطبع دلکشا فرخ آباد	...	۱۸۶۵ء
۵۳ - فتح گڑھ کمپ	افسون (۸ ورق پر)	...	جگدمبا پرشاد	گلزار ہند فرخ آباد	یکم مئی	۱۸۸۵ء
۵۴ - قائم گنج (ضلع فرخ آباد)	گلدستۂ نعتیہ (۴ ورق)	نصیر الزمان خان	...	...	یکم جنوری	۱۸۶۸ء
۵۵ - قنوج (محلہ صفدر گنج فرخ آباد)	پیام عاشق(۱) (۱۰ ورق)	بھکو خان رحیم	...	مطبع رحیمی قنوج	۱۳ اپریل	۱۸۸۴ء

۱ - نمونۂ کلام رسالہ ''پیام عاشق،، (مقتبس از رسالہ ''فتنۂ،، گورکھ پور (بر نمبر :۶۷:) بابت ماہ—۱۸۸۶ء) مصرع طرح ع جلوہ افروز ترا حسن خداداد رہے -

جناب مولوی منشی سید محمد طاہر علی صاحب طاہر سلمہ القادر فرخ آبادی

زاهدو اس لئے هم محو بتاں رهتے هیں — دیکھ کر حسن خداداد خدا یاد رہے
کیوں گرہ بند میں دی وعدۂ فردا کرکے — شرط بد لیجئے مجھ سے جو کبھی یاد رہے
دیکھ کر ان کو لب زخم صدا دیتے هیں — نیم جان چھوڑ گئے هو یہ ستم یاد رہے

(باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

۵۶ - ,, ,, گلزار خلد نعتیہ ,, ,, ,, ... مارچ ۱۸۸۵ء
(۹ ورق)

بقیہ صفحہ ۲۷۰)

طوق آہن ہے کہیں، طوق کلائی ہے کہیں ہم گرفتار سہی، آپ کب آزاد رہے

عمر بھر پہلوئے عاشق میں تو آفت ڈھائی
دو دن ان کی بھی بغل میں دل ناشاد رہے

جناب امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی استاد نواب صاحب رام پور

ابروئے یار نہ بھولے کبھی دل شاد رہے خوب مطلع ہے یہ اللہ کرے یاد رہے
آنکھیں مرجانے کو کہتی ہیں، وہ لب جینے کو کہیے وہ حکم رہے، کہیے یہ ارشاد رہے
بسملوں کی نگہ یاس اری ہوتی ہے اک ذرا دل کو سنبھالے ہوئے جلاد رہے
طول فرقت سے مزے وصل کے سب بھول گئے نہ وہ باتیں، نہ وہ راتیں نہ وہ دن یاد رہے
یہ کہوں گا یہ کہوں گا یہ ابھی کہتے ہو سامنے ان کے بھی جب حضرت دل یاد رہے
حشر میں عذر گنہ کیا ہے بتا تو رکھو! کہ مبادا تمہیں بھولے تو مجھے یاد رہے

ہجر میں یار نے نہ پوچھا نہ اجل نے ہم کو
نہ اوسے یاد رہے ہم نہ اسے یاد رہے

(بقیہ صفحہ ۲۷۲)

۵۷-	...	عطارد (۱۴ ورق) منشی بال کرشن	مولوی میر سید حسین (ایڈیٹر سالگرام انور لکھنوی)	،، ،،	۲۷ اکتوبر ۱۸۸۶ء
۵۸-	فتح پور ہسوہ (علاقہ چندپانہ)	آئینۂ سخن (۸۰ ورق)	صدیق احمد قادری	... ...	جون ۱۸۸۶ء

(بقیہ صفحہ ۲۷۱)

عالی جناب منشی سید فضل حسین خان شاعر تعلقہ دار جلال پور و آنریری مجسٹریٹ سندیلہ ضلع ہردوئی شاگرد جناب منشی ظہور الحسن صاحب ظہور لکھنوی

ہم تہی دست جو موقع پہ تجھے یاد رہے ساقیا خانۂ احسان تیرا آباد رہے
جو کہو گے وہ کرو گے یہ یقین ہے مجھ کو
ار یہ امید انہیں ہے کہ تمہیں یاد رہے

جناب سید محمد فرزند علی صاحب آبرو متوطن قنوج شاگرد جناب میر منصب علی صاحب ہنر سلمہ القادر سندیلوی

آج ار کچھ نہیں موقوف ہمیشہ کی ہے خو دن کے وعدے نہ کبھی شب کو تمہیں یاد رہے

۵۹ -	,,	سحر بابل (انجمن سحر بابل کا گلدستہ ۱۲-ورق)	نظام الدین شوق	سید واحد علی وحید	مطبع نسیم ہند	یکم ستمبر ۱۸۸۶ء
۶۰ -	فیض آباد (عرش منزل خورد محل)	بہارانجمن	نواب عباس مرزا خان محیط و نواب شجاع الدولہ	محمد حسین شمیم و ایڈیٹر عباس مرزا ہوش	مطبع قادری فیض آباد	۱۵ مئی ۱۸۸۲ء
۶۱ -	شیوراج پور (ضلع کانپور)	نالۂ زخمی یا اورنگ	مہاراج بہادر زخمی	...	...	۳۰ اپریل ۱۸۸۶ء
۶۲ -	,, ,,	ریاض النبوی یا فریادزخمی (نعتیہ)	,, ,, ,,	...	...	یکم جنوری ۱۸۸۷ء
۶۳ -	کان پور (محلہ تاڑی گودام)	تہذیب سخن (۸-ورق)	احمد علی احمد	...	مطبع عزیزی کانپور	یکم جنوری ۱۸۸۷ء
۶۴ -	,, ,,	ریاض المصطفیٰ (ضمیمۂ تہذیب سخن)	,, ,, ,,	...	,, ,,	نومبر ۱۸۸۷ء

۶۵ - کلکتہ (محلہ سینڈوریا گلدستۂ نتیجۂ مالک و ایڈیٹر حکیم عبدالصمد ریپن پریس یکم فروری ۱۸۸۲ء
پٹی رام پرشاد شاباز سخن ۱ (۲۳ورق) شیخ محمد وزیر کانپوری کلکتہ
لین کوٹھی نمبر ۶)

---

۱ - نمونہ کلام گلدستہ نتیجۂ سخن کلکتہ (ماخوذ از رسالہ فتنہ نمبر : ۶۷ : گورکھپور بابت ماہ ــــ ۱۸۸۶ء)

"عالی جناب معلی القاب مہاراجہ پدمانند سنگھ صاحب بہادر متخلص بہ افسر والی راج بیلی ضلع پورنیہ

خلعت بڑے گلوں کو جو فصل بہار میں
ہم نے جنوں کو دے دئے کپڑے اتار کے

بی سیرہ بہودن عرف میجو متخلصانہ بہ پری ساکن شہر کلکتہ

واقف ہے کوئی شہر خموشاں کے راز سے
کس نے طلسم توڑے ہیں لوح و مزار کے

حضرت فصیح الملک داغ دہلوی

گر مرے ہاتھ تری بزم کا ساماں ہوتا
میزباں میں کبھی ہوتا کبھی مہماں ہوتا

عشق تاثیر جو کرتا تو نہ پنہاں ہوتا
رنج میرا ترے چہرے سے نمایاں ہوتا

دین و دنیا کے مزے جب تھے کہ دو دل ہوتے
ایک میں کفر اگر ایک میں ایماں ہوتا

دل کو آسودہ جو دیکھا تو انہیں ضد آئی
اس سے بہتر تو یہی تھا کہ پریشاں ہوتا

خلد میں بند رہے عیش کے ساماں بیکار
لطف جب تھا کہ یہ مجموعہ پریشاں ہوتا

بے نیازی جو ہوئی میری تمنا سے ہوئی
مجھ کو ارماں جو نہ ہوتا تجھے ارماں ہوتا

(باقی صفحہ ۲۷۵ پر)

۶۶ - کلکتہ نیبوتلہ (بالک لخت جگر عبدالرحیم ابد قادریہ پریس ۱۰ اپریل ۱۸۸۵ء
رام سٹریٹ نمبر ۱۶) (۳ ورق) کلکتہ

۶۷ - گور کھپور فتنہ* (۱۷ ورق) ریاض خیر آبادی ریاض خیرآبادی مطبع ریاض ۸ جولائی ۱۸۸۲
(محلۂ نخاس) خورد بر سائز الاخبار
۴ ۱/۲ × ۲ ۳/۴ گور کھپور

(بقیہ صفحہ ۲۷۴)

حشر کے روز تجھے پاس عدالت ہوگا — بخشش دیتا جو یہیں جرم تو احساں ہوتا
اے فلک ہجر میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے — دامن ابر بھی میرا ہی گریباں ہوتا
کون مدت سے ہے عادت مجھے تنہائی کی — پاس فردوس کے منسان بیاباں ہوتا
ہو گئی بار دگر بندہ نوازی تیری — تو نہ کرتا اگر احسان تو احساں ہوتا

داغ کو ہم نے محبت میں بہت سمجھایا
وہ کہا مان نہ لیتا اگر انسان ہوتا

جناب منشی احمد علی شوق مالک اخبار آزاد
(مقالہ نگار یعنی شوق قدوائی شاعر ''عالم خیال،،)

صدقے کرتا کسی بت پہ اگر ایماں ہوتا — آج حسرت ہے کہ میں کاش مسلماں ہوتا

(باقی صفحہ ۲۷۶)

۶۸ - گورکھپور (محلہ خونی پورہ)	پیکر (۸-ورق)	عبداللطیف خان لکھنوی	خواجہ محی الدین	مطبع لطیف الاخبار گورکھپور	اجرائے اشتہار ماہ اپریل ۱۸۸۷ء
۶۹ - ,, (محلہ کوگھرپور)	بہار سخن (۸ - ورق)	محمد مبین جلیس مچھلی شہری	محمد طہ نشتر	مطبع انوری گورکھپور	۱۵ اگست ۱۸۸۷ء
۷۰ - ,,	گلدستۂ انجمن	...	ایڈیٹر مولوی سیف الحق دہلوی	...	یکم نومبر ۱۸۸۳ء
۷۱- لاہور (محلہ چہل بیبیان متصل حویلی حیدرشاہ)	کلید جنت : نعتیہ (۱۲-ورق)	سردار علی اختر	منشی گلزار بخش	مطبع گلزار محمدی لاہور	۱۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء

(بقیہ صفحہ ۲۷۵)

اس قدر دل سے ہیں بے چین کہ دیدیتے مفت — کوئی بھولے سے جو کم بخت کا خواہاں ہوتا
اے جنوں مجھ سے قسم لے کہ بہت مفلس ہوں — کیا کفن کے لئے رکھتا جو گریباں ہوتا
پیشتر غیر کے میں قتل ہوا خوب ہوا — دیکھتا کون کہ وہ سر بہ گریباں ہوتا

اے جنوں حشر کی گرمی نے قیامت کردی
سر پہ اس دھوپ میں رکھ لیتے جو داماں ہوتا،،

(لکھنؤ کے طرحی رسالے)

۷۲ - لکھنؤ (محلہ گولہ گنج)	۱ دیوان گلدستہ پندرہ روزہ: (۵-ورق)	مسٹر جیکب "صاحب"	لالہ گنگا پرشاد سررشتہ دار	مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ	یکم	جنوری	۱۸۶۰ء
۷۳ - " (محلہ امین آباد)	۲ گلدستۂ شعراء (۸-ورق خورد)	...	مولوی فتح محمد تائب	...		...	۱۸۷۲ء
۷۴ - " (محلہ نظیر آباد)	۳ ریاض الاشعار (۱۳ ورق)	...	...	مطبع انوار محمدی لکھنؤ		نومبر	۱۸۸۱ء
۷۵ - لکھنؤ (چوک بازار)	۴ پیام یار (۱۲-ورق)	...	نثار حسین نثار	قومی پریس لکھنؤ		...	۱۸۸۲ء
۷۶ - " (ڈیوڑھی آغا میر متصل چاہ چھاچھو)	۵ عشاق (۸-ورق)	سید تصور حسین خان	گنگا سہائے مصور	مطبع خزینۃ العلوم لکھنؤ	۲۳	مئی	۱۸۸۳ء
۷۷ - " (محلہ اشرف آباد مکان نمبر ۱۹۰)	۶ فیض سخن (۱۲-ورق)	مرزا عباس حسین ہوش	...	مطبع شیوخ اودھ لکھنؤ	۲۴	مئی	۱۸۸۳ء

۷۸	،، (محلہ محمودنگر)	۷ رعنا (۱۰-ورق)	سید عاشق حسین عاشق	محمد اسماعیل	مطبع افضل المطابع لکھنؤ	یکم اکتوبر ۱۸۸۳ء
۷۹	،، (محلہ زید اکبری دروازہ)	۸ مرقع نگار (۱۰-ورق)	خواجہ محمد وزیر	ایڈیٹر عاشق حسین عاشق سب ایڈیٹر محمد مرتضیٰ عاشق	مطبع گلزار محمدی لکھنؤ	۲۳ فروری ۱۸۸۴ء
۸۰	،، (محلہ چوک جدید)	۹ تحفۂ عشاق (۱۴-ورق)	مولوی معصوم علی محشر رئیس جگور	...	مطبع قیصر المطابع لکھنؤ	۱۰ مئی ۱۸۸۴ء
۸۱	،، (محلہ امین آباد)	۱۰ انتخاب (۸-ورق)	سخاوت علی موج	...	،،	یکم نومبر ۱۸۸۴ء
۸۲	لکھنؤ (کٹرہ ابوتراب خان)	۱۱ دامن گلچین (۸-ورق)	سرپرستی حضرت امیر مینائی مالک محمد احمد قمر	واجد علی بسمل	اردو پریس لکھنؤ	یکم فروری ۱۸۸۵ء
۸۳	،، (احاطۂ سورج سنگھ)	۱۲ محشر: ہفتہ وار: (۴-ورق)	ایڈیٹر عبد الباسط محشر	...	مطبع فیض محمدی لکھنؤ	یکم اپریل ۱۸۸۵ء

۸۴	،، (محلۂ رستم نگر)	۱۲	خنجر عشق (۱۲-ورق)	...	...	مطبع درگا پرشاد لکھنؤ	۲۰	مارچ	۱۸۸۵ء
۸۵	،، (نوبستہ)	۱۴	گلدستۂ سخن (۸-ورق)	لالہ پورن چند	لالہ رام سہائے تمنا	مطبع تمنائی لکھنؤ	۲۴	جولائی	۱۸۸۶ء
۸۶	،، (محلہ راجہ کی بازار)	۱۵	نغمۂ بہار (۲۱-ورق)	سید مہدی حسن عقیل	یعقوب علی خان نصرت	مطبع اردو لکھنؤ	۱۵	ستمبر	۱۸۸۶ء
۸۷	متھرا (قصبۂ چھاتہ)		خیال یار (۸-ورق)	معاون لالہ بانکے لال زار بدایونی	لالہ دیبی پرشاد	مطبع آفتاب عالمتاب لکھنؤ	یکم	اکتوبر	۱۸۸۵ء
۸۸	،،		تصویر سخن (۸-ورق)	وسیع اللہ شوخ	...	متھرا پریس شہر متھرا	یکم	جنوری	۱۸۸۶ء
۸۹	(باغ حسام الملک رائے پٹہ)		نالۂ عشاق (۷-ورق)	سید حسن رضا آتش ایڈیٹر محی الدین حسین خان تسنیم	...	مطبع حسینی مدراس	۱۵	فروری	۱۸۸۴ء

۹۰ - مدارس ... بہار ارم(۱) ... ... جنوری ۱۸۸۶ء

۱ - نمونۂ بہار ارم! منتخب از ''گلدستہ بہار ارم مدراس،، نمبر۲ جلد ۱ بابت ماہ مارچ ۱۸۸۶ء
مصرع طرح : ''اوس گل نے پی شراب تو میں بے خبر ہوا،،

ایمان - عالی جناب تجمل حسین خان بہادر داماد حضور پرنس آف ار کاٹ شاگرد حضرت جلال لکھنوی

رحمت سے تیری کون نہیں بہرہ ور ہوا — عاصی بھی آ گیا تو فرشتہ سیر ہوا
تو بھی کریم تیرا نبی بھی کریم ہے — یارب گناہ مجھ سے بھی جان کر ہوا
کچھ لطف ہے کہ تیری گلی میں جگہ ملے
یہ کیا کہ مر کے گلشن جنت میں گھر ہوا

امیر - عالی جناب حضرت منشی امیر احمد صاحب امیر لکھنوی اوستاد حضور والی رامپور مدظلہ العالی

ظاہر یہ اتحاد سے رنگ اثر ہوا — اوس گل نے پی شراب تو میں بے خبر ہوا
سرمے کی طرح چشم بتاں میں نہ گھر ہوا — میں مثل میل سرمہ عبث در بدر ہوا
فرصت ملی نہ گردش پست و بلند سے — سوئے کبھی جو پاؤں تو دوران سر ہوا
اللہ رے نزاکت جاناں! کہ شعر میں — مضمون بندھا کمر کا تو درد کمر ہوا
پیسا کسی کی آنکھ کی گردش نے اس قدر — میں خاک ہو کے ذرۂ گرد نظر ہوا
چلائیں بلبلیں جو چمن سے چلی بہار — نکلی دلہن جو گھر سے ہر اک نوحہ گر ہوا

(باقی صفحہ ۲۸۱ پر)

۹۱ - مدراس (مل کھیڑا محلہ ہائی روڈ)	حدیقۃالشعراء (انجمن حدیقۃ الشعراء مدراس کا گلدستہ ۶-ورق)	میرصادق حسین سیکرٹری انجمن شعرا	حکیم محمد حسین	مطبع اعجاز محمدی مدراس	جنوری ۱۸۸۶ء
۹۲ - میسور (لشکر محلہ)	ولایت خلد: نعتیہ (۱۲-ورق)	عبداللہ خوشحال بن سیٹھ احمد	ولی علی محمد خان بیدار	مطبع نبوی میسور	یکم جنوری ۱۸۸۵ء
۹۳ - ,, . . .	بہارے خزاں: نعتیہ انجمن کمالیہ کا رسالہ)	. . .	,,	,, ,,	اجرائے اشتہار ۱۵ جون ۱۸۸۳ء
۹۴ - مرادآباد (ازقصبہ سرسی)	آفتاب سخن (۱۳ ورق)	سید احمد حسن مہر	سید آل احمد بلیغ	سنبل پریس مرادآباد	۲۰ جنوری ۱۲۸۸ء

(بقیہ صفحہ ۲۸۰)

کیا جانے نامہ بر نے کہا آکے کیا امیر
ایسی خبر سنائی کہ میں بے خبر ہوا

جناب منشی میاں خانصاحب تلمیذ حضرت داغ دھلوی دام لطفہ

کی جب دعا تو باز اجابت کا در ہوا — شاید شریک دست دعا کا اثر ہوا
ہر چند کر رہے ہیں تجاہل فروشیاں — تیور یہ کہہ رہے ہیں اشارہ کدھر ہوا
پہچانتے ہیں شوخی نقش قدم سے ہم — راہ دل حزیں سے کسی کا گذر ہوا،،

(منقول از رسالہ ''فتنہ،، (بر نمبر ۶۷:) گورکھ پور مطبوعہ مطبع ریاض الاخبار گورکھ پور ماہ—۱۸۸۶ء)

۹۵ - میرٹھ (بیرون دروازہ   گلبن سخن   برکت علی انداز   چراغ الدین   مطبع شگوفہ   ۱۵ فروری ۱۸۸۵ء
باغپت)   (۱۵-ورق)   لائق   فیض میرٹھ

ان میں سے بعض (رسالے) اوائل صدی ہستم عیسوی یعنی ۱۹۰۰ء کے بعد میں بھی زندہ رہے ۔ جیسے ''پیام یار،، لکھنو (ہر نمبر :۵۷ :) ۔ بعض نئے رسالے بیسویں (۲۰) صدی کے آغاز میں جاری ہوئے ۔ مثلاً رسالہ '' اصلاح سخن،، (زیر ادارت مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی شاگرد حضرت داغ جنوری ۱۹۰۷ء میں لاہور سے جاری ہوا) اور نواب ناظم علیخان ہجر تلمیذ داغ، نے جنوری ۱۹۱۰ء میں ''زبان اردو،، شاہجہان پور (یو - پی) سے نکالا . . . . ان کے بعد اسی صدی ہستم کے طرحی رسالوں کا مقالہ نگار اور اس کے پڑھنے والے ایک ایسے وقفہ کے بعد آئیں گے جب محفل کے نغمہ سرا اور اراکین میں سے ایک ایک کسی اور دنیا کو آباد کرچکے ہونگے ۔ و کذالک الامر ۔

(فروری ۱۹۵۲ء)



سید مرتضیٰ حسین فاضل

سید مرتضیٰ حسین فاضل

غالب کی نادر کتابیں

بہت دنوں کی بات ہے جب غالب کا ایک پرانا اردو دیوان مطبوعہ نول کشور ۱۸۷۲ء ایک بزرگ سے خریدار تھا، جس میں مرزا غالب کا معرکۃالآرا سہرا نہ تھا اور اسی کے ساتھ ایک اور رسالہ تھا جس میں مرزا حاتم علی مہر کے لڑکے کی شادی میں موصول شدہ سہرے، تہنیت نامے وغیرہ درج تھے۔ اس کتاب کا پہلا ورق غائب تھا، خیال ہوا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس دیوان میں سہرا کیوں نہیں، پھر یہ کہ دوسری کتاب کا نام کیا ہے؟

چنانچہ غالبیات میں سے دو ایک کتابیں پڑھیں، دلچسپی بڑھتی گئی، کتابیں، مضامین مقالے، بڑے مشہور کتابیں پڑھنے کے بعد شوق ہوا کہ اس پڑھائی کا نتیجہ؟

جستجو بڑھی اور اس تلاش و تجسس میں کچھ نوادر ملتے گئے، لکھنو کے ذاتی کتب خانوں اور پرانے ذخیروں سے کام کی چیزیں ہاتھ آئیں ۔ ابھی امکانات کے وجود پذیر ہونے کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ لکھنو چھوڑنا پڑا ۔ ملی ہوئی چیزوں سے فی‌الحال کوئی کام نہیں لے رہا ہوں اور غالب پسند محققین زیادہ سے زیادہ دلچسپیوں کا اظہار کررہے ہیں، اس لئے ان چیزوں کا بالکل محفوظ رکھنا جرم سمجھ کر ان نوادر کا تعارف کرانا چاہتا ہوں ۔

مجھے یقین ہے کہ ان کتابوں سے سب سے پہلے میں با خبر ہوا، جس کی توثیق حاصل کرچکا ہوں ۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں ۔

(۱) رقعات بے نظیر مرزا نوشہ :۔ اس میں فارسی خطوط ہیں ۔ یہ معلوم ہے کہ پنج آہنگ پہلی مرتبہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوئی تھی، جو جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب کے پاس میں نے دیکھی تھی ۔

دوسری مرتبہ ۱۲۶۹ھ (اپریل ۱۸۵۳) میں شائع ہوئی جس کا ایک نسخہ جس پر ''فخرالدین سخن'' کی مہر ہے میرے پاس موجود ہے ۔

تیسری مرتبہ نول کشور پریس لکھنو سے ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) میں بڑے سائز پر کلیات کے ساتھ شائع ہوئی ۔ رقعات بے نظیر ان ایڈیشنوں کے علاوہ ہے، اس میں پنج آہنگ کے ۲۷ خطوط ''رقعات بنی پرشاد'' کے حاشیہ پر شائع ہوئے ہیں ۔ سرورق پر یہ عبارت ہے ۔

''رقعات بے نظیر۔مرزا نوشہ متخلص بغالب در حاشیہ بدارالسلطنت شاھجہان آباد در مطبع شمس‌المطابع باھتمام شہزادہ خان بمکان گوکل‌چند متصل حمام سیتھلی داس بمحلہ چوڑیکرن (کذا) طبع شد ۱۸۵۲ء''

آخری خط کا سرنامہ ہے۔

''نامۂ نامی بنام مصطفیٰ خان بہادر در صفت یکرنگی زبان یعنی پارسی بے آمیزش عربی'' پر ختم ہے۔ خاتمۂ متن کی عبارت یہ ہے۔

''بتاریخ بست وھفتم شوال ۱۲۶۸ ھجری‌النبوی''۔

یہ کتاب کتب خانہ ندوۃالعلماء لکھنو میں موجود ہے۔

(۲)نگارستان سخن، اس میں مرزا غالب کا اردو دیوان غزلیات ہے جو ترتیب اشاعت کے لحاظ سے چھٹا ایڈیشن ہے یعنی اب تک یہی معلوم تھا کہ مرزا کی زندگی میں ان کا دیوان چھ مرتبہ شائع ہوا لیکن یہ نسخہ ان کے علاوہ ہے جس کے بعد حسب ترتیب اشاعت ساتویں مرتبہ منشی شیو نرائن کے مطبع سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ نگارستان کے سرورق کی عبارت جس سے کتاب کا تعارف ہوتا یہ ہے۔

''ماشاءاللہ‌لاقوۃ الاباللہ۔بعون خالق ارض و سما قادر بے چون و چرا مجموعۂ انتخاب دواوین شعرائے غرا اعنی ذوق و غالب و مومن مسمی بہ۔نگارستان سخن۔حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب در مطبع مطبع‌العلوم سینٹ سٹیفن‌کالج دھلی۔باھتمام بندہ قاسم علی طبع شد''۔

دوسرے صفحہ سے انتخاب دواوین شروع ہے۔ اعلے چوڑی پیشانی پر نقش و نگار ہیں پھر تین کالم ہیں۔

ذوق
شوق نظارہ ہے جب سے اوس رخ پرنور کا ہی میرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا کر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پرشور کا لوں صریر خامہ سے میں کام بانگ صور کا ۵ شعر
لطف جاتا ہے
غالب
نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا کاو کاو سخت جانیہای تنہای نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا ۵ شعر
جراحت
مومن
نہ کیولکر مطلع دیوان ہو مطلع مہر وحدت کا کہ ہات آتا ہے روشن مصرع الگشت شہادت کا ۵ شعر
غضب ہے

میرا خیال ہے کہ یہ دیوان نظامی ایڈیشن کی نقل ہے اس لئے ایک تو یہ اس کے نظامی پریس میں جون ۱۸۶۲ء میں چھپا اور یہ ۲۳ اگست ۱۸۶۲ء میں پھر یہ کہ اس انتخاب میں وہی غلطیاں ہیں جو نظامی پریس کانپور کے نسخے میں تھیں بلکہ کچھ زیادہ۔ اس میں فردیات و غزلیات کے اشعار کی تعداد چودہ سو سات ہے اور نظامی پریس ایڈیشن میں ۹۳ شعر زیادہ ہیں، جس کی وجہ ممکن ہے کہ انتخاب ہو، لیکن زیادہ تر قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی ہے اس لئے کہ کہیں کہیں فقط ایک مصرعہ ہی نقل کیا گیا ہے، مثلاً صفحہ ۲۹ پر "دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا" لکھا ہے اور دوسرا مصرعہ "نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا" ندارد۔

نظامی ایڈیشن سے ایک فرق یہ بھی ہے کہ چار کے بجائے دو قصائد (مدح بہادر شاہ میں) ہیں اور سہرا ہے نظامی پریس والے نسخہ میں سہرا نہیں۔

غزلیات صفحہ ۱۶۲ پر ختم ہو کر ۱۶۳ سے ظفر، ذوق، و غالب کے سہرے ہیں جسے ۱۰۶ پر ختم کر کے مثلث میں یہ عبارت لکھی گئی ہے:

"الحمدللہ والمنۃ کہ بیمن تائید ایزد متاف انتخاب دیوان ہرسہ شعرائے جادو بیان، شہسواران عرصہ سخندانی، شہریاران شہرستان نکتہ رانی (کذا) کہ گوئی سبقت از قدما و متاخرین ربودہ و علم استادی در میدان فصاحت و بلاغت افراشتہ اند، اولا کلام معجز نظام خداوند سخن خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد حضور والا، ثانیا طوطی شکرستان معانی چراغ افروز

شبستانی زبان دانی، نجم الدولہ دبیرالملک میرزا اسداللہ خان غالب نظام جنگ بہادر ثالثا فلاطون زمان، سحبان دوران حکیم محمد مومن متخلص بہ مومن خان درین چند اوراق حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی بحسن اہتمام میرزا اموجان حلیہ انطباع پوشید، بتاریخ بست و ہفتم صفر ۱۲۷۹ ھجری تمام شد،، ۔ صفحہ ۱۶۵ سے مومن، غالب، اور ظہیر کے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ ظہیر کے قصیدے سے پہلے یہ عبارت ملتی ہے،، ۔ قصیدۂ سراپا تقصیر ظہیرالدین مولف تذکرۂ ھذا از تلمیزان (کذا) شیخ محمد ابراہیم ذوق، در مدح حضور لامع النور بہادر شاہ بادشاہ،، ۔

صفحہ ۱۷۶ کتاب کا آخری صفحہ ہے جس کے پہلے کالم میں مومن کا مخمس ختم ہوتا ہے، دوسرے میں مرزا غالب کا قطعہ ''آخری چہار شنبہ،، تیسرے میں ظہیر کا قطعہ، پھر یہ ہے:

''درخدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ سہ جز کتاب ھذا از جانب شروع در مطبع دیگر اولا طبع شدہ بود و بعد از سہ جزو ناتمام در مطبع بندہ طبع گردید، فقط بندہ امو جان مہتمم مطبع احمدی،،۔

خاتمہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ (جسے تذکرہ و انتخاب کے نام سے بھی یاد کیا ہے) کے مرتب ظہیرالدین ظہیر ذوق کے مشہور شاگرد ہیں (جو ''جلوہ طور،، کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں، - ۱۹۱۱ء) -

جس طرح یہ مجموعہ غالب کے سلسلے میں اہم ہے اسی طرح مومن و ذوق کے سلسلے میں بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ذوق کا پہلا دیوان بقول مولانا آزاد ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا یعنی ہمارے دیوان ہی کے سنہ اشاعت میں ۱۸۴۶ء (۱) میں لہذا یہ مجموعہ ان دونوں شاعروں کے دیوان یا انتخاب دیوان کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

(۳) ۔ ''انشائے اردو'' :۔ انجمن پنجاب میں انگریزوں نے جو پروگرام بنایا تھا، اس میں یہ بھی تھا کہ ''اردو'' میں تعلیم کے وسائل عام کئے جائیں، اور اس میں سادگی کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے۔ انجمن کے پرچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد (جو انجمن کے سکریٹری اور رسالہ انجمن کے مدیر تھے) اس اسکیم کو پھیلانے میں سب سے پیش پیش تھے۔ وہ طرز متقدمین و متجددین پر تقریریں کرتے، مقالے پڑھتے تھے، دوستوں کو خطوط کے ذریعہ اور زبانی طور پر اس سلسلے کے نشیب و فراز سمجھاتے تھے۔ انجمن کے بڑے بڑے انگریز، قواعد، نظم و نثر اور تراجم لکھواتے اس پر تنقیدیں کراتے، پھر منظور ہونے کے بعد شائع کراتے اور مصنفین کو انعام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں رسائل انجمن پنجاب و مولانا آزاد مرحوم کے ذخیرہ سے بہت مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ''انشائے اردو'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک درسی کتاب ہے جو علاوہ ٹائیٹل کے ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے :

---

۱ ۔ مومن کا دیوان بقول دتاسی ۱۸۴۶ء میں کریم الدین نے شائع کیا تھا (مکتوب قاضی عبدالودود صاحب)

''شروع ۶ مارچ ۱۸۷۲ء۔(گول دائرہ میں سرکاری نشان)۔
ختم ۱۶ مارچ ۱۸۷۲ء۔

انشائی اردو

۱۸۷۲ء

مطبع سرکاری لاہور میں چھاپا گیا۔تعداد جلد ۔۔۱۲۰''۔
اصل کتاب کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے :

''انشائے اردو۔(جو درجہ اعلیٰ کے امتحان کے واسطے مرتب ہوئی ہے) تمام ہوئی ۱۸۶۷ء''۔

اس میں خطوط و رقعات و بعض سپاسنامے وغیرہ ہیں جو خط شکست میں لکھے گئے ہیں ۔

انگریزوں میں مرزا غالب فارسی اور اردو کے مستند شاعر و ادیب کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔''نکات و رقعات'' ''اردو کی کتاب'' ''ابتداء زبان اردو'' اور بعض تقریریں انگریزوں ہی کے اشارے سے لکھیں۔ وہ ''دہلی سوسائیٹی'' کے ممبر بھی تھے اسی لئے اس مجموعہ میں ان کے گیارہ خطوط بھی ہیں ۔ چونکہ کتاب کی ترتیب ۱۸۶۸ء میں ہوئی ہے اس لئے یقیناً یہ خط خود مرزاصاحب نے بھیجے ہونگے ۔

اس خیال کو مزید تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''ڈاکٹر عبدالستار صاحب کے پاس ایک مجموعہ موجود ہے جس کے بارے میں موصوف اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ''انتخاب کا اصل قلمی نسخہ میرے پاس ہے'' ۔ یہ وہی قلمی نسخہ ہے جس کے مطابق ''غالب کے خطوط مرتبہ مہیش پرشاد صاحب میں ترمیم

و تنسیخ ہوئی ہے ۔ انشاء اردو کے تطابق سے مجھے کوئی اہم فرق نہیں نظر آیا، اگر ہے تو کاتب کی غلطی سے زیادہ نہیں ۔ البتہ لطائف و مقدمہ و تتمہ انشاء اردو سے خذف کردیا گیا ہے ۔ اس کتاب میں گیارہ خط ہیں، ان میں سے پہلا خط نہ تو کسی مجموعہ میں ہے، نہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے انتخاب میں۔ وہ خط یہ ہے :

جناب بابو صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت

نیاز مہر کیشانہ و دعائے درویشانہ قبول فرمائیں۔ ایک دن پہلے تفقد نامہ اور دوسرے دن نسخۂ اعجاز ہنگامہ پہنچا۔ نظر اس تقدیم و تاخیر پرخط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاط تازہ اور پھل سے لذت بے اندازہ پائی ۔ جام جم جہاں نما ہوگا مگر کیا جانئے کیا ہوگا بلکہ اسی میں تردد ہے کہ نہ ہوگا یا ہوگا۔ جام جہاں نما یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہور بہرہ‌یاب ہے۔ یہاں تو میں مدح میں قاصر رہا، یہ میں نے کیا کہا۔ جس طرح ہر دیدہور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے، نابینا بھی سن کر لطف پاسکتا ہے، فیض اس کتاب کا عام ہے، جام جہاں نما اس کا سچا نام ہے، اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گذاری اور اشاعت علم میں مدد کاری ذریعۂ عز و افتخار ہے، مگر فقیر میں تین عیب ہیں: ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار، آمد و رفت دوام میں قاصر رہے گا۔ یہ نہیں ہے کہ نہ جاؤں گا، مگر حسب الطلب یا حسب ضرورت کارگذار و فرمانبردار رہوں گا۔ بہر صورت تعجب ہے کہ صاحب اسسٹنٹ بہادر نے مجھے کیوں نہ کہا، بلا کیوں نہ لیا۔ یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام

کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے تو وہ بھوے بے تکلیف بلا لیں گے ۔

فقط عنایت کا طالب

غالب

اس خط پر نہ تاریخ ہے، نہ مرسل الیہ کا نام ہے، نہ جام‌جہان نما کا پتہ چلتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ خط غالباً مرزا نے دھلی سوسائیٹی کے ابتدائی جلسے میں دعوت نامہ نہ آنے کی شکایت میں ماسٹر پیارے لال کو لکھا تھا ۔ اس لحاظ اور متعلقہ مضمون سے یہ کہنا شاید آسان ہے کہ یہ خط ۶۵، سے ۶۷ کے درمیان لکھا گیا ہے، (بلکہ اس خط اور مرزا صاحب کے مضمون ''غدر دھلی،، کے مطالعہ سے ۶۵ء ھی صحیح معلوم ھوتا ہے) ۔

اس خط کے علاوہ دس خط مجروح کے نام ھیں، جس میں سے بعض اردوئے معلیٰ، عود ھندی میں چھپ چکے تھے، اگرچہ کچھ کمی زیادتی ہے، لیکن اب یہ سب خط خطوط غالب مرتبۂ مہیش پرشاد صاحب (م ۱۹۵۱ء) میں موجود ھیں ۔

(۴) ''مثنوی ترجمہ دعائے صباح،، کا پہلا ایڈیشن ۔ اگرچہ اب اس مثنوی میں کوئی خاص ندرت باقی نہیں رھی، کیونکہ ابھی دو تین سال میں پانچ چھ مرتبہ چھپ چکی ہے ۔

۱ ۔ اودھ اخبار پریس لکھنؤ

۲ ۔ مجمع العلوم لکھنؤ (بہت خوبصورت و جلی قلم سے مع ترجمہ نثر) ۔

۳ - نگار (عرشی صاحب نے مئی؟) میں قلمی نسخہ کے مطابق
شائع کرائی -

۴ - الواعظ پریس لکھنؤ ۹۳۰ (یہ دوسرے ایڈیشن کے مطابق
مع ترجمہ اردو بنام ''نور کا تڑکا،، شائع کرائی گئی) -

۵ - نظامی جنتری ۹۵۰ -

''نوائے ادب،، بمبئی میں پہلے کمیاب ایڈیشن کے سرورق
کی تصویر بھی شائع ہوچکی ہے -

ادہر ادہر کی چیزیں

۱ - تصویر قید خانہ غالب، مطبوعہ ''آثارالصنادید،، -

۲ - لارڈ الگن کی مدح میں مرزا غالب نے ایک قصیدہ کہا
جس کا مطلع یہ ہے :

بیا کہ مدح خداوند دادگر گویم
ازانچہ گفتم ازین پیش بیشتر گویم

یہ قصیدہ، مثنوی ابر گہربار، اور ''سبد چین،، میں چھپ
چکا ہے -

''اودہ اخبار،، ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء صفحہ ۸۶۱ پر اس عبارت
کے ساتھ شائع ہوا تھا -

مرزا صاحب نے ایک قصیدہ لارڈ ایلگن صاحب بہادر گورنر جنرل
کی خدمت میں گذشتہ سال بھیجا تھا اس کے جواب میں سکرتراعظم
کا دستخطی خریطہ آیا - یہ قصیدہ کلیات میں نہ تھا (اس لئے شائع
کیا جاتا ہے) -

نقل خط کرنیل ڈوریندی صاحب چیف سکرتر بہادر گورنمنٹ
در رسیدہ قصیدہ بر کاغذ افشان ۔

نقل سرنامہ ۔ در شہر دہلی خان صاحب بسیار مہربان دوستان
میرزا اسداللہ خان غالب سلمہاللہ تعالیٰ مرقوم ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء

نقل نامہ ۔ خان صاحب بسیار مہربان دوستان سلامت، قصیدہ
با آب و تاب در مدحت بندگان نواب مستطاب معلیٰ القاب وائسری
و گورنر بہادر دام اقبالہ وصول گردیدہ بر رخ ارادت آن مہربان
آبی و بر جبین عقیدت ایشان تابی افزود و از گران مایہ گوہرہائے
بحر فکر یکتا سخن معنی پرور کہ گنج برگنج نہادہ بود از نظر
قبولیت بندگان نواب صاحب ممدوح گذشتہ طرب پیرائے خاطر ہمایون
حضرت ایشان گشتہ ۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید فقط

دستخط انگریزی

اسی طرح مرزا کی غزل ”ہلہ من عاشق ذاتم تنانا ہا یا ہو،،
”ذخیرۂ بالگوبند،، ستمبر ۱۸۶۷ء میں شائع ہوچکی ہے، سبد چیں
میں گیارہ شعر ہیں مگر ذخیرۂ بالگوبند میں نو شعر چھپے تھے ۔

اس سے ہم مرزا کی دو چیزوں کی تاریخ کا اندازہ لگا سکتے
ہیں بلکہ قصیدہ کا سنہ معین ہوتا ہے ۔

بعض نوادر ۔ قاطع برہان، دستنبو طبع دوم، اردوئے معلیٰ
طبع اول، نکات و رقعات۔

(فروری ۱۹۵۲ء)



ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

قدیم گجراتی

ایک مطالعہ

تعارف

گریرسن کے جائزہ لسانیہ ہندیہ یعنی Linguistic Survey of India 1 کو پڑھتے وقت جب میں گجراتی کے باب پر پہنچا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اس فاضل مصنف نے گجراتی کے ماخذات اور قدیم کتب کا ذکر کرتے ہوئے صرف چند ہندو مصنفین کا ذکر کیا ہے اور گجراتی ادب کی ابتدا نرسنگھ مہتا کی شاعری سے کی ہے جو چودھویں صدی عیسوی کا ایک شاعر ہے۔ اس نے ان مسلمانوں کا بالکل ذکر نہیں کیا جنھوں نے گجراتی زبان اور ادب کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا۔ خاص طور پر ان صوفیا کا ذکر کرنا ضروری تھا جنھوں نے اس خطے کو روحانی فیوض و برکات کے ساتھ ساتھ لسانی اعتبار سے بھی مالا مال کیا۔

قدیم گجراتی کے جو نادر مخطوطے اس وقت میرے پیش نظر ہیں ان کے مصنف میاں شیخ خوب محمد چشتی ہیں، جو

1. Vol IX, Part II.

حضرت شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید اور احمد آباد کے باشندے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۳۲ھ میں ہوا ۔ "خوب تھے" تاریخ وفات ہے ۔ ۱۰۸۶ھ میں انھوں نے اپنے پیر مرشد کے اقوال خوب ترنگ کے نام سے نظم کئے ۔ پھر فارسی میں اس کی شرح "امواج خوبی" کے نام سے ۱۰۰۰ھ میں لکھی ۔ خوب ترنگ۔(۱) کے دو مخطوطے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں اور وہیں ایک نسخہ امواج خوبی کا بھی موجود ہے ۔ جس کا سنہ کتابت ۱۰۱۶ھ ہے ۔ خوب محمد کی دوسری نادر تصنیف چھند چھنداں ہے جو ہندی پنگل اور عروض پر اردوئے قدیم میں غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے ۔ کم از کم اب تک اس سے قدیم تر یا اس سے مقدم دوسری کتاب یا رسالہ اس موضوع پر دستیاب نہیں ہوا ہے ۔ بلکہ اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس قسم کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ۔ اس مختصر مضمون کا مقصد ان دو کتابوں کا تعارف کرانا ہے ۔ دونوں مخطوطے پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں ۔

خوب ترنگ

خوب ترنگ سائز ۱۱ انچ ضرب ۷ انچ ۔ تعداد اوراق ۱۳۹ - ۱۱ سطر ۔ خط روشن نستعلیق ۔ پہلے دو صفحے مطلا و مذہب۔ تاریخ تصنیف ۹۸۶ھ تاریخ کتابت دوشنبہ ۱۵ رمضان المبارک ۱۱۳۰ ہجری ۔

---

۱ - پروفیسر محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' اور ڈاکٹر محی الدین زور نے 'اردو شہ پارے' میں اس کا بہت مختصر ذکر کیا ہے لیکن زور نے اس کا نام خوش ترنگ بتایا ہے جو درست نہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اردو جلد ۹ ۱۹۲۹ء میں ایک مختصر مضمون لکھا ہے ۔ خوب ترنگ ایک مرتبہ شائع بھی ہوئی ہے ۔

میاں شیخ خوب محمد چشتی کی تصنیف در اصل اس عہد سے تعلق رکھتی ہے جسے عام طور پر اردوئے قدیم کا پہلا دور یا صوفیائے کرام کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ در اصل یہ زمانہ ہندوستان کی عوامی بولیوں اور جدید ہندوستانی زبانوں میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے بھی اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ ان عوامی مقامی بولیوں کو جو ہندوستان میں آریوں کی مقدس اور محفوظ سنسکرت کے زوال کے بعد آہستہ آہستہ مقامی عناصر اور سنسکرت کی آویزش سے ترکیب پا رہی تھیں ''پراکرت،، کے عام نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پراکرتوں کی تقسیم علاقائی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ مثلاً ماگدھی (مگدھ کے علاقہ کی پراکرت) اردھ ماگدھی (نصف ماگدھی) شورسینی (شورسین کے علاقہ کی پراکرت) وغیرہ۔ لیکن ان پراکرتوں کی ایک خاص عوامی شکل تھی جسے اپ بھرنش کہتے تھے اور اس کی بھی علاقائی صورتیں اور علاقائی نام تھے۔ در اصل یہی اپ بھرنش پراکرتیں جدید ہندوستانی زبانوں کی پیشرو ہیں۔ اور مسلمانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد ان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان کی بنا پر برعظیم کی موجودہ زبانیں اپنی اس شکل میں موجود ہیں۔

اس عبوری اپ بھرنش میں عربی، فارسی کی آمیزش سے جو نئی بولی تیار ہو رہی تھی، اس کے لئے پہلے ایک نام ہندوی یا ہندی تھا۔ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی ہر زبان ہندوی یا ہندی تھی۔ چنانچہ اپنی عربی اور فارسی سے ممتاز کرنے کے لئے انھوں نے اپنے اپنے علاقوں کی بولی کو ہندوی یا ہندی کے عام نام سے پکارنا شروع کیا۔ ان کے ذہن میں ہندوی یا ہندی کا تصور صرف ''لغت اہل ہند،، تھا۔ چنانچہ لغت کی جو کتابیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں ان میں یہی تشریح کی گئی ہے۔

مثلاً ادات الفضلاء (۸۱۲ھ) کے مؤلف قاضی خان بدر محمد لکھتے ہیں:

''پاخره . . . . . ہندوی اوتہ گویند۔ پاشنہ، با بای فارسی عقب پای، ہندوی ایڑی گویند''۔

اور اسی طرح مفتاح الفضلاء (۸۷۳ھ) کے مؤلف محمد دؤد لکھتے ہیں:

''انبر . . . کہ ہندوی آنرا سنداسی گویند'' . . . ''باد فر. . بہ ہندی آنرا لٹو نامند''، آفتاب پرست . . . بزبان ہندی کھرگھٹ''، دستورالصبیان (۹۹۰ھ) کا مؤلف لکھتا ہے:

تازی زبان و پارس نان ہندوی روٹی صدق دان

یہی وجہ ہے کہ پنجاب، دھلی، دکن اور گجرات میں اس عہد کی بولی کے جو قدیم نمونے ملتے ہیں ان سب کو ہندی اور ہندوی کہا گیا ہے۔ اگرچہ گجرات کی زبان کو گجراتی اور گوجری دکن کی زبان کو دکھنی اور برج کی زبان کو برجی، برج بھاشا اور برج بھاکا بھی کہا گیا ہے لیکن ان سب کے لئے ہندی کا عام نام بھی قدیم ترین تصانیف میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً میراں جی شمس العشاق (۱۴۹۶ء) اپنی دکنی کے بارہ میں لکھتے ہیں: ''یہ بولاں ہندی سب''۔ ان کے صاحبزادے شاہ برہان الدین (۱۵۸۲ء) فرماتے ہیں: ''عیب نہ راکھے ہندی بول''، اور اسی کو گوجری یعنی گجراتی بھی کہتے ہیں: ''جے ہوئے گیان بچاری نہ دیکھے بھاکا گوجری . . . یہ سب کیا گوجری زبان . . .'' ان علاقائی بولیوں میں معمولی سا اختلاف ہے جس کا احساس صرف ان ماہرین لسانیات کو ہی ہو سکتا ہے جو ان کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل و تجزیہ کریں، ورنہ بادی النظر میں یہ تمام بولیاں در اصل ایک بنیادی عوامی بولی کی مختلف شکلیں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے

آپس کے اختلاف کو ہم صرف مقامی اثرات کا نتیجہ بتا سکتے ہیں۔ کسی قدر یہ دعویٰ درست ہے کیونکہ آریوں کی آمد سے پہلے یہاں کی اصلی زبانوں کی جو حالت تھی اس کی کوئی یقینی اور دستاویزی شہادت موجود نہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ مختلف علاقوں میں اس کی کیا شکل تھی۔ آریوں کی آمد کے بعد ان بولیوں یا بولی میں سنسکرت کے بگڑے ہوئے الفاظ داخل ہوتے گئے اور اس طرح مقامی پراکرتوں نے اپنا اپنا رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آئیندہ چل کر ان پراکرتوں بالخصوص اپ بھرنش اور اس کی ترقی یافتہ موجودہ ہندوستانی بولیوں یا زبانوں کی ابتدائی شکلوں میں جو باہمی اشتراک پایا جاتا ہے، اگر وہ صرف چند الفاظ اور لغات تک محدود ہوتا تو شاید ہم ان الفاظ یا لغات کو مستعار یا دخیل الفاظ قرار دے سکتے، لیکن ان کا آپس کا تعلق اس سے زیادہ گہرا اور رشتہ قوی تر معلوم ہوتا ہے۔ دکھنی گجراتی اور پنجابی کی قدیم شکلوں میں صرف چند ہم معنی الفاظ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ساخت، قواعد اور اصول قواعد میں بھی بطور مشترکہ موجود ہیں۔ اس لئے بنیادی طور پر ان مختلف بولیوں کے باہمی ربط کا نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس اعتبار سے ان بولیوں میں سے کسی ایک کا نمونہ اس عہد کی بولیوں کی لسانی اور ادبی خصوصیات کا جائزہ لینے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

''خوب ترنگ'' کی زبان کو خود مصنف نے اس نظر سے دیکھا ہے اور ان ناموں سے یاد کیا ہے۔ پہلے صفحہ پر جو خالی ہے، صرف ایک یاد داشت تحریر ہے جس کا خط اصل کتاب سے مختلف ہے۔

''جلد کتاب خوب ترنگ تصنیف حضرت حقایق و معارف آگاہ ولی اللہ حضرت خوب محمد گجراتی در زبان بھاکھا در تصوف راست است''۔

بھاکا یا بھاشا کسی خاص زبان یا بولی کا نام نہیں ہے بلکہ مطلق زبان یا بولی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور عام طور پر مسلمان مصنفین اور تذکرہ نگاروں نے فارسی سے ممتاز کرنے کے لئے ہر ہندوستانی اور ہندی بولی کو بھاکا یا بھاشا ہی کہا جاتا ہے۔ بعض مصنفین نے البتہ برج بھاشا کو بھی صرف بھاشا کے نام سے یاد کیا ہے لیکن خوب ترنگ کی زبان ان معنوں میں بھاشا نہیں ہے کیونکہ برج کی خصوصیات اس میں بالکل مفقود ہیں۔ آگے چل کر خوب محمد نے خود اپنی زبان کو ''گجرات بولی'' کہا ہے :

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولیے بولی گجرات
(ورق ۳/ب)

اس ''بولی گجرات'' سے یقیناً اس عہد میں گجرات کی عوامی بولی مراد ہو گی اور غالباً وہ اس قابل نہ ہو گی کہ اس میں فلسفیانہ مضامین یا عارفانہ اسرار و رموز بیان کئے جا سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس میں عربی فارسی کی آمیزش کی گئی ہے :

جیوں میری بولی منہ بات عرب عجم میں ایک سنگھات
(ورق ۴/الف)

حاشیہ میں دوسرے مصرع کی تشریح اس طرح کی گئی ہے :

''یعنی زبان عرب و عجم یک جا کردہ این نسخہ نوشتہ شد''

یہ بات نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ ہندوستانی پراکرتوں نے اپنی موجودہ جدید ہندوستانی زبانوں کی صورت تک پہنچنے میں قدم قدم پر فارسی اور عربی کی آمیزش سے ترقی کی ہے۔ یہ اثر مرہٹی پر جس قدر نمایاں ہے، اس کی تفصیلات مولوی عبدالحق اپنے تحقیقی مقالے ''مرہٹی پر فارسی کے اثرات'' میں بیان کر چکے ہیں۔ گجراتی میں اس کا اندازہ خوب ترنگ کی زبان سے ہو سکتا ہے اور اس اعتبار سے خوب ترنگ گجراتی کی قدیم اور جدید شکل میں ایک عبوری دور کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

خوب ترنگ کا موضوع:

خوب ترنگ گجراتی نظم میں تصوف کے بعض نہایت اہم اور اکثر دقیق مسائل کا خلاصہ ہے۔ یہ دقت غالباً مصنف کو خود بھی محسوس ہوئی ہو گی ورنہ خود اپنی اس کتاب کی شرح لکھنے کی کیا حاجت پیش آ سکتی تھی۔ تصوف کے یہ مسائل در اصل ایک قسم کے ملفوظات ہیں۔ صوفیا کا قاعدہ تھا کہ اپنے پیرو مرشد سے جو کچھ سنتے تھے، دیگر طالبین کی ہدایت کے لئے جمع کر دیتے تھے۔ اس قسم کے ملفوظات فارسی اور اردوئے قدیم میں بکثرت موجود ہیں۔ خوب محمد کے پیر و مرشد حضرت شیخ کمال محمد سیستانی تھے اور اس نظم میں خوب محمد نے ان کے اقوال جمع کئے ہیں:

میں مرشد تھیں[۱] سنیا[۲] بیان وے[۳] مرشد صاحب عرفان

(ورق ۳/ب)

۱ - سے (دکھتی تین مین)۔

۲ - سنا۔

۳ - وہ۔

جنہو۱ منجے سکھلایا دین — جن تھین منجہ۲ دل ھوا یقین
جیلانی بسطامی شاہ — بغدادی جس چتر کلاہ
ہر ماضی ہر حجت لیک — ھون معتقد ھوا ان دیکھ
وارث محمدی ہر ٹھانوں۳ — شیخ کمال محمد نانوں۴
(ورق ۴/الف)

کیا عروج مقام اقدم — اللھم اغفر و ارحم
کہ تاریخ تہنوں۵ کی خوب — جن عددون ذاکر محبوب۶
اون کوں۷ تھا یہ علم کمال — خذ العلم افواہ الرجال
اون تھیں میں سنیا دن رات — اوس منہ۸ یاد رھی کچھ بات
وہ جیوں۹ مجھ کو آئی ترنگ — جمع کئے لے تس۱۰ تس ڈھنگ

کتاب کا نام اس مناسبت سے خوب ترنگ تجویز ھوا ہے۔

خوب ترنگ اس دیا خطاب — مدح رسول اللہ بات۱۱
(ورق ۴/الف)

۱ - جنہوں نے۔
۲ - میرا۔
۳ - جگہ (ٹھور ۔ ٹھار)۔
۴ - نام۔
۵ - ان کی۔
۶ - ذاکر محبوب ان کی تاریخ وفات ہے۔
۷ - کو۔
۸ - جب میں۔
۹ - جب
۱۰ - اس۔
۱۱ - اصل نسخہ میں بات ہے لیکن قافیہ کا تقاضا ہے کہ باب ھونا چاھئے، جو صحیح معلوم ھوتا ہے۔

یا اللہ اے مدح رسول — اوسے دوستی کر قبول
خداج، حافظ ہے ہر ٹھانہ — کرے نگہبانی اس منہ

عذر خواہی کے عنوان سے مصنف نے اس تصنیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو مضامین عرش و زمین مین نہیں سما سکتے وہ شعر میں کیونکر بند ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے شاعری نہیں کی ہے بلکہ جو دل کی بات تھی اور جو مرشد سے سنا تھا صرف اس کو ادا کر دیا ہے۔

جیون میری بولی منہ بات — عرب عجم مل ایک سنگھات
(ورق ۴/الف)

تیون ہین کہونگا کریں نکوڑ — آیا بول کیا نہیں چھوڑ
(ورق ۴/ب)

اینہان شعر کا قصدنہ لیکھ — اینہان مراتب کہون سو دیکھ
ارض سما منہ جیے نہ سمائیے — وزن شعر منہ ویے کیون آئے
دوڑیا ہون نظروں کے شان — دیکھ مراتب سون آسمان
کل مراتب جز منہ لیاؤن — کر نسخہ تصنیف دکھاؤن
نعت میں کرتا ہون سیر — یا اللہ تمم با الخیر
غلط نہ پکڑین اہون جان — درس کہون وے تون من آن
جو کچھ خطا اس منہ تون پائے — ایسے سہی کر خدائے
پن اتنان کہون کوڈ بجھائیے — ان سمجھے بول بھرائے

۸۔ اصل کتابت میں ”جداج“ ہے یہ آخری ”ج“ غالباً ”ج“ تاکیدی ہے جس کا استعمال قدیم دکھنی میں بڑی بکثرت موجود ہے۔

اس تمہید کے بعد خود مصنف نے تاریخ تصنیف کہی ہے۔

نسخے کی تاریخ اس ٹھانہ   پانچ عدد ہر مصرعے مانہ
(ورق ۴/ب)

خوب محمد کہے بچار   چودہ گھاٹ اوس برس ہزار
دوجا چاند سو تھا شعبان   دیس دوشنبہ کیا بیان

تاریخ کے بعد مصنف فوراً اصل کتاب کے موضوع کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

خدا سو جانیا کہیے کب   بوجھیا جانے محمد جب
عرف نفسہ ذات سو کس   ناںون محمد کہیے جس
ہے عرفان اس پر موقوف   عرف ربہ جیون معروف
پانچ مراتب خوبیں جان   تو سمجھے کا یقین سو آن
انہوں مراتب کر عرفان   آن یقین و اس ایمان
بوجھے جیہیں رسول تمام   تب ہو وجہ پورا سلام
مقصد میں کیون مطلق ذات   پچھیں اس کے تنزلات
تب تک من منہ را کہیں یاد   جب تک اہنین پائیں مراد

اس کے بعد اصل کتاب اس عنوان سے شروع ہوتی ہے۔

"آغاز کتاب خوب ترنگ بعضے مقالات شیخ کمال محمد رحمۃاللہ در معارف محمدیہ علیہ السلام"۔

ہے موجود سو کتیں شان   پہلوں اس کا کر عرفان
اک موجود وجودج ہوئے   کس کی جھٹ ہر جھٹا نہ سوئے

وہ آپین ذاتیج جہاج ذات نہ وہ جھٹ مان محتاج
(ورق ۵/ب)

پھر ''موجود'' کی مختلف ''شانیں'' بیان کی ہیں :

(۱) موجود وجود - (۲) موجود ذہنیں یعنی صفات -
(۳) موجود اضافی یعنی اسم -

ان عنوانات کی تشریح ۱۶۷ اشعار (۵/ب تا ۸/ب) میں کی گئی ہے - بعض اشعار یہ ہیں :

ہب دوجا موجود پچھان وے موجود سو ذہنیں جان
(ورق ۵/ب)

دھریا اس کا ناٹون صفات ہاتھ لاؤ تب پائے ذات
سمع بصر نہ لاگے ہاتھ ذہنی ہے لازم جھٹ ساتھ
ہب موجود جو تیجھے شان کروں بیان سنیں دھر کان
وے موجود اضافی پائے اسما ان کا ناٹون کہائے
. . . .
جیون آرسی دیکھیں جائے تب آپس نظر کہلائے
(ورق ۶/ب)

جیون سورج کا دیکھ اوجال کہے اندھارا چھانہ اتال
ہور آپس کون پاوے جد جھٹ نظر منظور سو تد
. . . .
ہب موجود وجود پچھان تیو نہیں عدم معدوم سو جان
(ورق ۷/الف)

پن جب دیکھے جاوے جھانہ عین اجالا ہے تس ٹھانہ
رات دووے بھادو کی جب دیکھ انکھیاں میچ سو تب
(ورق ۷/ب)

تب بھی دیکھنا جائے اندھار کہو اجالا تیتے بار
(ورق ۸/الف)

. . . .
صفت جان پر قائم جان صفت سو معقول پچھان
(ورق ۸/ب)
ہے نہیں جیون باہر گھر مانہ ذاتج عین اضافت تانہ

اس عنوان کے بعد دوسرا عنوان مرتبہ لاتعین کے بیان میں صرف ہوا ہے۔

''مرتبہ لاتعین کہ غیب ہویت ذات مطلق است نمودن را خود'' ۔

اقرأ کتابک اس بھانت آؤ کفا بنفسک معنی پاؤ
تو آپن پڑھ آئے کتاب کہو سو سمجھیں ھرھر باب
جھٹ کچھ ہے بن کے گھات جگ تھین ھون الگا جس مات
. . . .
ذات ھو غیب ھویت نانون صفت نہ اسرے کو تس ٹھانون
صفت ذات پر قائم ھوے صفت ذات بن پاے نکوئی

اس عنوان کے سلسلہ میں ایک ''جھولنہ'' بھی ہے۔ جھولنہ نظم کی ایک قسم ہے جو ھندوستانی زبانوں میں مختلف ناموں اور شکلوں میں موجود ہے۔ اس میں چار مصرعے ھوتے ھیں لیکن انداز

رباعی اور مربع سے مختلف ہوتا ہے۔ یعنی نہ تو رباعی کی طرح پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے اور نہ مربع کی طرح چار مصرعوں میں ردیف قافیہ کی پابندی ہوتی ہے بلکہ پہلا اور دوسرا اور پھر تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ وزن چاروں مصرعوں کا ایک ہوتا ہے اور یہ وزن رباعی کے اوزان سے باہر ہے۔ پہلا جھولنہ یہ ہے۔

ہے گھونگھٹیے مکھ منہ چھپ جنہ جان پنین کون بھی لاکھ نہیں
ھوں سمجھے کون کہیا بن سجین نہیں ہے پہنین ہے کون بھی ماکہ نہیں
جیوں دیکھے ھیں سبھی دیکھیں تھیں سکی دیکھنیں کون کھون دیکھ کرے
ایسا بھید کچھو کوجٹ رہے کھولے گھونگھٹا سو کہوں خوب بڑے

بعض عنوانات حسب ذیل ہیں :

حضرت وحدت (ورق ۱۰/ب و ۱۱/الف ۱۲ شعر) قوس احدیت (۱۱/الف تا ۱۲/الف ۱۸ شعر) سوال و جواب تنبیہ (۱۲/الف ـ ب ۱۱ شعر) قوس واحدیت (۱۲/ب و ۱۳/الف ۱۵ شعر) تمثیل (۱۳/الف و ۱۴/الف ۲۲ شعر) حضرت الہیت (۱۴/ب تا ۱۷/الف ۵۱ اشعار) جھولنہ (۱۶/ب ۲ شعر) قوس ظاہر وجود (۱۷/الف ۱۸ اشعار) قوس ظاہر وجود (۱۷/ب ۱۷ اشعار) سوال و جواب تنبیہ (۱۸/الف ـ ب ۱۸ اشعار) تمثیل مرایت (۱۸/ب تا ۲۱/ب ۱۴۹ اشعار) حقایق موجودات (ص ۲۱/ب تا ۲۵/ب ۱۷۳ اشعار) جھولنہ (۲۴/ب ۲ شعر) خلق پیش از ظہور عین حق بود و بعد از ظہور عین عالم (۲۵/ب تا ۲۷/الف ۱۳۰ اشعار) یافتن ذات مطلق از از اسقاط اضافات (۲۷/الف و ۲۸/ب ۳۶ اشعار) وجودی کہ قایم

پن جب دیکھے جاوے جھانہ   عین اجالا ہے تس ٹھانہ
رات دووے بھادو کی جب   دیکھ انکھیاں میچ سو تب
(ورق ۷/ب)

تب بھی دیکھنا جائے اندھار   کہو اجالا تیتے بار
(ورق ۸/الف)

. . . .
صفت جان پر قائم جان   صفت سو معقول پچھان
(ورق ۸/ب)
ہے نہیں جیون باہر گھر مانہ   ذاتج عین اضافت تانہ

اس عنوان کے بعد دوسرا عنوان مرتبہ لاتعین کے بیان میں صرف ہوا ہے۔

''مرتبہ لاتعین کہ غیب ہویت ذات مطلق است نمودن را خود،،۔

اقرأ کتابک اس بھانت آؤ   کفا بنفسک معنی پاؤ
تو آپن پڑھ آئے کتاب   کہو سو سمجھیں ہر ہر باب
جھٹ کچھ ہے بن کے گھات   جگ تھین ہون الگا جس مات

. . . .
ذات ہو غیب ہویت نانون   صفت نہ اسرے کو تس ٹھانون
صفت ذات پر قائم ہوے   صفت ذات بن پاے نکوئی

اس عنوان کے سلسلہ میں ایک ''جھولنہ،، بھی ہے۔ جھولنہ نظم کی ایک قسم ہے جو ہندوستانی زبانوں میں مختلف ناموں اور شکلوں میں موجود ہے۔ اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں لیکن انداز

رباعی اور مربع سے مختلف ہوتا ہے ۔ یعنی نہ تو رباعی کی طرح پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے اور نہ مربع کی طرح چار مصرعوں میں ردیف قافیہ کی پابندی ہوتی ہے بلکہ پہلا اور دوسرا اور پھر تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے ۔ وزن چاروں مصرعوں کا ایک ہوتا ہے اور یہ وزن رباعی کے اوزان سے باہر ہے ۔ پہلا جھولنہ یہ ہے ۔

ہے گھونگھٹیے مکھ مندہ چھپ جنہ جان پنین کون بھی لاکھ نہیں
ہوں سمجھے کون کہیا بن سجین نہیں ہے پہنیں ہے کون بھی ماگھ نہیں
جیوں دیکھے ہیں سبھی دیکھیں تھیں سکی دیکھنیں کون کھوں دیکھ کرے
ایسا بھید کچھو کوجٹ رہے کھولے گھونگھٹا سو کیوں خوب بڑے

بعض عنوانات حسب ذیل ہیں :

حضرت وحدت (ورق ۱۰/ب و ۱۱/الف ۱۲ شعر) قوس احدیت (۱۱/الف تا ۱۲/الف ۱۸ شعر) سوال و جواب تنبیہ (۱۲/الف۔ب ۱۱ شعر) قوس واحدیت (۱۲/ب و ۱۳/الف ۱۵ شعر) تمثیل (۱۳/الف و ۱۴/الف ۲۲ شعر) حضرت الہیت (۱۴/ب تا ۱۷/الف ۵۱ اشعار) جھولنہ (۱۶/ب ۴ شعر) قوس ظاہر وجود (۱۷/الف ۱۸ اشعار) قوس ظاہر وجود (۱۷/ب ۱۷ اشعار) سوال و جواب تنبیہ (۱۸/الف۔ب ۱۸ اشعار) تمثیل مرایت (۱۸/ب تا ۲۱/ب ۱۳۹ اشعار) حقایق موجودات (ص ۲۱/ب تا ۲۵/ب ۱۷۳ اشعار) جھولنہ (۲۴/ب ۴ شعر) خلق پیش از ظہور عین حق بود و بعد از ظہور عین عالم (۲۵/ب تا ۲۷/الف ۱۳۰ اشعار) یافتن ذات مطلق از از اسقاط اضافات (۲۷/الف و ۲۸/ب ۳۶ اشعار) وجودی کہ قایم

بوجودی بود در حقیقت او را وجود نبود (۲۹/الف تا ۳۰ الف ۴۲ شعر) حکایت آمدن از طرف وجود و مالک شدن بر هر مقام (۳۰/الف تا ۳۱/الف ۲۳ شعر) مراتب وجود (۳۱/الف و ۳۲/الف ۴۶ اشعار) اول نور وجود محسوس میشود و اما از لطافت مدرک نمی گردد و آن عین حجب است و منکشف حجاب (۳۳/الف ۳۴/ب ۲۷ اشعار) سوال و جواب (۳۴/ب ۳۵/الف ۱۳ اشعار) تفصیل حضرت الهیت (۳۵/الف ۳۷/ب ۹۴ اشعار) سوال و جواب (۳۷/ب ۱۳/الف ۶۶ اشعار) جهولنه (۳۹/ب ۲ شعر) احاطه افعال حق در عالم (۱۴/الف ۲۴/الف ۲۹ اشعار) حق فاعل بصفاتست نه بذات (۴۲/الف۴۳/الف ۱۸ اشعار) جهولنا (۴۳/الف ۲ اشعار) ۔

عنوانات کی اس قدر طویل فہرست دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے کتاب کے بعض دقیق مسائل کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے موضوع کی مناسبت سے اسلوب بیان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر صرف سیدھے سادھے دینی مسائل ہی اس کتاب کا موضوع ہوتے تو کوئی دقت نہ ہوتی لیکن ایسے مضامین کے لیے جو اس کتاب میں ہیں نہایت پختہ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ایسا ہی انداز اختیار کیا ہے ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان صوفیوں نے ہندوستانی زبانوں کے سرمائے میں کس قدر اضافہ کیا ہے اور یہ انہیں کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ برعظیم کی جدید زبانیں اپنی موجودہ صورتوں تک پہنچ سکی ہیں ۔

اول تو یہ زبان اب سے چار سو سال پہلے کی زبان ہے، اس لئے بہت سے الفاظ کی شکلیں بدل گئی ہیں ۔ قواعد صرفی میں بھی

آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، اس لئے یہ زبان موجودہ زبان سے بہت کچھ مختلف ہوگئی ہے۔ پھر اس میں مقامی اثرات قدرتی طور پر نمایاں ہیں اور ایسے الفاظ جو خالص ''گجراتی،، ہیں، عام طور پر اردو بولنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے کہیں کہیں کتاب کی عبارت سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن کتاب کا بیشتر حصہ اب بھی نہایت آسانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

مقدمہ فاعل مختار (ورق ۴۷/ب)

توں تو ہے فاعل مختار — تو تجھ کہتا ہوں ہر بار
کر اختیار سنیے جو بات — بات کہوں توجہ سنگھات
سن جس کوں پاوے ہرتھانوں — امور کلی تس کا نانوں
وہ جب ایک فرد کن پاے — امر جزی اس نانوں دھراے
مطلق سبھی صفات پچھان — امور کلی اس کوں جان
. . . . — . . . .
کیچڑ پانیں کہیں ملائیں — اوندھا اس پر کسے لٹ ئیں
(ورق ۷۸/ب)

''دائرہ عشق،، : (ورق ۶۴/الف)

عشق ہوا آ غالب جب — قیس کیا لے مجنوں تب
یاد سو لیلی بن نہیں کوئی — لیلی مانہ تب کہوئی
بول دے کو لیلی جانہ — مجنوں پھر دیکھے تس ٹھانہ
کہیں مجنوں لیلی اس ٹھور — کہے کہ ہوں لیلی نہیں اور

اور لیلے کے غمزے ناز مجنوں مانہ ہوئے دمساز
مجنوں بھی یوں ہوا مشہور کہے اناالحق جیوں منصور
(انا لیلے و لیلی انا)

. . . .

جیے جیے ہیں مجنوں کے انگ روناں جلنا دکھ کے ڈھنگ
(ورق ۶۴/ب)

. . . .

مجنوں ہوا سو لیلی جیوں لیلی مجنوں ہوئے سو تیوں
یہ بھی عشق سو مجنوں کاج جیے لیلی منہ بیدھا آج
جب عاشق آپس کوں کوے تب معشوق سو عاشق ہوئے
لیلی مجنوں ہوئے سوراس مجنوں لیلی کاج لباس
ہن لباس لکم سو جیوں لباس لہن کہیں تو یوں

. . . .

جیوں مجنوں تھا پہلے شان وہ مجنوں مت کریں گمان
(ورق ۶۵/الف)

اب مجنوں جیے مجنوں پائے وے لیلی کی شان دکھائے
کیوں کے لیلی آپس ٹھانہ بوجھا ہوں مجنوں من مانہ
لیلی کے یہ معنی آن مجنوں مجنوں ہوا سو جان
کب مجنوں جب دیویں بول مجنوں دیکھے انکھیاں کھول
تیوں مجنوں بھی لیلی ہوئے کرتا ناز اور غمزے سوئے
یہ مجنوں کی بات سو جب پھر لیلی منہ آئی سب
جب لیلی کوئی بلائے تب لیلی اٹھ دور سو جائے
یہ لیلی کا پہلا چال خوبیں سمجھیں نہیں اتل
اب صورت منہ لیلی جائے پن مجنوں منہ مجنوں آئے

کتاب کا آخری عنوان ''مرتبہ انسان کامل،، ہے جو اس شعر پر ختم ہوتا ہے ۔

بے‌نیشاں اس کا نیشاں یہ عارف ہے کل لساں

اس کے بعد تاریخ کتابت ہے (ورق ۱۳۹/الف)

تمام شد نسخہ خوب ترنگ تصنیف حقایق و معارف آگاہ حضرت خوب محمد پانزدہم شہر رمضان المبارک ۴۶ جلوس میمنت ولا سنہ ھجری یک ھزار و یکصد و سیزدہ بروز ھمایوں روز دوشنبہ ۔

اس اعتبار سے تاریخ کتابت سنہ ۱۱۳۰ھ قرار پاتی ہے ۔

خوب ترنگ کا لسانی مطالعہ :

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قطع نظر اپنے نہایت دقیق موضوع کے یہ نظم لسانی اعتبار سے نہایت اہم ہے ۔ پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانوں کے درمیان اس کی زبان کو ایک عبوری نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔ سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس میں وھی لسانی خصوصیات پائی جاتی ھیں جو قدیم پنجابی، قدیم برج، قدیم دکھنی اور قدیم مرھٹی میں بھی ملتی ھیں ۔ یہ خصوصیت در اصل پراکرت کی اپ بھرنش شکلوں میں مشترک معلوم ھوتی ھیں اور اس سے میرے اس نظریے کی تائید ھوتی ہے، کہ عوامی بولی جو اس وقت برعظیم کے ایک بڑے حصہ میں بولی جاتی تھی بہت سے عناصر مشترک رکھتی ہے ۔ قدیم پنجابی اور دکھنی کے مختلف عناصر سے بعض ماھرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہ زبان پنجاب سے دھلی

اور بعد ازاں گجرات اور دکن میں پہنچی ۱ ۔ اگر ان زبانوں کا تعلق صرف چند الفاظ یا چند صرفی صورتوں تک محدود ہوتا تو شاید یہ قیاس صحیح ہوتا لیکن بنیادی طور پر قدیم گجراتی اور قدیم پنجابی میں جو تعلق نظر آتا ہے وہ صرف ایک فتح مند لشکر یا چند خاندانوں کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہونے سے پیدا نہیں ہوسکتا ۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ ان دونوں زبانوں کی بنیادی شکل ایک تیسری زبان ہوگی جس کی کچھ خصوصیات ان دونوں میں وراثت میں آئی ہیں اور بعض خصوصیات مقامی اثرات کا نتیجہ ہیں ۔

خوب ترنگ کی زبان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیشتر الفاظ کے آخر یا درمیان میں ''نون'' ہے جو بعد کی زبانوں میں کم ہوگیا ہے ۔ یہ تنوین بعض اور پراکرتوں میں بھی ہے ۔ خوب ترنگ سے بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :

نانوں (نام) کوں (کو) تس کوں (اس کو) تھیں (تھے ۔ سے ۔ سے) ٹھانہ (جگہ) مانہ (میں) ما نہیں (میں) کنہ (کہاں) جنھ (جہاں) سنیں (سنے) تیں (تو) مہیں (میں) دیکھتیں (دیکھتے) چلانوں (چلاؤں) منجھ (مجھ) منجھے (مجھے) پچھیں (پیچھے) اپیں (آپ) ذہنیں (ذہنی) پہلوں (پہلے) تھانوں (تھاں ۔ جگہ) کنیں (کنیے ۔ پاس قریب) وغیرہ وغیرہ ۔

دوسری نمایاں خصوصیت تخفیف یعنی حروف علت کو کم کرنا یا کمزور کرنا ہے ، جو آج بھی اردو کے مقابلہ میں پنجابی میں نمایاں ہے خوب ترنگ کی بعض مثالیں یہ ہیں :

۱ ۔ ملاحظہ ہو 'پنجاب میں اردو' ۔ محمود شیرانی ۔

چھٹ (چھوٹ) کیت (کہت - کہتا ہے) دیت (دیت - دیتا ہے) بوجہیں (پوچھے) -

صرف خصوصیات :-

۱ - الف پر ختم ہونے والے الفاظ کی گردان -

(۱) گھوڑا موجود -
(۲) گھوڑوں کیے گھات -
(۳) گھرڑے کی شان -
(۴) گھوڑے کا -

۲ - فعل کی گردان - دیکھیاں (دیکھنا)

(۱) دیکھیں اودھد کا سب تیوں -
(۲) جیوں چشمے دھر دیکھے کوئی -
(۳) جس دیکھے وہ آپ دکھائے -
(۴) مل کر اندھے گئے دو چار
ہاتھی دیکھیں کون سب یار
(۵) ایک دیکھتا تھا تس تھانا -
(۶) دیکھنہار (دیکھنے والا)

فعل کی بعض اور شکلیں :-

بھریاں گلالاں ہیں تس ٹھانہ
نور دیکھناں دیوے کیوں
حسن کریکا عاشق جیوں -

مستقبل کے لئے دکھنی میں لاحقہ ''سی'' استعمال ہوتا ہے لیکن خوب ترنگ میں اس کی ایک بھی مثال موجود نہیں - ''سی'' پنجابی میں موجود ہے لیکن مستقبل کی بجائے ماضی کا مستقبل صیغہ

(بصمن تھا) ہے ۔ لیکن پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی ''سی'' مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

بھوکا راکھ اور رات جگا (بجائے رکھ)
انست بریک پوچھیا جب (بجائے پوچھا)
قاید بلے کہیا ان (بجائے کہا)

ماضی بنانے کے لئے علامت مصدر دور کر کے اردو میں صرف ''الف'' لگاتے ہیں لیکن دکھنی، پنجابی اور گجراتی تینوں میں ''یا'' آتا ہے ۔

تاکیدی :— دکھنی اور گجراتی دونوں میں اسم اور فعل دونوں کے آخر میں تاکید کے لئے ''ج'' لگاتے ہیں ۔

خداج حافظ ہے ہر ٹھانہ (یعنی خدا ہی)
اقرب شہ رگہ تھیں وہ جان
ہت توں کوں تجھیج پچھان (یعنی تجھے ہی)
توہیج اوس کوں صنعت سوہروے (یعنی تو ہی)

ضمیمہ و اشارہ و اضافت وغیرہ :—

تہان (وہاں)
اینہاں سوں (ان سے)
جنہ (جہاں)
تنہ (وہاں)
جان (جہاں)
تس (اس کی)
اتناں (اتنا)

اتنے	(اتنے)
اتنے	(اتنے)
جوسا	(جون-سا)

جیے، جو - مہن منہ - مانہ، مان - میں، تھیں - ے، کون - کو، کی، کا - پن : پر - سو - کن (نزدیک) کوھین : کبھی ھور : اور اور بھی استعمال ھوا ھے -

جمع بنانے میں ''ان،، کا استعمال :-

فعل مطابق فاعل ـــ صفت مطابق موصوف

پنجابی میں اب تک یہ قاعدہ موجود ھے - قدیم دکھنی میں بھی پایا جاتا ھے - اردو میں کسی قدر میر کے زمانے تک تھا - کہ فعل کی جمع فاعل کی مطابقت میں اس طرح لاتے تھے : ع وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں -

بھریاں گلالاں ھیں تس ٹھانہ	(بھری)
جیوں درپن مانہ نظراں جائیں	(نظریں)
باتاں کیتیـــاں ھو وین تب	(باتیں کی ھوں)
صفا نیے لہران نبت دوے	(لہروں)

''کسـر،، کا عدم استعمال :-

۱ - یہ اجمال سنیں دھر کان

۲ - جب درپن دھر دیکھے کوئی

گنتی:۔ ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار ۔ پنج ۔ چھ ۔ ست ۔ آٹھ ۔ نو ۔ دس ۔ پندرہ ۔ چالیس ۔ پنجتالیس ۔ ایک چھک ؛ ایک چوک ۔ دھاکا ۔ پورا ۔ ادھورا ۔

متروکات:۔ اتاں (اب) اجلا (سفید) اجل (روشن ۔ سفید) ایدھر (ادھر) اودھر (ادھر) اوندھا (الٹا) اندھیلے (اندھیے) بھانت (طرح) باج (بغیر) بن (بغیر) باؤ (ہوا) بانسی (بانسری) بستار (پھیلاؤ) بھان (طرح) بھون (زمین) پن (پر) پر تک (ہر گھٹ) پر کٹ (ظاہر) بات (پتہ) پاسے (طرف) پنہتان (پہننے والے) تد (تب) تیجا (تیسرا) تتا (گرم) ترت (جلدی) ٹک (ذرا) جد (جب) جوت (روشنی) جناور (جانور) چہون (چھٹا) دوپہری (دوپہر) دوجار (دوسرا) دیوا (دیا ۔ چراغ) درپن (آئینہ) داندان (دندانون) دھرنا (رکھنا) روشنئی (روشنی) زیادت (زیادہ) سمند (سمندر) کھولنہار (کھولنے والا) کوز (کوزہ) کونبھار (کمہار) کھارا (کھاری۔نمکین) گگن (آسمان) گھڑیالا (گھڑیال ۔ گھڑی) لانبا (لمبا) لگ (تک) لون (نون ۔ نمک) ماٹی (مٹی) میچ (بند) ننہان (چھوٹا) نت (ہمیشہ) نیر (پانی) ہاڑ (جسم) ہلد (ہلدی) ۔

املا اور کتابت

قدیم ہندوستانی زبانوں میں یہ رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ عربی و فارسی کے جو الفاظ ان میں دخیل ہوجاتے ہیں، ان

کے لکھنے میں بجائے اصل لفظ کے اتباع کے عام طور پر صرف اس کی عوامی صوتی شکل کا لحاظ رکھا جاتا ہے ۔ دکھنی کی جو قدیم کتابیں (مثلاً ملا وجہی کی قطب مشتری اور سب رس) اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی ہے ۔ شاہ خوب محمد چشتی نے بھی یہی انداز پسند کیا ہے ۔ مثلاً

بے (بجائے بیع) سہیں (صحیح) داوا (دعوا) فرشتا (فرشتہ) مصریے (مصرعے) عبس (عبث) شرو (شروع) نقطا (نقطہ) ۔

کتابت میں وہ طرز ہے جو قدیم کتابوں میں عام ہے یعنی ''ک اور گ''، ''ج اور چ''، ''ر اور ڑ''، ''ت اور ٹ'' کو ایک ہی طرح لکھا ہے ۔ ''ٹ'' پر کبھی کبھی چار نقطے بھی لگا دیتے ہیں ۔ بعض الفاظ کا املا غلط ہے لیکن ایسی غلطیوں کی بار بار تکرار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی صوتی شکل بھی وہ ہی تھی ۔ مثلاً '' کھلاؤں کی جگہ کلہاؤں'' ۔ ''اگلا کی جگہ الگا'' اور پہچان کی جگہ پچھان لکھا گیا ہے ۔

گجراتی اور فارسی

موجود زمانے کے قواعد نویسوں نے تحریری، اور تقریری گجراتی کی تین شکلیں بتائی ہیں، مثلاً ٹسڈل لکھتا ہے کہ[1] ''گجراتی کی مختلف مقامی بولیوں سے قطع نظر تحریری اور تقریری زبان کی تین خاص شکلیں ہیں: پہلی ہندی گجراتی جسے حکومت نے بجا طور

1. A simplified Grammar of the Gujrati Language.
Rev. Wm. St. Clair Tisdall, M. A., C.M.S. London 1892—P. 15.

پر معیاری تسلیم کیا ہے اور جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ دوسری پارسی گجراتی ہے؛ یہ وہ زبان ہے جسے پارسی اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ عام گجراتی سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں خالص فارسی کے الفاظ کثیر تعداد میں، بالخصوص مذہبی معاملات میں، داخل کر لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی اور دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو اردو سے لئے گئے ہیں۔ اس زبان کی قواعد ابھی متعین نہیں اور نہ اس کے اصول مقرر ہیں۔ تیسری مسلمانی گجراتی ہے جس میں ہندوستانی اور اس کے وسیلہ سے اختیار کئے ہوئے فارسی و عربی کے الفاظ کی کثرت ہے لیکن پڑھنے والے کے مسلمان، ہندو یا پارسی ہونے سے لغت پر چاہے کچھ اثر پڑتا ہو، اس کی قواعد اگر صحت کے ساتھ استعمال کریں تو ایک ہی ہے،،۔

گجراتی قواعد کا تفصیلی بیان ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن میں صرف ایسے امور کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مذکورہ بالا بیانات کی تائید ہوتی ہے گجراتی میں جنس کے تین صیغے ہیں: نر جاتی یعنی مذکر، نری جاتی مونث اور نانیتر یعنی بے جان۔ الفاظ کی جنس کا تعین یا تو ان کے معنوں سے ہوتا ہے یا آخری حروف سے۔ جاندار اشیاء میں جو مذکر ہیں انہیں مذکر اور جو مونث ہیں انہیں مونث قرار دیا گیا ہے اور جو دونوں جنسوں میں شامل ہوسکتے ہیں انہیں نانیتر قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً پرش (مرد) ویر (بہادر، سورما) مذکر ہیں۔ استری (عورت) مونث ہے اور مانس یعنی انسان نانیتر ہے۔ چھوکرو (لڑکا) مذکر چھوکری (لڑکی) مونث چھوکروں (بچہ) نانیتر۔

ہفتے کے سات دن، مہینوں کے نام، پہاڑ، اجرام فلکی، سمندر، ہوائیں سب مذکر ہیں اور اس اعتبار سے اردو سے قریب تر ہیں ہوائے اس کے کہ ہفتے کے دنوں میں جمعرات کو اکثر مونث قرار دیا جاتا ہے۔ سوائے برہم پترا اور سندھوناد کے دریاؤں کے نام مونث ہیں۔ یہی حال اردو میں ہے۔ زمین بھی مونث ہے، دن کے مختلف حصے بھی مونث ہیں، جس طرح اردو میں صبح، دوپہر، شام، رات۔ 'پہر'، جو گجراتی میں 'پہور' ہے مذکر ہے۔ اردو میں بھی اسی طرح ہے۔ اعضائے جسمانی میں آنکھ، جانگ، نس، پانپن، (یعنی پپوٹہ) کندھا، اور جیب بھی مونث ہیں۔ اردو میں بھی سوائے 'کندھا' کے سب مونث آتے ہیں۔ جہاں تک آخری حرف کا تعلق ہے اکثر اسماء جو 'و' پر ختم ہوتے ہیں مذکر ہیں جو 'ی' یا 'ا' پر ختم ہوں مونث ہیں اور 'اون' پر ختم ہونے والے نانیتر، لیکن ان میں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ عربی فارسی الفاظ جن کے آخر میں 'ات' یا 'آس' آئے مونث ہیں۔ مونث کی سب سے عام پہچان یہی ہے۔

اردو کی طرح گجراتی میں بھی واحد اور جمع کے صرف دو صیغے ہیں۔ سنسکرت کی طرح دو کے لئے علیحدہ صیغہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ جمع کی پہچان لفظ کے آخر میں (و) کی علامت ہے۔ تکریم کے لئے جس طرح اردو میں واحد کے موقع پر جمع بولتے ہیں، گجراتی میں بھی یہی انداز ہے۔

گجراتی میں صفت اپنے موصوف اسم سے پہلے لایا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پنجابی اور اردو میں آتا ہے۔ صفت کی دو قسمیں ہیں، ایک میں تعریف ہوتی ہے اور دوسری میں تعریف نہیں ہوتی۔ جنس، عدد، اور حالت (case) میں صفت اور موصوف میں مطابقت ہوتی ہے۔ یہ بات اردوئے قدیم کی دکھنی شکل میں بہت نمایاں تھی، پنجابی میں اب تک برقرار ہے اور گجری میں بھی موجود ہے۔

گجراتی پر فارسی کا اثر دکھانے کے لئے صرف ان الفاظ کی ایک فہرست ھی دینا کافی ھوسکتا ھے جوگجراتی میں فارسی یا فارسی کے ذریعے داخل ھوئے لیکن اس سے زیادہ اھم بات یہ ھے کہ بکثرت محاوروں کا فارسی سے اسی طرح ترجمہ ھوا جیسے اردو میں ملتا ھے ۔

مثلاً غلط پکڑنا، نظر دھرنا ، راہ پکڑنا ، آنکھ مارنا، موقوف ھونا، نام دھرنا، گمان کرنا، نظر جانا، صورت پکڑنا، صورت باندھنا کان دینا ۔

فارسی یا عربی کے الفاظ جو فارسی کے ذریعہ گجراتی میں داخل ھوئے

اگر (ف)، اگر جو (اگرف) + جو (پراکرت) آخری آخر (ع) +ی، امیر (ع) اندر (ف) اصل (اصل =ع) اصلو (مذکر)، اصلی، (مونث) اصلون (نانیتر) آتش (ف) آتش بہرام (ف) اتیک = عتیق (ع) او اج (آواز ۔ ف) ایاز، ایلچی، ایذا، ایجان (اذان) ایمان، انصاق (انصاف،) باد (بعدع) بہاد رو(بہادر ف) بہادری (مونث) بجار (بازار ف) باجو (بازو =ف) باکی (باقی ع) بند (ف) بندی خاتون (ف) برابر (ف) بے در کاری (ف) بیگم (ف) بہرام، بےو کوف(بیوقوف ف) بالکل (ع) بخارا، بانگ، بادشا، بادشاھی، پرویز، پسند، پائے تخت، پائمال، پیغمبر ثابت، تابع ، تیار ، تیاری تندرست، تپاس (تفحص) تہمت ۔

جبر، جادوگر، جایگاہ، جہانسوز، جزیہ، جمین، (زمین) جامن (ضامن)، جان، جنان کھانوں (زنان خانہ) جرا (ذرہ)، جاری، جواب،

جواہر، جہری (زہری)، جندگی (زندگی) جلم (ظلم)

چاکر (ف) چاکری، چالاک (ف)

حبشی، حاضر، ہزار، حضرت، حاکم، حال، حالت، حانصل (حاصل)، حرکت، حریف، ہمت، حساب، حکومت، حملہ

داخل (ع) دمشق (ف) دربار، دریک، دریا، درست، دروازہ، دیوانو (دیوانہ ف) دولت(ع) دنیا، دور، دشمن، دعائے (دعا) دم

رعیت، رکم (رقم)، رمضان۔

سخت، سلام، سنہ، سردار، سرکار، سرکاری، سوال، سلطان، سوگند

شاگرد، شاہزادہ، شہر

صدی، صاف، صفائی، صوبہ

طراف (طرف) طرح، طریق

عجیب، عجائب (ع) عرب، ارج (عرض=ع) ایمارت (عمارت؛ عیسیٰ، عیسوی

غریب، غیر، غیر واجبی، غور، غلام، غصہ

فقط، فریاد، فتح، فردوسی، فوج

کبول (قبول)، کافلو (قافلہ) کافر، کاگل (کاغذ) کاجیو (قضیہ = جھگڑا) کلم (قلم) کید (قید) کھبردار (خبردار) کھبرداری، کھالی (خالی) کھلیفہ (خلیفہ) کھانگی (خانگی) کھراب (خراب) کھتاب (خطاب) کھوراک (خوراک) کھوبصورت (خوبصورت) کھون (خون) کھوش (خوش) کھوشی (خوشی) کھسرو (خسرو) کلو (قلعہ) کیمتی (قیمتی) کنارو (کنارہ) کتاب، کوچ، قران

لائک (لائق)، لشکر، مجلس، مال، مال متا (مال متاع) معلوم، منارہ، ماندہ، مرجی (مرضی) لائکی، مطلب، میدان، محل، مہربانی محصول، مدت، موجب، مقدمہ، ملک، ملاقات، ملتوی، مراد، موسی، موسلمان، مشکل، نشان، نوکر، نوکری، وغیرہ، 'واجب، وزیر، وقت، وارث، وصول، وہم، ہنر

خوب محمد چشتی کا دوسرا کارنامہ چھند چھندان ہے۔ میرے علم میں اس رسالہ کا کہیں اور نسخہ موجود نہیں ہے اور نہ کسی مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کے موضوع اور نام کے متعلق خود لکھتے ہیں :

بسم‌اللہ کرنا نون دھر خوب چھند چھندان
پنگل اور عروض اور تال ادھیاتینہ آن

لکھ اعراب سو کر جزم غنا ھور تشدید
پچھلا کر تشدید شنہ خوب کرے تاکید

یہ نسخہ بے حد کرم خوردہ اور ناقص ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی عروض کی بنیاد تال پر کس طرح رکھی گئی ہے اور عروض عربی و فارسی کی بحریں کس طرح اس تال سے پرکھی جاسکتی ہیں۔ عربی کی مختلف بحروں، اوزان اور ارکان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

فعلن	۲ ۱	تھی تھی
فعل	۱ ء	تتھی

فعل ۱ء تہی ت

مفعولن ءءء تہی تہی تہی

فعولن ۱ءء تتھی تہی

کتاب کے دو حصے الگ الگ ھیں - پہلے حصے میں پنگل اور دوسرے میں عروض کی تفصیلات ھیں - اردئے قدیم میں غالباً یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری رسالہ ھے لیکن جب تک کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہ ھو جائے اس کا مطالعہ ممکن نہیں ھے -

---

کتابیات

۱ - قلمی نسخہ خوب ترنگ، مصنفہ خوب محمد چشتی، تاریخ کتابت ۱۵ رمضان المبارک ۱۱۳۰ھ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۲ - چھند چھندان، مصنفہ خوب محمد چشتی، سن کتابت نامعلوم، پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۳ - ادات الفضلا قلمی نسخہ برٹش میوزیم

۴ - مویدالفضلا ,, ,,

۵ - دستور الصبیان ,, انڈیا آفس لائبریری

۶ - Grearson's Linguistic Survey of India. Vol .IX Part II

۷ - A Simplified Grammer of the Gujrati Language. Rev. Wm. St. Clair Tisdall London 1892.

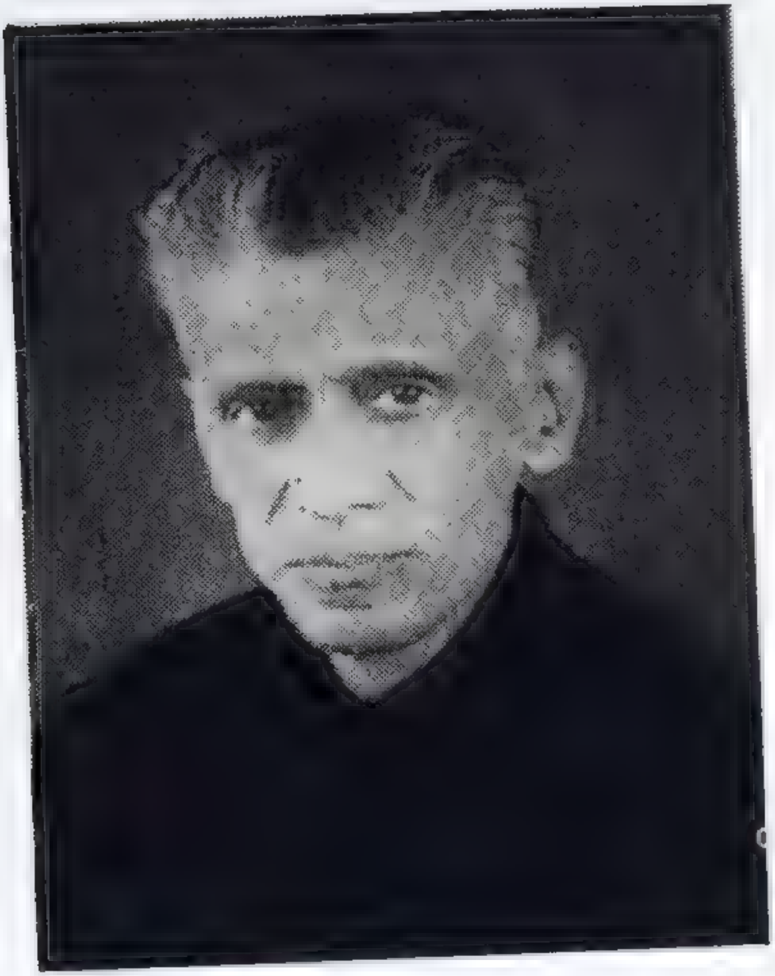
۸ - پنجاب میں اردو، محمود شیرانی

۹ - اردو شہ پارے، محی‌الدین قادری زور

۱۰ - Catalogue of Hindustani Manuscripts in India Office Library.

۱۱ - رسالہ اردو، جلد ۹، ۱۹۲۹

(مئی ۱۹۵۲ء)



سید وقار عظیم

سید وقار عظیم

داستان امیر حمزہ

(فورٹ ولیم اور لکھنؤ کے نسخے)

ہماری مختصر داستانوں میں جس طرح باغ و بہار (قصہ چہار درویش) کا نام زبان زد ہے اسی طرح طویل داستانوں میں داستان امیر حمزہ کے نام سے عوام ور خواص سب واقف ہیں۔ حالانکہ اس واقفیت اور مقبولیت کی بنا دونوں کتابوں کے معاملے میں مختلف ہے۔ باغ و بہار کی شہرت اور مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا اسلوب نگارش اور انداز بیان ہے، جس میں بعض ایسے عناصر موجود ہیں جو اس معروف قصے کو ہر زمانے میں مقبول بنا سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف امیر حمزہ کی پسندیدگی کا سبب اندازبیان سے کم یرزیادہ اس کے وہ کردار ہیں جنہوں نے اپنے کرناموں کی بدولت سننے اور پڑھنے والوں کے دل میں مستقل جگہ بنائی ہے۔

باغ و بہار اور داستان امیر حمزہ کی ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ قصے کے بنیادی عناصر اور ان کا ڈھانچہ فارسی سے لیا گیا

ہے ۔ یہ بات البتہ ہے کہ اردو والوں نے ان قصوں میں اپنی پسند، مزاج اور ماحول کے مطابق، پڑھنے والوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر ان میں بہت سی تبدیلیاں بھی کی ہیں اور اضافے بھی ۔ اس نقطۂ نظر سے داستان امیر حمزہ کو اردو کے سب قصوں پر تفوق حاصل ہے، اس لئے کہ اردو کے اس سب سے طویل قصے (یا داستان) میں مترجمین اور مولفین نے بعض اوقات اتنی چیزیں بڑھائی ہیں کہ فارسی کے قصوں کے ترجمے ہونے کے بجائے انہوں نے مستقل تصانیف کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔

داستان امیر حمزہ کی تصنیف، تالیف اور ترجمے کے سلسلے میں اتنی باتیں لکھی اور کہی گئی ہیں کہ اس سلسلے میں اکثر لوگوں کے ذہن میں بہت سی الجھنیں ہیں ۔ گو یہ مضمون ان الجھنوں کو دور کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ داستان امیر حمزہ کے ایک خاص ایڈیشن کی بعض نمایاں خصوصیات کے اظہار اور وضاحت کی غرض سے لکھ رہا ہوں لیکن اصل موضوع تک پہنچنے سے پہلے اختصار کے ساتھ ان الجھنوں کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ذہن میں رکھنے کی بات یہ ہے کہ اردو میں داستان امیر حمزہ کی تالیف و تصنیف کی دو الگ الگ کڑیاں ہیں ۔ ایک کڑی تو وہ ہے جس کا تعلق فورٹ ولیم کالج میں لکھے جانے والے قصوں سے ہے ۔ یعنی فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشک نے داستان امیر حمزہ کو چار حصوں میں ترجمہ کرکے اسے ایک جلد کی شکل میں ترتیب دیا ۔ اس کا سنہ ترجمہ و تالیف ۱۸۰۱ء (مطابق ۱۲۱۵ ہجری) ہے ۔ اسی کتاب پر محمد عبداللہ بلگرامی نے ۱۸۷۱ء میں نولکشور والوں کے لئے نظرثانی کی اور

پھر اس نظرثانی کے بعد ۱۸۷۱ء میں نولکشور پریس کی ایما پر شیخ تصدق حسین نے اس پر مزید نظرثانی کی ۔ آج کل بازار میں داستان امیر حمزہ کے نام سے جو کتاب (۸/۳۰X۲۰ سائز پر) عام طور سے ملتی ہے وہ یہی نولکشور پریس والی شیخ تصدق حسین کی نظرثانی کی ہوئی کتاب ہے ۔

داستان امیر حمزہ کے حصوں کی دوسری کڑی وہ ۴۶ جلدیں ہیں جو نولکشور پریس کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں ۔ ان ۴۶ جلدوں میں سے بعض کی حیثیت ترجمے اور تالیف کی ہے اور بعض خالصتاً تصانیف ہیں ۔ اور ان کی تالیف، ترجمے اور تصنیف میں کئی مشہور داستان گو شریک ہیں ۔ ان ۴۶ جلدوں کی جو تفصیل ڈاکٹر گیان چند صاحب کی قابل قدر تصنیف 'اردو کی نثری داستانیں' میں درج ہے وہ یہ ہے :

نوشیروان نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
ہرمزنامہ	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین
ہومان نامہ	ایک جلد	تالیف احمد حسین قمر
کوچک باختر	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین
بالا باختر	ایک جلد	ترجمہ تصدق حسین
ایرج نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
طلسم ہوش ربا	چار جلد (ابتدائی)	ترجمہ محمد حسین جاہ
طلسم ہوش ربا	چار جلد (آخری)	ترجمہ احمد حسین قمر
صندلی نامہ	ایک جلد	ترجمہ سید اسماعیل اثر

تورج نامہ	دو جلد	ترجمہ پیارے مرزا تصدق حسین اور اسماعیل اثر
لعل نامہ	دو جلد	ترجمہ تصدق حسین
آفتاب شجاعت	۶ جلد	تصنیف تصدق حسین
گلستان باختر	۳ جلد	تصنیف تصدق حسین
بقیہ طلسم ہوش ربا	۲ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم نور افشاں	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم ہفت پیکر	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم خیال سکندری	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم نوخیز جمشیدی	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم زعفران زار سلیمانی	۲ جلد	تصنیف احمد حسین قمر اور تصدق حسین

ان ۴۶ جلدوں میں سے ۲۰ ترجمہ ہیں، ایک میں ترجمہ اور تالیف شامل ہے اور باقی ۲۵ جلدیں تصدق حسین اور احمد حسین قمر کی تصانیف ہیں ۔ ان ضخیم جلدوں کے متعلق ڈاکٹر گیان چند نے حساب پھیلا کر یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اوسطاً دو سو صفحے روز پڑھے تو ان جلدوں کو آٹھ مہینے میں ختم کرسکے گا ۔

ان ۴۶ جلدوں کے ترجمے، تالیف اور تصنیف کی جو تفصیلات اوپر درج کی گئیں، انہیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کام کئی مختلف آدمیوں کا ہے اور ترجمے اور تالیف سے زیادہ تصنیف ہے ۔ اس لئے ان کتابوں پر کسی طرح کی تنقیدی بحث کرنے اور ان کے

ادبی محاسن کا اندازہ لگانے کے لئے ضرورت ہے کہ ترجموں اور تصنیفوں کو الگ الگ کیا جائے - جو ترجمے ہیں انہیں اصل سے ملایا جائے اور دیکھا جائے کہ اصل حصے کی تصنیف اور اس کا ماخذ کیا ہے - پھر اس چیز پر نظر رکھی جائے کہ مترجمین اور مولفین نے ترجمہ کرتے وقت اُن میں کیا کیا تصرفات کئے ہیں، اور پھر یہ کہ جن دفتروں کی حیثیت تصانیف کی ہے اُن کا مرتبہ مجموعی اعتبار سے اُن دفتروں کے مقابلے میں کیا ہے جو ترجمے کی ضمن میں آتے ہیں - غرض ان حیرت انگیز ترجموں اور تصنیفوں کا مکمل جائزہ لینا اور اُن کے سب پہلوؤں کی وضاحت کرنا ایک ایسا کام ہے کہ آدمی اپنی عمر اسی کے لئے وقف کر دے تو ممکن ہے کہ اس کا حق ادا کر سکے -

اُردو میں ان ۴۶ جلدوں کے ترجمے اور تالیف کا سلسلہ ۱۸۹۳ میں شروع ہوا اور ۱۹۰۸ میں ختم ہوا - چھپنے کا سلسلہ البتہ ۱۹۱۷ تک جاری رہا -

جن دفتروں کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا ہے اُن کے ماخذ کی تحقیق کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے جو نتیجے نکالے ہیں اُن سے پڑھنے والوں کی بہت سی اُلجھنیں دور ہوتی ہیں - یہ نتائج مختصر طور پر یہ ہیں :

۱ - قصۂ امیر حمزہ کسی ایک شخص نے نہیں بلکہ مختلف زبانوں میں مختلف آدمیوں نے لکھا -

۲ - یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اصل قصہ (فارسی) ایران میں لکھا گیا یا ہندوستان میں -

۳ - داستان امیر حمزہ کے سب دفتروں میں قدیم ترین نوشیروان نامہ ہے اور محمود غزنوی اور ہمایوں کے عہدوں کے درمیان تصنیف ہوا ۔

۴ - رموز حمزہ کے نام سے یہ نسخہ ۱۶۰۰ع کے قریب لکھا جا چکا تھا ۔

۵ - داستان امیر حمزہ کے اصل میں آٹھ دفتر ہیں اور یہ اٹھارویں صدی کے نصف اول تک مرتب ہو چکے تھے ۔

۶ - اردو میں ترجمہ کرتے وقت ہمارے داستان‌گویوں نے ان میں بہت سے اضافے کئے ہیں ۔ یہاں تک کہ اردو ترجموں اور فارسی اصل کا مقابلہ کیا جائے تو ترجموں کی ضخامت اصل سے دوگنی ہوگی ۔

ضخامت کا یہ اضافہ عموماً اس لئے ہوا ہے کہ ہمارے داستان گویوں نے ترجمے کرتے وقت انہیں اپنے ماحول کی رنگ آمیزی سے ایک خاص طرح کے قاری کے لئے دلچسپ اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے ۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اردو میں داستان امیرحمزہ کے نام سے جو کتابیں موسوم و معروف ہیں اُن کے دو الگ الگ سلسلے ہیں ۔ ایک سلسلہ تو چار حصوں کی وہ کتاب ہے جسے اشک نے ترتیب دیا تھا اور اُس پر لکھنؤ میں نظر ثانی ہوئی تھی اور دوسرا طویل اور ضخیم سلسلۂ اُن ۴۶ جلدوں کا ہے جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ۔ اشک والی داستان امیر حمزہ کا ماخذ

نوشیروان نامہ کا قدیم دفتر ہے ۔ میری بحث اور تجزیہ کا موضوع یہی نسخہ ہے ۔ بحث اور تجزیے کے وقت میں نے اس فرق کو اپنا موضوع بنایا ہے جو اشک کے اصل نسخے اور لکھنوی نسخے میں ہے ۔

ان دونوں نسخوں میں پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو جو فرق دکھائی دیتے ہیں، یہ ہیں :

اشک کے نسخے اورلکھنوی نسخے کی ضخامت میں خاصا فرق ہے ۔ لکھنوی نسخہ ضخامت میں اشک کے نسخے کے مقابلے میں تقریباً ڈیڑھ گنا ہے ۔

نسخوں کا آغاز اور انجام ایک دوسرے سے نہیں ملتا ۔

دونوں نسخوں میں داستانوں کے عنوان ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔

ایک نسخے میں (یعنی اشک والے نسخے میں) ہر جلد میں واقعات کو داستانوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ اور چاروں جلدوں میں ملا کر ۸۸ داستانیں ہیں ۔ لکھنو والے نسخے میں قصے کی تقسیم جلدوں میں تو کی گئی ہے لیکن داستانوں کے نمبر درج نہیں ہیں ۔ اسے ایک مسلسل قصے کی طرح بیان کیا گیا ہے ۔

یہ ظاہری فرق بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ لیکن جب پڑھنے والا ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو ذرا گہری نظر سے دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی

کہ ان چھوٹی باتوں کے پردے میں بعض بڑی اور اہم باتیں پوشیدہ ہیں -

آئیے اب ایک ایک کر کے ان ظاہری باتوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان سے کیا منطقی نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں -

اشک کے نسخے کی تمہید یہ ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلواۃ و السلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحاب اجمعین - بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے - اس زمانے میں جہاں تک راویان شیرین کلام تھے، انھوں نے آپس میں مل کر امیر حمزہ کے قصے کی چودہ جلدیں کہیں، واسطے بادشاہ کے سنانے کے - اس کے سننے سے آئین ہرطرح کی خدمت کا معلوم ہوتا ہے، دوسرے منصوبے لڑائیوں کے اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے یاد آتے ہیں - اس خاطر ہر روز بادشاہ کو سناتے تھے کہ کسی امر میں غیر کی مصاحبت کا در ماندہ نہ رہے اور اب اس عرصے میں شاہ عالم بادشاہ کے، مطابق سن بارہ سے پندرہ اور اٹھارہ سو ایک کے، خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے، بموجب خواہش مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب کے، واسطے نو آموزوں زبان ہندی کے، اس قصے کو زبان میں اردوے معلا کی لکھا تاکہ صاحبان مبتدیوں کے پڑھنے کو آسان ہووے" -

اشک نے اس تمہید میں داستان امیر حمزہ کو سلطان محمود کے عہد کی تصنیف بتایا ہے ۔ اس قصے کے جتنے اہم قلمی نسخے دنیا کے بعض بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں، ان کے بیانات میں بڑے اختلاف ہیں اور ان اختلافات کا خلاصہ یہ ہے کہ قصۂ حمزہ کا مصنف عباس (برادر حمزہ) امیر خسرو، فیضی، ملا جلال بلخی (معاصر سلطان محمود) ابو المعالی اور شاہ ناصرالدین محمد کو بتایا گیا ہے ۔ یہ موضوع کہ یہ قصہ اصل میں کس نے لکھا ہے اور کس زمانے میں لکھا، ہمارے دائرۂ بحث سے باہر ہے۱ ۔ البتہ ایک بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ فارسی کے جتنے مختلف الاصل نسخے جا بجا دور افتادہ کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں بنیادی قصہ وہی نوشیرواں اور حمزہ کا قصہ ہے جس کی بنیاد پر اشک کی کتاب تالیف کی گئی ہے ۔

اشک کی تمہید کا دوسرا اہم حصہ اس کا آخری ٹکڑا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ قصہ مسٹر گلکرسٹ کے کہنے سے آسان اردو میں لکھا گیا تاکہ صاحبان اسے آسانی سے پڑھ سکیں ۔

اس تمہید کے بعد اشک نے قصہ شروع کیا اور قصے کا پہلا عنوان ہے :

۱ ۔ اس کی بڑی اچھی بحث ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''شمالی ہند کی نثری داستانیں'' میں کی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہوں ص ۱۸۴ تا ۱۹۴ کتاب مذکور، پہلا ایڈیشن شائع کردہ انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۴ع ۔

''ابتدائے دفتر نوشیراں''

لکھنؤ والے نسخے میں نہ اشک والی تمہید شامل ہے اور نہ ''ابتدائے دفتر نوشیرواں'' کا عنوان ۔ بلکہ آغاز داستان کے بعد ''بسم اللہ'' کر کے داستان شروع کر دی گئی ہے ۔ تمہید کی طرح دونوں کتابوں کے خاتمے بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے ۔

اشک والے نسخے میں جہاں کہانی ختم ہوتی ہے وہاں مسلمانوں کے لئے دعائے خیر کر کے اشک نے ''آمین یا رب العالمین'' کہا ہے اور واللہ اعلم بالصواب کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں ۔ اس کے برخلاف لکھنؤ نسخے میں قصہ ختم ہو جانے کے بعد ہی خاصی طویل عبارت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اشک والے نسخے میں ترمیم و تصرف کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ لکھنوی نسخے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :

''قدرت صانع بیہمال قابل سپاس لا کلام ہے ۔ اور سب سے زیادہ مقام بے منتہا کا یہ مقام ہے کہ فصحا اور بلغا کو قوت تصنیف عطا کر کے طریقۂ تالیف سیرو تاریخ بتا دیا ۔ داستان گوی و ایجاد قصص کا ملکہ دیا ۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو افکار اور پریشانی مٹانے کا کوئی طریقہ ملاحظہ تاریخ و معائنہ قصص سے بہتر پیدا نہیں حالت رنج و غم میں کوئی مونس اور رفیق ایسا نہیں ۔ اگرچہ ہر داستان کو یہی مرتبہ حاصل ہے مگر خاصۃً داستان نادر بیان امیر حمزہ کا رتبہ سب داستانوں میں

اعلی و کامل ہے ۔ اس کے مولف نے عجب سحرکاری
فرمائی ہے کہ ہر شخص اس کا دل و جان سے خریدار
ہے ۔ جو بصرف توجہ و زر کثیر جناب معلی القاب مجسم
فیض و نوال مظہر جود و افضال، عالی ہمت، والا مرتبت
جناب منشی نولکشور صاحب سی ۔ آئی ۔ ای مرحوم
بمعاوضۂ عطیہ گراں بہا سر دفتر فصحائے عصر مولوی
حافظ سید عبداللہ صاحب بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ نے آراستہ
فرما کر اور تعقید عبارت رفع کرکے اس قصہ کی عبارت
کو اردوئے معلی بنا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعدہٗ بار چہارم
صاحب فہم و ذکا، ماہر زبان روز مرہ اردوئے معلی
مولوی سید تصدق حسین مصحح مطبع نے یہ تعمق نظر
نظرثانی فرما کر طرز مناسب پر عبارت قصہ کو
آراستہ کیا'' ۔

اسی عبارت کے بعد تمت ہے اور پھر مطبع کی طرف سے یہ
اعلان :

''تہذیب و ترتیب اس کی عبارات و محاورات کی بصرف
زر خطیر مطبع ہوئی اور جناب مولوی حافظ سید محمد
عبداللہ صاحب بلگرامی نے یہ دماغ سوزی بہ ایمائے
جناب منشی نولکشور صاحب سی ۔ آئی ۔ ای ۔ مرحوم
مالک مطبع گوارا فرمائی ہے اور بعد ازاں ماہر زبان
مولوی سید تصدق حسین صاحب رضوی مصحح مطبع نے
کمال سعی و عرق ریزی کے ساتھ آخروں نظر سے اس کو
زیادہ آراستہ کیا ہے'' ۔

اشک کی تمہیدی عبارت اور لکھنوی نسخے کے خاتمے کی عبارت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں ۔ اشک نے داستان امیر حمزہ اُن انگریزوں کے لئے لکھی ہے جو اردوئے معلیٰ کے مبتدی طالب علم تھے ۔ اسی مقصد کے ماتحت اُن کے قصے کی زبان آسان ہے ۔ اس کے برخلاف لکھنوی نسخے میں اشک کے نسخے کی ''تعقید عبارت،، رفع کرنے اور ''عبارت قصہ کو آراستہ کرنے،، پر زور دیا گیا ہے ۔ چنانچہ اشک کی داستان اور نظرثانی کے بعد لکھنؤ میں چھپی ہوئی داستان کے درمیان بھی امتیازی فرق ہیں ۔ اشک کے یہاں سادگی اور تعقید ہے اور سید محمد عبداللہ اور سید تصدق حسین والے نسخے میں آراستگی اور تکلف ۔ ہمارا تجزیہ آگے چل کر اسی اجمال کی وضاحت کرے گا ۔ اس فرق کے علاوہ بھی دونوں نسخوں کے مطالعے کے بعد جو امتیاز نظر کے سامنے آتے ہیں اُن کی طرف اشارہ کرنا بھی اس مطالعے اور تجزیے کا مقصود ہے ۔

یہ فرق کیا کیا ہیں اور کس کس طرح نمایاں ہوئے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے دونوں داستانوں کے اُن ابتدائی حصوں کا مطالعہ کیجئے جن کا عنوان اشک والے نسخہ میں ہے ''ابتدائے دفتر نوشیروان،، اور لکھنوی نسخے میں آغاز داستان ۔

پہلے اشک کی عبارت پڑھئے :

''نامہ آغاز داستان امیر حمزہ نامدار کشورستان عم رسول آخر الزماں اس طرح ہے کہ بیچ سر زمین ایران کے ملک مدائن میں ایک بادشاہ قباد کامراں نامی اس قدر شجاع و عادل، رعیت پرور تھا کہ اُس کے عمل میں ہر چند غریب و فقیر اپنے اپنے گھر میں غنی تھا ۔ ظلم اور جور کا اس کے شہر میں کہیں نام اور نشان نہ

تھا، مگر عدل اور انصاف کہ اُس کے دور میں خلقت آسودہ و بے خطر تھی - کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا - اُس کے عدل میں باگ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے - اس بادشاہ کے پاس چالیس وزیر تھے کہ جن کی شمیم عقل اس گلشن سلطنت کو ہمیشہ خوشبودار رکھتی تھی - ان وزیروں کے سوا سات سے حکیم اور رمال اور سات ہی سے ندیم صاحب کمال - چار سے پہلوان کرسی نشین، تین سے بادشاہ تاجدار، دس لاکھ سوار، چالیس ہزار غلام زریں کمر و زریں کلاہ مغرق بجواہر، اس بادشاہ کی خدمت میں روز و شب حاضر رہتے تھے- سردار سب وزیروں میں ملک القش نامی شخص تھا کہ اس سے بیشتر بادشاہ کو امور سلطنت میں مشورہ ملتا تھا - اسی شہر میں ایک حکیم مرد مسلمان اولاد میں حضرت دانیال پیغمبر کے، بخت جمال نامی رہتا تھا - اُس کو علم رمل میں اس قدر معلومات تھی کہ القش وزیر بھی اکثر اُس کے زائچے کے علم کو سیکھنے لگا - کئی ایک دن میں باہم یہ دوستی بہم پہنچ ئی کہ ایک روز بن دیکھے چین نہ ہوتا - بعد کتنے دنوں کے ایک روز القش بطور ہمیشہ خواجہ بخت جمال کے پاس آیا اور کہا کہ آج میں نے آپ کی خاطر قرعہ ڈالا تھا - اُس میں صورت خوف و خطر کی نظر آئی کہ وہ خوف چالیس دن تک رہے گا - پس لازم ہے آپ اتنے دن گھر سے پاؤں باہر نہ رکھئے کہ خطرہ جان کا ہے اور اعتبار کسی کا نہ کیجئے - بندہ بھی ان روزوں کے بعد آن کر قدم بوس ہوگا - یہ کہہ کر اپنے گھر کی راہ لی - یہاں بخت جمال گھر کے دروازے کو بند کر کے ایک کونے میں بیٹھ کر لگا گننے تا کہ انتالیس دن بخیر و خوبی گزر گئے- چالیسویں دن صبح اٹھ کر غسل کیا اور اُجلے کپڑے پہن کر عصا ہاتھ میں لیا کہ آج آپ چل کر القش وزیر سے ملاقات

کیجئے کہ اپنے تئیں اس شہر میں سوا اُس کے اور کسی سے واسطہ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر گھر سے نکلا اور وزیر کے گھر کی طرف چلا۔ آدھی راہ طے کی تھی۔ باعث سے دھوپ کی گرمی کے ایک درخت کے تلے آن کر کھڑا رہا۔ دیکھا تو وہاں ہوا کا مکان ہے۔ کہیں کسی آدمی کا اپنے سوا نام نہیں۔ از بسکہ وہاں کسی وقت میں عمارت تھی، ٹوٹی ٹوٹی حویلیوں کے کچھ کچھ نشان باقی رہ گئے تھے۔ اُس میدان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو اُس کو خوش آئی ایک درخت کے نیچے ٹہلنے لگا اور جی میں کہا کہ یہ مکان کئی برس سے ویران پڑا ہے اور اب تابع ملک القش وزیر کے ہے۔ اُس نے بھی آباد نہ کیا۔ اگر یہ بسے تو اس سے بہتر مکان اور لب دریانہ نکلے۔ یہ تصور کر کے ایک بارہ دری کا ٹوٹا دروازہ تھا اُس میں جا کر اندر ایک دالان کے دیکھا تو داہنی طرف ایک کوٹھری ہے، لیکن دروازہ اینٹوں سے چنا ہے۔ بخت جمال نے عصا کی نوک سے اینٹوں کو گرا کر جی میں کہا اس کے اندر جا کر دیکھئے کہ کیا ہے۔ اس کوٹھری کے اندر جا کر دیکھا تو ایک کونے میں چھوٹی سی کھڑکی ہے اور اُس میں قفل لگا ہوا ہے پر زنگ نے اسے ایسا کھایا ہے کہ لوہے میں کچھ باقی نہیں ہے۔ ھاتھ سے زور کر کے اُس قفل کو توڑ ڈالا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو کچھ سیڑھیاں سی نظر آئیں۔ نیچے ایک تہ خانہ تھا۔ ان سیڑھیاں سے اتر کر اُس کے اندر گیا اور اُس میں دیکھا کہ سات گنج مال کے ھیں، شداد نے کسی وقت میں یہاں دفن کئے تھے......"۔

اس کے بعد قصہ اس طرح آگے چلتا ہے کہ بخت جمال یہ خزانہ دیکھ کر اس کی خبر القش کو کرتا ہے اور اُسے تہ خانے

میں لا کر اُس گنج پنہاں کا نظارہ کراتا ہے ۔ خزانہ دیکھ کر القش کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ افشائے راز کے خوف سے بخت جمال کو قتل کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے ۔ اُس کی منت سماجت کی ذرا پروا نہیں کرتا ۔ بخت جمال کو یقین ہو جاتا ہے کہ القش کا فیصلہ اٹل ہے تو وہ راضی برضا ہوکر القش کو کچھ وصیتیں کرتا ہے ۔ القش بخت جمال کو قتل کر کے تہخانے میں دفن کر دیتا ہے ۔ حویلیوں کی از سر نو تعمیر کا انتظام کرتا ہے اور بخت جمال کی وصیت کے مطابق اُس کے گھر جاتا ہے ۔ داستان کا یہ ٹکڑا اشک نے اس طرح ختم کیا ہے :

''القش بموجب وصیت خواجہ ایک دو سے روپے لے کر بخت جمال کے گھر گیا اور جو جو وصیت تھی سب کہی اور کہا یہ روپے اپنے خرچ میں لاؤ اور اس کی طرف کا کچھ غم نہ کھاؤ ۔ میں نے اُس کو تجارت کی خاطر چین بھیجا ہے ۔ یہ کہہ کر اپنے گھر گیا ۔ بعد کئی دن کے جب وہ باغ تیار ہوا القش نے اُس کا نام باغ بیدار رکھا ۔ واللہ اعلم بالصواب'' ۔

اب دیکھئے کہ لکھنوی نسخے میں داستان کا یہ ٹکڑا کس طرح بیان کیا گیا ہے :

بسم اللہ الرحمان الرحیم

''واقعہ نگاران رنگین تحریر، مورخان شیرین تقریر، نو کنندگان افسانۂ کہن، یاد دہندگان دیرینہ سخن، یوں بیان

کرتے ہیں کہ سر زمین ایران، جنت نشان میں ملک مدائن کا ایک شہنشاہ تھا، قباد کامران نام ۔ رعیت پروری میں لا جواب اور عدالت گستری مین نظیر اُس کا نایاب ۔ اور اُس بادشاہ جم جاہ کے چالیس وزیر باعقل و دانش صاحب تدبیر اور سات سو حکیم کہ افلاطون و ارسطو اُن کے سامنے طفل دبستان تھے ۔ سب کے سب عقل و کیاست و فہم و فراست میں یکتائے جہاں تھے ۔ ہر ایک علوم حکمت و ہندسہ و رمل و جفر و نجوم میں جالینوس و اقلیدس و فیثا غورث کو خطاب کے لائق نہ جانتا اور سو ندیم کہ علم ادب و علم مجلس میں ہر متنفس اُستاد قدر داناں اور چار ہزار پہلوانان کہ اگر سام و نریمان و رستم و زال ان کے روبرو آتے تو سپر عجز کی میدان پہلوانی میں پھینک کر حلقۂ شاگردی گلے میں لٹکاتے ۔ اور تین سو بادشاہ تاجدار کہ ہر ایک بجائے خود کوس لمن الملک بجاتا تھا، اُس کے باج گزار تھے، سر اطاعت خم کئے ہوئے تابعدار تھے اور دس لاکھ سپاہی کینہ خواہ اور چالیس دستۂ غلامان زریں کمر مرصع مغرق بہ جواہر، اس بادشاہ کی مجلس ارم فردوس تزئین میں حاضر رہا کرتے ۔ خدمت گزاری میں چست و چالاک جان نثاری کا دم بھرا کرتے ۔ اور اسی شہر میں ایک حکیم خواجہ بخت جمال نامی، اولاد میں حضرت دانیال پیغمبر علی نبینا و علیہ الصلواۃ و السلام کے مقیم تھا، علم و حکمت و رمل و نجوم و جفر میں یادگار حکمائے سلف بے مثل و ندیم ۔ ملک القش نامی وزیر شاہ نے

اکثر اس کے احکام کو آزمایا اور بہ تمنائے تمام زانوئے شاگردی اس کے روبرو تہہ کیا اور ایسا معتقد و گرویدہ ہوا کہ ایک دم جدائی اس کی گوارا نہ کرتا ۔ چند روز کے عرصے میں القش نے علم رمل میں ایسی مہارت پیدا کی اور وہ دستگاہ بہم پہنچائی کہ خواجہ کا شاگرد رشید مشہور ہوا اور شہرہ اس کا دور دور ہوا ۔ ایک دن اس نے خواجہ سے کہا، شب کو بے شغلی سے دل جو گھبرایا میں نے تمہارے واسطے قرعہ پھینکا ۔ شکلوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اختر تمہارا خانۂ نحوست میں ہے، چنانچہ گردش تمہاری قسمت میں ہے ۔ چالیس روز تک اسی خانہ میں رہے گا ۔ پس اتنے دن گھر سے قدم باہر نہ رکھئے گا اور کسی کا اعتبار نہ کیجئے گا، حتیٰ کہ میں بھی اتنے دنوں تک سنگ صبر اپنی چھاتی پر دھروں گا، ملاقات آپ سے نہ کروں گا ۔ خواجہ القش کے فرمانے کے بموجب اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے عزلت گزیں ہوا ۔ دوست آشنا سے ترک ملاقات کر کے گوشہ نشین ہوا ۔ جب انتالیس دن خیریت سے گزر گئے، ایام نحوست و دلدر سر سے اتر گئے، چالیسویں دن خواجہ سے نہ رہا گیا ۔ بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا ۔ عصا ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلا کہ القش وزیر سے مل کر ملاقات کیجئے؛ اپنی صحت و عافیت سے اس کو مژدہ دیجئے کہ سوائے اس کے اس شہر میں کوئی اپنا یار وفادار نہیں ہے، دل جو محبت شعار نہیں ہے ۔ اتفاقاً شاہراہ کو چھوڑ کر ویرانہ کی طرف جا نکلا چونکہ گرمی کا موسم تھا تمازت آفتاب سے بے تاب ہو کر

ایک درخت سایہ دار کے نیچے بیٹھ گیا ۔ ناگاہ ایک عمارت عالی شان سامنے سے نظر آئی مگر چار دیواری اس کی گر گئی تھی ۔ جی میں جو آیا ٹہلتے ٹہلتے اس طرف بڑھا ۔ دیکھا کہ اکثر مکان مسمار ہوگئے ہیں، دالان ٹوٹے پڑے ہیں لیکن ایک دالان قائم ہے، مثل دل عاشقان پریشان سنسان، اور اس دالان میں ایک کوٹھری کا دروازہ اینٹوں سے تیغا کیا، صحیح و سالم ہے ۔ خواجہ نے اینٹوں کو جو ہٹایا دست راست کی طرف ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا مگرمقفل ۔ خواجہ نے چاہا کہ کسی اینٹ پتھر سے کھولوں، تھوڑی زور آزمائی کروں ۔ اس ارادہ سے اس میں ہاتھ لگایا ۔ ہاتھ لگاتے ہی کھل کر گر پڑا ۔ خواجہ نے بڑھ کر اس کے اندر قدم رکھا ۔ ایک تہخانہ دیکھا ۔ اس میں سات گنج زر و جواہر بیش بہا کے شداد کے جمع کئے ہوئے دفن تھے ۔

اس کے بعد کی تفصیلات لکھنوی نسخہ میں بھی وہی ہیں جو اشک والے نسخے میں ۔ یعنی خواجہ خبر سنانے کو فوراً القش کے پاس گیا اور اسے خزانے کی خبر سنائی ۔ یہ خبر سن کر القش خواجہ کے ساتھ خزانہ تک آیا اور اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اخفائے راز کے خوف سے خواجہ کو قتل کردیا ۔ خواجہ کی وصیت کے مطابق اس کے گھر جا کر اس کے گھر والوں کو سمجھا بجھا دیا۔ اس نسخہ میں قصے کا یہ ابتدائی حصہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

''حکم کی دیر تھی ۔ فی‌الفور داروغہ نے معمار مزدور سنگ تراش شہر سے بلا کر مدد جاری کی ۔ چند روز

کے عرصے میں چار دیواری مع باغ بنگلہ تیار ہوئی۔ الغش دیکھ کر مسرور ہوا ۔ نام اس کا باغ بیدار رکھا اور خواجہ بخت جمال کے گھر میں جاکر وصیت خواجہ کی بیان کی اور بہت تسلی اور تشفی دی ۔ اور بہت روپیہ دے کر کہا کہ تم اس کو اپنے خرچ میں لاؤ، پھر جب ضرورت ہوگی امداد کی جائے گی، تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ خواجہ کو میں نے تجارت کے واسطے چین کی طرف بھیجا ہے ۔ بہت جلد وہاں سے منفعت اٹھا کر پھر آتا ہے ۔ یہ کہ کر گھر کی راہ لی ۔ اصل حقیقت دل میں رکھی ۔''

داستان امیر حمزہ کے ان دونوں نسخوں کے ابتدائی حصوں کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا جو بدیہی اور سیدھے سادے نتیجے نکلتا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) قصے کے اصل مولف اور اس پر نظرثانی کرنے والوں میں اس حد تک اتفاق اور اتحاد ہے کہ قصہ کو آراستہ و پیراستہ کرتے وقت بھی لکھنؤ والوں نے واقعات کے اہم اجزا میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اس کے ضروری عناصر کو جوں کا توں قائم رکھا ہے اور اسی لئے قصے کے ناموں اور ان ناموں سے تعلق رکھنے والے خصائص کو بھی حتی الامکان برقرار رکھنا ضروری سمجھا ہے ۔

(۲) لیکن قصے کے اہم اور بنیادی اجزا میں اپنے مذاق کے مطابق کمی بیشی قدم قدم پر کی ہے اور اس لئے پڑھنے والے کے سامنے کرداروں اور ماحول کی جو تفصیلات آتی ہیں ان کی جزئیات میں اسے جا بجا فرق نظر آتا ہے ۔

(۳) اشک کے قصے میں بیان کی سادگی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے - اسی سادگی نے اس میں وہ چیز پیدا کردی ہے جسے لکھنوی داستان سرؤں نے تعقید کہا ہے اور جسے دور کرنے کی طرف پوری توجہ صرف کی ہے - لیکن اس سلسلے میں دو باتیں پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں - پہلی تویہ ہے کہ اشک کی عبارت میں جو تعقید نظر آتی ہے وہ اس دور کی نثر کی خصوصیت ہے اور حیدری اور میر امن کی عبارتیں بھی اس سے خالی نہیں اور دوسری یہ کہ اشک کی عبارت میں یہ تعقید حیدری اور میر امن سے کہیں زیادہ ہے - اور سچ پوچھئے تو اپنے آپ کو ایک خاص عہد کے اسلوب کی ان کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ کرلینا ہی میر امن کا وہ امتیاز ہے جس نے انہیں اپنے سب ہم عصروں میں برتری کا شرف دلوایا ہے -

(۴) لکھنؤ والوں نے اس تعقید کو دور کر کے نثر کی سادگی کا کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے بجائے جسے سہل ممتنع کہا جاسکتا تکلف اور تصنع کی راہ اختیار کی ہے - ان کے بیان میں رنگینی، ادبیت و شعریت، اظہار علمیت اور روایتی تشبیہات، استعارات اور علامات کی اتنی کثرت ہے کہ اس سے قصے کا فطری انداز متاثر و مجروح ہوا ہے - جن ٹکڑوں میں یہ فرق نمایاں ہوگئے ہیں ان کا اعادہ شاید بے محل نہ ہو :

اشک والے نسخے کی عبارت	لکھنوی نسخے کی عبارت
۱ - نامہ آغاز داستان امیر حمزہ نامدار کشورستان عم رسول آخر الزماں اس طرح ہے کہ بیچ سر زمین ایران کے ملک مدائن میں ایک بادشاہ قباد کامران نامی اس قدر شجاع، عادل، رعیت پرور تھا کہ اس کے عمل میں ہر غریب و فقیر اپنے گھر میں غنی تھا۔ ظلم اور جور کا اس شہر میں کہیں نام اور نشان نہ تھا، مگر عدل اور انصاف کہ اُس کے دور میں تمام خلقت آسودہ و بے خطر تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا اُس کے عدل میں باگ بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔	۱ - واقعہ نگاران رنگین تحریر و مورخان شیرین تقریر، نو کنندگان افسانۂ کہن و یاد دہندگان دیرینہ سخن یوں بیان کرتے ہیں کہ سر زمین ایران جنت نشان میں ملک مدائن کا ایک شہنشاہ تھا، قباد کامران نام۔ رعیت پروری میں لا جواب اور عدالت گستری میں نظیر اُس کا نایاب۔
۲ - اس بادشاہ کے پاس چالیس وزیر تھے جن کی شمیم عقل گلشن سلطنت کو ہمیشہ	۲ - اس بادشاہ جم جاہ کے چالیس وزیر با عقل و دانش صاحب تدبیر تھے اور سات سو حکیم

اشک والے نسخے کی عبارت

خوشبو رکتی تھی ۔ ان
وزیروں کے سوا سات سے
حکیم اور رمال اور سات
ہی سے ندیم صاحب کمال،
چار سے پہلوان کرسی نشین،
تین سے بادشاہ تاج دار
دس لاکھ سوار، چالیس
ہزار غلام زرین کمر و
زرین کلاہ مغرق بجواہر
اس بادشاہ کی خدمت میں
روز و شب حاضر رہتے تھے۔

لکھنوی نسخے کی عبارت

کہ افلاطون و ارسطو اُن
کے سامنے طفل دبستان تھے،
سب کے سب عقل و کیاست
و فہم و فراست میں یکتائے
جہاں تھے۔ ہر ایک علوم
حکمت و ہندسہ و رمل و
جفر و نجوم میں جالینوس و
اقلیدس و فیثاغورث کو
خطاب کے لائق نہ جانتا
اور سات سو ندیم کہ علم
ادب اور علم مجلس میں
ہر متنفس اُستاد
اور چار ہزار پہلوانان
کہ اگر سام و نریمان و
رستم و زال اُن کے روبرو
آتے تو سپر عجز کی میدان
پہلوانی میں پھینک کر
حلقۂ شاگردی گلے میں
لٹکاتے ۔ اور تین سو بادشاہ
تاجدار کہ ہر ایک بجائے
خود کوس لمن الملک بجاتا
تھا اُس کے باج گزار تھے،
سر اطاعت خم کئے ہوئے

اشک والے نسخے کی عبارت	لکھنوی نسخے کی عبارت
	تابعدار تھے۔ اور چالیس لاکھ سپاہی کینہ خواہ اور چالیس دستہ غلامان زرین کمر مرصع، مغرق بجواہر اس بادشاہ کی مجلس رشک ارم، فردوس تزئین میں حاضر رہا کرتے، خدمت گزاری میں چست و چالاک جاں نثاری کا دم بھرا کرتے۔
۳۔ دیکھا تو وہاں ایک ہو کا مکان ہے۔ کہیں کسی آدم کا اپنے سوا نام نہیں۔ ازبسکہ وہاں کسی وقت میں عمارت تھی۔ ٹوٹی پھوٹی حویلیوں کے کچھ نشان باقی رہ گئے تھے اس میدان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو اس کو خوش آئی ایک درخت کے نیچے ٹہلنے لگا اور جی میں کہا کہ یہ مکان کئی برس سے ویران	۳۔ نگاہ ایک عمارت عالی شان سامنے سے نظر آئی مگر چار دیواری اس کی گر گئی تھی۔ کچھ جی میں جو آیا تو ٹہلتے ٹہلتے اس طرف بڑھا۔ دیکھا کہ اکثر مکانات مسمار ہوگئے ہیں۔ دالان ٹوٹے پڑے ہیں، لیکن ایک دالان قائم ہے، مثل دل عاشقان پریشان سنسان اور اس دالان میں ایک کوٹھری کا دروازہ اینٹوں سے تیغا

اشک والے نسخے کی عبارت	لکھنوی نسخے کی عبارت
پڑا ہے اور اب تابع ملک القش وزیر کے ہے۔ اس نے بھی آباد نہ کیا۔ اگر یہ بسے تو اس سے بہتر مکان اور لب دریا نہ نکلے۔ یہ تصور کرکے ایک بارہ دری کا ٹوٹا دروازہ تھا اس میں جا کر اندر ایک دالان کے دیکھا تو داہنی طرف ایک کوٹھری ہے لیکن دروازہ اینٹوں سے چنا ہے۔	کیا صحیح و سالم ہے۔

تکلف، تصنع، آورد اور خصوصاً مبالغہ کا رنگ لکھنوی نسخہ کے طرز کی ایسی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی۔

۵۔ اشک کی عبارت میں عموماً طوالت کو دخل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشک نے واقعات کے بیان اور کرداروں کی گفتگو میں کسی قسم کے تکلف سے کام لینے کے بجائے بے تکلفی کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور یہ بات خواہ مخواہ طوالت کا باعث بن گئی ہے۔ لکھنوی نسخے میں بے جا طوالت کو ترک

کر کے اس میں موزونیت اور توازن پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے ۔ موزونیت اور توازن پیدا کرنے کی اس ارادی کوشش نے عبارات میں ایجاز و اختصار پیدا کر دیا ہے ۔ لیکن چونکہ لکھنوی مولفین کا اصل مقصود عبارت کی موزونیت، توازن اور آہنگ ہے اس لئے کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ اشک کے نسخے میں جہاں کہیں واقعات کو اختصار کے ساتھ روا روی میں بیان کیا گیا ہے وہاں لکھنوی نسخے میں طوالت اختیار کی گئی ہے کہ ایک مخصوص محل کا تقاضا بھی ہے ۔ یہ بات ان موقعوں پر خصوصاً زیادہ نمایاں ہے جہاں رزم و بزم کے مرقعے پیش کئے گئے ہیں ۔ آگے آنے والی مثالوں سے یہ بات واضح ہو گی کہ لکھنوی مولفین نے واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں پورا زور قلم صرف کیا اور ان مرقعوں کو ادبی اور شاعرانہ خصوصیات کا حامل بنایا ہے ۔

(۶) اشک کے نسخے اور لکھنوی نسخے میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اشک نے اپنی سادگی، بیان اور فطرت پسندی کے میلان کی بنا پر عموماً بات کہنے کا ایسا انداز اختیار کیا ہے جس میں پڑھنے والے کو عبارت میں جا بجا ربط و آہنگ کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ واقعات کے مرقعے دیکھ کر اور کرداروں کی گفتگو سن کر بہت سے موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی نہ کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے ۔ فقروں، جملوں اور عبارتوں میں جا بجا ایک ڈھیلا پن اور اس

کساؤ اور تناؤ کی کمی ہے جس کے بغیر عبارت میں
ترنم اور نغمگی پیدا ہونی ناممکن ہے ۔ فن کار کی
آخری نظر تصویروں کے رنگ کو پختگی کی جو دولت
لازوال بخشتی ہے اس سے یہ عبارتیں اکثر خالی نظر
آتی ہیں ۔ لکھنؤ کے مولفین نے اس کمی کے پورا کرنے کی
طرف پوری توجہ صرف کی ہے اور واقعات کے مختلف اجزا
میں باہمی ربط پیدا کرنے کے علاوہ جملوں اور فقروں
میں الفاظ کے دروبست کو ہر جگہ درست کیا ہے ۔ اور
یوں عبارت سڈول بھی ہوئی ہے اور سامعہ پر بھی
اس کا خوشگوار اثر پڑتا ہے ۔ یہ مقصد کہیں محض
ایک دو لفظوں کے اضافے اور تغیر سے حاصل ہو گیا ہے
اور کہیں پوری عبارت کو نئے سرے سے ایک نئے
سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اور اس کا
نتیجہ یہ ہوا ہے کہ واقعات کے سیاق و سباق میں
بھی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے ۔ آگے کی باتیں پیچھے اور
پیچھے کی باتیں آگے ہو گئی ہیں کہ کہانی پڑھنے
والے کے لئے قصے میں دلچسپی پیدا کرنے اور اس کی
افسانوی کشش اور تاثیر برقرار رکھنے کا یہی طریقہ تھا ۔

دونوں داستانوں کے اس فرق کی وضاحت کے لئے داستان کے
ابتدائی باب کے آخری حصے پر ایک نظر ڈالئے ۔ داستان کا یہ
ٹکڑا اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے کہ خواجہ کو قتل کر کے
القش عمارت اور باغ کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوا ۔ یہ ٹکڑا
اشک کی داستان میں اس طرح ہے :

. . . خنجر سے اور ہاتھ سے لہو دھو کے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کے اس طرف آیا اور کہا "اس مکان میں ہمارے واسطے ایک باغ تیار ہو اور جہاں وہ مال تھا اس کے گرد ایک چار دیواری سنگ مر مر کی بنے اور اس کو پاٹ کر ایک بنگلہ واسطے نشست کے موگرے کا بنے"۔ غرض ساتھ اس حکم کے معمار جہاں تلک حاضر ہوئے اور راج، پیش مزدور، سنگ تراش، بڑھئی، بیلدار، تبردار بلائے اور مدد لگائی کہ جلد وہ باغ تیار ہو. . . بعد کئی دن کے جب وہ باغ تیار ہوا النقش نے اس کا نام باغ بیداد رکھا۔ لکھنؤ والے نسخے میں اس کی بے ربطی کو یوں دور کیا گیا ہے :

. . . خنجر اور ہاتھ کا لہو دھویا۔ دولت دو روزہ کے واسطے اپنا ایمان کھویا۔ پھر سوار ہو کر اپنے گھر گیا۔ دل میں بہت خوش اور محظوظ ہوا۔ دوسرے دن مع تزک سوار ہو کر پھر اس مکان میں پہنچا اور اسے دیکھ بھال کر داروغہ کو حکم دیا کہ یہاں ہمارے واسطے ایک باغ تیار ہووے اور باغ کے گردا گرد چار دیواری سنگ مر مر کی بنے اور اس دالان کو پاٹ کر ایک بنگلہ فیروزے کا ہماری نشست کے واسطے بنایا جائے۔ اسباب گراں بہا نادر روزگار بہم پہنچا کے اس عمارت گردون منزلت میں بھجوایا جائے۔ حکم کی دیر تھی فی الفور داروغہ نے معمار، مزدور، سنگ تراش شہر سے بلا کر مدد جاری کی۔ چند روز کے عرصہ میں چار دیواری مع باغ

بنگلہ تیار ہوئی ۔ القش دیکھ کر مسرور ہوا نام اُس کا
باغ بیداد رکھا۔ ۔ ۔ ،،

لکھنوی نسخے کی عبارت میں بھی باتیں وہی کہی گئی ہیں جو اشک والے نسخے میں ہیں لیکن خط کشیدہ ٹکڑوں کے اضافے نے اس عبارت کو زیادہ مربوط، قرین قیاس اور قابل قبول بنا دیا ہے ۔ لیکن ان اضافوں کے ساتھ ساتھ لکھنوی نسخے کی عبارت میں بعض چیزیں کم بھی کر دی گئی ہیں ۔ مثلاً مکان کی مدد جاری کرنے کے لئے یہاں صرف معمار، مزدور اور سنگ تراش بلائے گئے ہیں ۔ اشک نے اس کے مقابلے میں زیادہ اہتمام سے کام لیا ہے اور معمار، مزدور اور سنگ تراش کے علاوہ راج، بڑھئی بیلدار اور تبردار بھی مہیا کئے ہیں ۔ بظاہر اشک اس اہتمام میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں ۔ لکھنوی مولفین کے حق میں البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُنہوں نے غیر ضروری تفصیلات سے احتراز ضروری جانا ہے ۔

(ے) لکھنوی نسخے کی ایک اور خصوصیت جو اُسے اشک کے نسخے کے مقابلے میں نمایاں کرتی ہے یہ ہے کہ اس کے مولفین نے تہذیبی اور مجلسی لوازم کی طرف خاص توجہ کی ہے ۔ یہ بات کتاب کے دوسرے حصوں کو پڑھ کر زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے لیکن اُس ابتدائی ٹکڑے میں بھی جسے ہم نے دونوں تالیفات کے فرق کی صراحت کی بنیاد بنایا ہے، اشارتاً موجود ہے ۔ مثلاً قباد کامران کے ندیموں کے لئے اُنہوں

نے ''علم ادب و علم مجلس'' کی صفات سے مزین ہونے کی شرط لگائی ہے ۔ چنانچہ لکھنوی نسخے کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قصے کے افراد جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو برابر ان تہذیبی اور مجلسی آداب اور حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں ۔

داستان کے تمہیدی حصوں کو پیش نظر رکھ کر اشک اور لکھنوی مؤلفین کے اسلوب فکر اور انداز بیان کا فرق نمایاں کرنے میں میں نے کسی قدر طول کو اس لئے دخل دیا ہے کہ داستان کے باقی حصوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ چیزیں خود بخود ابھرتی اور نمایاں ہوتی رہیں اور پڑھنے والے اگر دونوں نسخوں کو تقابلی نظر سے پڑھیں تو انہیں یہ اندازہ کرنے میں سہولت ہو کہ دونوں داستانوں کے تقریباً سب حصے اسالیب کے اس فرق کے حامل ہیں اور دونوں نسخے مصنفوں کے مخصوص ماحول اور ان کے مزاج کے علاوہ ان مقاصد کی وضاحت اور ترجمانی کرتے ہیں جنہیں پیش نظر رکھ کر ان کی ترتیب و تالیف ہوئی ہے ۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارتاً یہ بات کہی تھی کہ لکھنوی مؤلفین کی کوشش ہر جگہ یہ رہی ہے کہ وہ واقعات بیان کرتے وقت پڑھنے والوں کو اُن کے اخلاقی پہلوؤں کی طرف ضرور متوجہ کریں لیکن اُس موقع پر اس خیال کی وضاحت کے لئے جو مثال دی تھی اُسے دیکھ کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ القش کے متعلق یہ کہنا کہ اُس نے دولت دو روزہ کے لئے اپنا ایمان کھویا ایک رواروی کی بات ہو سکتی ہے ۔ لیکن کتاب کے آئندہ حصے اس احتمال

کی تردید کرتے ہیں اس لئے کہ مؤلفین کے اس رجحان کا عکس آن میں زیادہ یقین کے ساتھ موجود نظر آتا ہے ۔ میں اس جگہ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں ۔ یہ مثال قصے کے اُس تمہیدی حصے کے چند صفحوں بعد کی ہے جسے میں نے اب تک تجزیہ کےلئے منتخب کیا تھا ۔ قصہ اس تمہیدی حصے کے بعد یوں آگے چلتا ہے کہ خواجہ بخت جمال کے مرنے کے بعد جب آن کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو خواجہ کی وصیت کےمطابق آس کا نام بزر جمہر رکھا جاتا ہے ۔ بزر جمہر بڑا ہو کر اپنے باپ کے علم میں مہارت حاصل کرتا اور یہ بات دریافت کر لیتا ہے کہ القش نے آسے قتل کیاہے ۔ اس دوران میں القش بادشاہ قباد کو اپنے باغ میں دعوت دیتا ہے اور بڑے اہتمام سے محفل جشن ترتیب دیتا ہے ۔ پھر رفتہ رفتہ آس کے مزاج میں زیادہ دخیل ہوتا جاتا ہے ۔ القش بزر جمہر کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر آسے گرفتار کرتا اور اس کے قتل کا حکم دیتا ہے ۔ لیکن مشیت آسے محفوظ رکھتی ہے ۔ اسی زمانے میں بادشاہ ایک خواب دیکھتا ہے اور سب نجومی اور رمال آس کی تعبیر بتانے میں عاجز رہتے ہیں ۔ آس موقعے پر القش کو بزر جمہر کا خیال آتا ہے اور وہ آسے تلاش کر کے بادشاہ سے آس کا ذکر کرتا ہے ۔ چنانچہ بادشاہ بزر جمہر کو اپنے دربار میں طلب کرتا ہے ۔ قصے کے اس حصے کو اشک نے 'داستان پہلی، قرار دیا ہے اور آس کا یہ عنوان قائم کیا ہے :

"بزر جمہر کے القش پر سوار ہو کر باشاہ کے پاس جانے اور اپنے باپ کا عوض خون لینے میں"

اس عنوان سے پہلے اشک نے صرف ایک عنوان قائم کیا ہے

اور اُس کے الفاظ یہ ہیں :

بیان تولد ہونا بزر جمہر کا اور جاماس نامی سے احوال
دریافت کرنا اپنے باپ کے مارے جانے کا،،

التمش اور بزر جمہر کے حالات اسی عنوان کے تحت دو ضمنی سرخیوں کے بعد بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف لکھنوی مؤلفین نے اُس حصے تک پہنچنے سے پہلے، جس کا ذکر میں اب کرنے والا ہوں، واقعات کو تین حصوں میں الگ الگ عنوان قائم کر کے بیان کیا ہے اور یوں قصے میں ربط و تسلسل قائم رکھنے کے میلان کی وضاحت کی ہے۔ یہ تینوں عنوان لکھنوی نسخے میں ترتیب وار یوں ہیں :

(۱) داستان بزر جمہر کے پیدا ہونے کی اور مضمون کتب
ہویدا ہونے کی۔

(۲) داستان مدعو ہونا بادشاہ کا التمش کے باغ بغداد میں اور
جشن ہونا اُس بوستان مینو سواد میں۔

(۳) گرفتار کرنا ملک التمش وزیر کا بزر جمہر سے تقصیر
کو اور رہا ہونا اُس کا پنجہ التمش سے اور جمع کرنا
بادشاہ کا وزرائے باتدبیر کو اور پوچھنا تعبیر کا اور
دینا تعزیر کا۔

ان تینوں عنوان میں قصے کے واقعاتی پہلو کو جو اہمیت

دی گئی ہے اُس سے قطع نظر عنوانوں کی ادبی معنویت اور خصوصاً قافیہ کا التزام خاص طور سے قابل توجہ ہے، اس لئے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوی مؤلفین نے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اپنی پوری توجہ کا مرکز بنایا ہے اور نظر ثانی میں پوری کاوش سے کام لیا ہے۔ یہی بات اُس عنوان اور اُس عنوان کے تحت آنے والی ابتدائی عبارت سے بھی نمایاں ہوگی جس طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں۔

اس طویل گریز کے بعد اگر پھر اُس ٹکڑے، کی طرف رجوع کریں جس کا عنوان اشک کے نسخے میں ''داستان پہلی،، ہے تو سب سے پہلے لکھنوی نسخے کے عنوان پر نظر پڑتی ہے اور اشک کے اور اس نسخے کے عنوان میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ لکھنوی نسخے میں داستان کے اس ٹکڑے کا عنوان ان الفاظ کو بنایا گیا ہے:

''بیان کرنا بزر جمہر کا بادشاہ کے خواب کو وقت خاص میں اور قتل ہونا القش وزیر کا اُس کے باپ کے قصاص میں،،

اس عنوان میں بھی وہی اہتمام اور ادبی لطف موجود ہے جو اس سے پہلے کے عنوانوں میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ لیکن ہمارا مقصود اصل میں وہ عبارت ہے جو اس عنوان کے نیچے آتی ہے اس لئے کہ اُسی کو پڑھ کر وہ نکتہ سامنے آئے گا جس کی وضاحت کے لئے میں نے داستان کے اس ٹکڑے کا انتخاب کیا تھا۔

آئیے، اب اشک اور لکھنوی نسخے کی ان عبارتوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دونوں کی امتیازی خصوصیات کا موازنہ

کریں - پہلے اشک کی عبارت دیکھئے :

''جوہریان بازار سخن اس داستان کے کہنے کا یوں بیان کرتے ہیں کہ جس وقت القش حضور میں فجر کو بادشاہ کی گیا، عرض کی کہ غلام کا ایک شاگرد ہے وہ اس خواب کو کہا چاہتا ہے - اور غلام نے کبھی کا کہہ دیا ہوتا، پر مجھ کو ان سب حکیموں کا امتحان لینا تھا - بادشاہ نہایت خوش ہوا اور فرمایا لوگ جاویں اور اس کو لے آویں'' -

اس سیدھی سادی بات پر لکھنوی مولفین نے کئی رنگ چڑھائے ہیں :

''دنیا دار مکافات ہے - بدلہ اکثر تو اسی عالم میں ہو جاتا ہے - اور اگر اتفاقات وقت سے یہاں پایۂ توقف میں رہا تو حشر پر معاملہ اس کا ہے - انسان کو لازم ہے کہ مآل کار پر نظر کرے اور دنیاوی دولت دو روزہ کی محبت میں دنیا کی رسوائی اور عقبیٰ کی عقوبت سر پر نہ لے - مصداق اس مقال کا اور مقتضیٰ اس حال کا قصہ القش بدکردار، ظالم نا ہنجار کا ہے کہ اپنے پاداش عمل کو پہنچا - محسن کشی کا ثمرہ ملا - واقفان قصص پاستانی و دانندگان واقعات زمانی خواب شب مداد کو زبان خامہ پر لاتے ہیں، صبح قرطاس میں تعبیر اس کی اس طرح فرماتے ہیں کہ دوسرے دن جو القش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا آموختہ بزر جمہر کا زبان پر لایا - حکم ہوا کہ اس کو حاضر کریں، جلد بارگاہ سلطانی میں لائیں'' -

جو بات اشک نے ذرا پھیلا کر چار پانچ سطروں میں کہی ہے اسے لکھنوی نسخے میں سمیٹ کر صرف دو سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے ۔ البتہ اس بات سے پہلے جو کئی سطر کی تمہید ہے وہ کئی حیثیتوں سے قابل توجہ ہے ۔ ان میں سے بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی ضمن میں اس سے پہلے بھی آ چکا ہے، یعنی یہ کہ لکھنوی مؤلفین سیدھی سادی باتوں کے بیان میں بھی ادبی اور شاعرانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور اس ادبی اور شاعرانہ انداز میں قافیے اور سجع کے التزام کے علاوہ الفاظ کے موزوں انتخاب کا خاصا اہتمام کرتے ہیں ۔ اس انتخاب میں ان کی توجہ عبارت کے واقعاتی سیاق و سباق کے ساتھ ایک مخصوص محل کے معنوی مطالبہ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کو ادبی بیان کی لازمی شرط سمجھ کر اختیار کرتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کے انتخاب اور حسن ترتیب میں عموماً وہ اس بات کا بھی لحاظ کرتے ہیں ۔ کہ اس ادبی عبارت آرائی میں کوئی نہ کوئی اشارہ ایسا موجود ہو جو آنے والے واقعات کی طرف رہنمائی کرے ۔ اس طرح کا اشارہ عموماً پڑھنے والے کے لئے ذہنی انبساط کا سبب بنتا ہے ۔ مثلاً اوپر والی عبارت کے اس جملے میں ''واقفان قصص پاستانی و دانندگان واقعات زمانی خواب شب مداد کو زبان خامہ پر لاتے ہیں، صبح قرطاس میں تعبیر اس کی اس طرح فرماتے ہیں،، خواب اور تعبیر کے الفاظ اس آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس باب میں بزر جمہر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے اس کے خواب کی تعبیر بتاتا ہے ۔

ان ضمنی باتوں سے قطع نظر ان ابتدائی جملوں کو لکھنوی

مؤلفین کے اس میلان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی اخلاق پہلو تلاش کرتے ہیں تو اشک کے نسخے کے مقابلے میں لکھنوی نسخے کا امتیاز واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے ۔

اشک نے داستان کا آغاز صرف یہ کہہ کر کر دیا ہے کہ ''جوہر یان بازار سخن اس داستان کے کہنے کا یوں بیان کرتے ہیں'' ۔ اس کے برخلاف لکھنوی نسخے کی تمہید ایک مختصر سا وعظ ہے ۔ ''دنیا دار مکافات ہے'' سے شروع ہو کر ''عقبیٰ کی عقوبت سر پر نہ لے'' تک پڑھنے والوں پر نہ صرف ایک اخلاقی نکتے کی صراحت کی گئی ہے بلکہ آدمی براہ راست مخاطب کر کے اُنہیں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان دنیا کی دولت دو روزہ کے عوض دنیا کی رسوائی اور عقبیٰ کی عقوبت مول نہ لے ۔ لکھنوی مؤلفین کا یہ اخلاقی میلان برابر قصے کے متن میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے، خصوصاً ہر نئے عنوان کی تمہید میں یہ واضح اور نمایاں ہوتا ہے ۔ کتاب کے چند عنوانات اور اُن کی تمہیدوں پر اسی خاص مقصد سے نظر ڈالیے :

۱ ۔ فلک شعبدہ باز انسان کو کس کس گردش میں لاتا ہے ۔ زمانۂ نیرنگ ساز آدمی کو طرح طرح کی نیرنگیاں دکھاتا ہے ۔ کبھی گدا کو بادشاہ بنا دیا، کبھی سلطنت کی سلطنت کو ایک دم میں مٹا دیا ۔ جن کو نان خشک میسر نہ آتی تھی وہ لنگر بانٹتے ہیں، خزانے لٹاتے ہیں، جو ایک ایک کوڑی کو محتاج

تھے وہ صاحب گنج و مال ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ ۱

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے

گہ نمک اس کو داغ کا پایا
گہ پتنگا چراغ کا پایا

کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب
اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب۲

۲ ۔ آسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو آس سے مایوس آمیدوار

جامع المتفرقین کی قدرت کا تماشا دیکھنا کہ جنگل میں نیا گل کھلا۳ ۔

۳ ۔ زمانے کی دو رنگی مشہور ہے شعبدہ باز کی نیرنگی ظاہر ظہور ہے ۔ کہیں عین شادی میں سامان غم مہیا ہوتا ہے، کہیں کمال یاس میں چہرۂ امید جلوہ نما ہوتا ہے ۔ چنانچہ بمصداق اس کے یہ داستان ہے۴ ۔

یہ تمہیدیں پڑھنے والے کے ذہن کو کسی نہ کسی اخلاق نکتے کی طرف متوجہ کرکے آسے خیر کا راستہ دکھاتی ہیں ۔

---

۱ ۔ آغاز داستان ص ۲۰ ۔
۲ ۔ آغاز داستان ص ۹۹ ۔
۳ ۔ آغاز داستان ص ۱۵۵ ۔
۴ ۔ آغاز داستان ص ۱۶۹ ۔

یوں اشک کی داستان میں بھی کہیں کہیں داستان کے دروبست میں اس طرح کی اخلاق باتیں کہی گئی ہیں ۔ لیکن اول تو بہت کم ہیں دوسرے ان کا انداز عموماً بڑا سرسری ہے ۔ لکھنوی نسخے کی عبارتوں کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مؤلفین نے اخلاق نکتے کی وضاحت میں خاصا اہتمام برتا ہے اور اس اہتمام کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ کہنے والوں نے جو بات کہی ہے اس میں ادبی اور شاعرانہ اسلوب اور لفظی و معنوی مناسبتوں اور رعایتوں کو ترک نہیں کیا ۔ اپنے خیال کے اظہار کے لئے، ذہن پر زور ڈال کر موزوں سے موزوں لفظ فراہم کئے ہیں اور انہیں اپنے مقصد کا پیامی بنایا ہے ۔ کہیں کہیں نثر کی جگہ اشعار کو بھی اظہار خیال کا وسیلہ بنانے کا میلان بھی اسی اہتمام اور انہماک کی نشانی ہے ۔

ادبی اور شاعرانہ لطف اور حسن بیان پیدا کرنے میں لکھنوی مؤلفین نے عموماً جس اہتمام اور انہماک کو دخل دیا ہے وہ ان کی داستان گوئی کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ اور یہی امتیازی خصوصیت باغ و بہار اور فسانۂ عجائب اور بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ[۱] کو ایک دوسرے سے الگ کرتی اور ان پر ایک مخصوص مزاج اور ماحول کا نقش ثبت کرتی ہے ۔ اشک کی داستان امیر حمزہ اور اس کے لکھنوی نسخے کا مقابلہ کرتے وقت بھی پڑھنے والے کو ماحول اور مزاج کے اس فرق کا اندازہ ہوتا ہے

۱ ۔ اس جگہ داستان امیر حمزہ سے میری مراد ۴۶ جلدوں کے اس سلسلے سے ہے جس کا سرسری ذکر اس مضمون کے شروع میں آ چکا ہے ۔

اور وہ دونوں نسخوں کے ایک سرسری مطالعے کے بعد بھی بات پوری طرح محسوس کر لیتا ہے کہ سادگی اور بے تکلفی ایک کا اور تکلف دوسرے کا رنگ خاص ہے اور یہ رنگ خاص اتفاق نہیں بلکہ دو مختلف ماحولوں کے ادبی اور معاشرتی مزاج کا عکس اور پرتو ہے - چنانچہ اب تک جو مثالیں دونوں نسخوں کے مختلف اجزا کی پڑھنے والوں کے سامنے آئیں اُن ہر مزاج کا یہ امتیازی نقش ثبت دکھائی دیتا ہے اور پڑھنے والا ان امتیازی نقوش کو ذہن اور دل کے گوشوں میں پوری طرح جاگزیں کرنے سے پہلے لکھنوی مؤلفین کی کم از کم اس بات کا قائل ضرور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے نظر ثانی کرتے وقت بھی اسلوب کی اُن روایتوں کو برتنے میں کسی طرح کی کوتاہی سے کام نہیں لیا جو اُن کے ماحول اور مزاج کا جزو بن گئی ہیں - فنی نقطۂ نظر سے یہ چیز بے حد قابل قدر ہے کہ مصنف، مؤلف (یا فن کار) اپنے فن کے معاملے میں اس حد تک مخلص ہو کہ اس کی خصوصیات کو برقرار رکھنے میں پوری ذہنی کاوش، قوت، توجہ اور انہماک سے کام لے - فکر، تخیل اور بیان کے نقطۂ نظر سے لکھنوی مؤلفین نے اس فنی امتحان کا مقابلہ کس طرح کیا ہے، اس کے لئے میں قصے کے دو تین ٹکڑے پیش کرتا ہوں :

اشک والا نسخہ۱	لکھنوی نسخہ۲
(۱) اس دن سے تمام عورتوں کا اعتبار بادشاہ کے نزدیک سے اٹھ گیا تھا - بلکہ اُن	(۱) مورخاں نے تحقیق سے لکھا ہے کہ شاہزادی فاجرہ مقتولہ کی اس حرکت کے

۱ - مطبوعہ میور پریس دہلی ۱۸۸۲ء

۲ - مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ دسمبر ۱۹۳۹ء

اشک والا نسخہ	لکھنوی نسخہ
کی صورت دیکھنی موقوف کی. اور کہا کہ اب ان کا منہ کبھی نہ دیکھوں گا۔ لیکن ایک عورت تھی دل آرام نامی، چنگ کے بجانے میں کمال رکھتی تھی اور فصاحت بادشاہ کو اس کی بہت بھاتی تھی۔ ١	سبب سے کل عورات کا اعتبار جاتا رہا تھا، سوائے دل آرام کے کہ قطع نظر حسن و عصمت و عفت کے چنگ نوازی میں کمال مشاق تھی، فن موسیقی میں نہایت طاق تھی، بادشاہ کے روبرو اور کوئی عورت نہ آنے پاتی تھی۔ ٢
(٢) ناگہاں بعد کئی دن کے بادشاہ واسطے شکار کے طرف ایک صحرا کے گئے۔ دل آرام اور خواجہ بزرجمہر اور بھی سردار ہمراہ٣۔	(٢) تفریحاً بادشاہ ایک روز بتقریب شکار سوار ہوا۔ باز، جرے، بہری، لگڑ، جگڑ، بٹیرا، گوھی، باہ، شکرہ، باشا، ترمتی، خج، دھونی، سینہ باز، شکاری کتے، چیتے، سیاہ گوش، قرول وغیرہ کا غول کا غول رکاب شاہی میں چلا٣
(٣) پہاڑ کی ترائی میں ایک میدان تھا۔ سبز گھاس سے	(٣) دارالسلطنت کے قریب ایک پہاڑ تھا۔ نہایت بلند،

١ - صفحہ ١٥
٣ - صفحہ ١٥

٢ - صفحہ ٢٠
٣ - صفحہ ٢٠

اشک والا نسخہ

کوسوں تک ایک تختہ زمرد کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ رنگ اُس پہاڑ کا اور اس کے اوپر سے چادریں پانی کی چھوٹتی ہوئیں ایک لطف دیتی تھیں اور وہ جو پہاڑ کے دامن سے دریا نکلا تھا اُس کے کنارے دونوں طرف ہرے ہرے دھانوں کے کھیت کا عالم جس طرح الماس پر تحریر زمرد کی ہوتی ہے۔ اُس دریا کے کنارے دونوں طرف پختہ گھاٹ سنگ مرمر کے بہت دور تک بنے ہوئے تھے۔ وہاں بجرے اور کشتیاں بادشاہ کی سواری کے واسطے رہتے تھے۔ رنگ برنگ کی کشتیاں اور بجرے اور نواڑی، فیل چڑھی، گھوڑ چڑھی، سنگ چڑھی، مور پنکھیاں، لچکے، پھولئے جل کر، پنواڑیں، پانی

لکھنوی نسخہ

آسمان سے پیوند، کمال دل کشا، عجب فرح افزا، باغبان قدرت نے گل ہائے بو قلموں موقع موقع پر لگائے۔ کدیور کاملہ نے اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ اس کوہ میں اگائے، کسی طرف دراز قامت سر بفلک اٹھائے تھے۔ کسی جانب درخت بیل دار خاکساری سے زمین پر بچھے جاتے تھے۔ اُس کے دامن میں ایک صید گاہ تھی مفرح، از بس پر فضا، بوٹا پتا گھاس کا رشک افزا، لالہ و گل جدول آب رواں، چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں، صبا گلزار درختوں کی خوشبو سے رشک نافۂ تاتاری تھی۔ نکہت خوش آیند غنچہ ہائے شگفتہ غیرت دہ شمیم باد بہاری تھی۔ درختوں پر فیض

اشک والا نسخہ	لکھنوی نسخہ
میں سب پر عجیب طرح کا عالم تھا۔	ترشح اور موافقت ہوا سے جوبن تھا۔ گھاٹے خود رو سے وہ مقام نمونۂ گلشن تھا۔ شکار کی وہ افراط کہ شمار میں نہ آ سکے۔ جانور دیکھ کر گھبرا جائیں نظروں میں نہ سما سکے۔ قاز، کلنگ، سرخاب، مرغابی، سارس، آسن ہری، قرقرے، قراقر، لوہار، سارنگ، تیکن، ڈھینک، لک لک سون، شیرازی، کاواک، بانوا وغیرہ بے شمار۔ علاوہ اس کے ایک طرف میدان میں ہرن، چیتل، پاڑھے، بارہ سنگے، پستین، گھوڑا اور نیل گؤ، چکارے قطار در قطار۔ چرند و پرند کی کثرت تھی۔ اور کوسوں تک گیاہ سبز سے فرش زمردیں کی صورت

۱ - صفحہ ۱۶۱۵ -

لکھنوی نسخہ

تھی اور پانی کی چادروں کی نہریں جاری تھیں۔ کہیں چشمے، کہیں بہتی ہوئی ندیاں، چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری تھیں۔ ایک طرف ایک دریا موجزن تھا، کوسوں کا پاٹ۔ پانی صاف شفاف، مثل دل پاکاں روشن تھا۔ کناروں پر آس کے ہرے ہرے دھانوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ بعض بعض مقام پر گل نیلوفر مزہ دکھا رہے تھے۱۔

اوپر کی عبارتوں میں سے داہنی طرف کی تینوں عبارتیں اشک کی ہیں اور بائیں طرف والی لکھنوی نسخے کی۔ دونوں نسخوں کی یہ تینوں عبارتیں قصے کے ایک ہی موقع اور محل سے اخذ کی گئی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل والی عبارتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی ایک میں دل آرام کی چنگ نوازی کا، دوسری میں بادشاہ کے شکار کو جانے کا اور تیسری میں شکارگاہ کا ذکر اور بیان ہوا ہے۔ لیکن موضوع کے اس اشتراک کے باوجود

۱ - صفحات ۲۰، ۲۱ -

اشک کی تینوں عبارتیں اسلوب اور انداز کے اعتبار سے لکھنوی مؤلفین کی عبارتوں سے بالکل مختلف ہیں ۔ یہ بات البتہ ہے کہ اشک کی تینوں عبارتیں انھیں خصوصیات کی حامل ہیں جو ہم اس سے پہلے اُن کی دوسری عبارتوں میں دیکھ چکے ہیں ۔ یعنی اشک نے ہر بات سادگی اور بے تکلفی سے بیان کی ہے اور یہ سادگی اور بے تکلفی کبھی کبھی عبارت میں تعقید اور بے ربطی اور بے ڈھنگے پن کا سبب بن گئی ہے، یہاں تک کہ عبارتوں کے وہ حصے بھی جن میں اشک نے اپنے بیان میں ادبیت اور شعریت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تعقید اور بے ربطی کے عیوب سے خالی نہیں ۔ اشک کی نظر صرف قصے پر ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہیں ۔ انھوں نے جزئیات و تفصیلات کے بیان میں بھی کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ بس جو چیز سامنے آئی یا جس کی طرف بغیر زیادہ کاوش کے ذہن منتقل ہوا اُسے عبارت میں شامل کر لیا ۔ اس چیز کی پروا نہیں کی کہ وہ اپنے واقعات کو ضروری مناسبات و متعلقات کے اعتبار سے مکمل کریں ۔

اس کے مقابلے میں لکھنوی نسخے میں جہاں ایک طرف عبارت کی چستی اور عبارت آرائی کے ساتھ ساتھ قافیہ پیمائی اور سجع کا التزام ہے، دوسری طرف اُس میں لفظی اور معنوی متعلقات و مناسبات کے معاملے میں بھی پورا اہتمام برتا گیا ہے ۔ اور ان مشترک خصوصیتوں کے علاوہ عبارتوں میں کچھ ایسی چیزیں بھی نمایاں ہیں جو اُن عبارتوں میں بہت کم تھیں جو اب تک مختلف باتوں کی وضاحت کے لئے پیش کی گئیں ۔

پہلی عبارت میں دل آرام کی چنگ نوازی کے کمال کے علاوہ

فن موسیقی میں اس کے کمال کا تذکرہ اور اس کے ساتھ اس کے حسن، عصمت و عفت کے محاسن کی تخصیص نے دل آرام کی کشش کے لئے جو جواز پیدا کیا ہے ، وہ ذہنی کاوش اور غور و فکر کے بغیر ممکن نہیں تھا ۔

دوسری عبارت میں ،،ناگہاں،، کے بجائے ''تفریحاً،، کی ترمیم اور شکاری جانوروں کی تفصیل بھی اسی توجہ اور انہماک، دقت نظر اور فنی خلوص کا نتیجہ ہے جس کا اظہار لکھنوی نسخے میں قدم قدم پر ہوتا ہے ۔

تیسری عبارت میں بہ یک وقت کئی باتیں ہیں ۔ اشک نے جس منظر کی تصویر کشی میں تھوڑی سی بےربط شاعری سے کام لیا ہے، لکھنوی نسخے میں اس کی طرف بےحد توجہ صرف کی گئی ہے ۔ جو منظر اشک کی عبارت کا موضوع ہے اسے لکھنوی نسخے میں محض ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے ۔ اس سے پہلے ایک طویل تمہید ہے ۔ اس طویل تمہید کو مضامین کے اعتبار سے کئی الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا ٹکڑا اس پہاڑ سے متعلق ہے جس کے ذکر سے اشک نے منظر نگاری کی ابتدا کی ہے ۔ اشک نے یہ کہنے پر اکتفا کی ہے کہ ''پہاڑ کی ترائی میں ایک میدان تھا،،۔ لکھنوی نسخے میں ''دارالسلطنت کے قریب ایک پہاڑ تھا،، کا ٹکڑا شامل کر کے منظر کو حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور پڑھنے والے کے سامنے منظر اور محل کا ایک واضح تصور پیش کیا گیا ہے ۔ اس تمہید کے بعد لکھنوی نسخے کے عام اسلوب کے مطابق پہاڑ کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں اور ان صفات کے بیان میں تصور آفرینی کے علاوہ عبارت آرائی کا پورا زور اور رنگینی ہے ۔ قافیے

اور سجع کے التزام میں بھی کوئی کمی نہیں ۔ پہاڑ کی صفت میں جو ٹکڑا داخل عبارت کیا گیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے :

''ایک پہاڑ تھا ، نہایت بلند، آسمان سے پیوند ۔ کمال دلکشا، عجب فرح افزا ۔ باغبان قدرت نے گل ہائے بوقلموں موقع موقع پر لگائے ۔ کدیور صفت کاملہ نے اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ اس کوہ میں اگائے ۔ کسی طرف دراز قامت سر بفلک اٹھائے تھے ۔ کسی جانب درخت بیل دار خاکساری سے زمین پر بچھے جاتے تھے ۔

اس کے بعد میدان کا حال شروع ہوتا ہے ۔ وہ میدان جس کی منظر کشی اشک نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ''ایک میدان تھا ، سبز گھاس سے کوسوں تک تختہ زمرد کا معلوم ہوتا تھا''۔ لکھنوی نسخے میں ایک شاعرانہ مرقع بن کر پڑھنے والے کی نظر میں کھبتا ہے :

''اس کے دامن میں ایک صید گاہ تھی مفرح، از بس پرفضا، بوٹا پتہ گھاس کا رشک افزا ۔ لالۂ و گل جدول آب رواں، چشمہ ہر ایک چشمۂ حیواں، صبا گزار درختوں کی خوشبو سے رشک نافۂ تاتاری تھی، نکہت خوش آیند غنچہ ہائے شگفتہ غیرت دہ شمیم باد بہار تھی ۔ درختوں پر فیض ترشح اور موافقت ہوا سے جوبن تھا ۔ گل ہائے خود رو سے وہ مقام نمونۂ گلشن تھا''

پہاڑ اور صید گاہ کے ذکر میں لکھنوی مؤلفین نے جو زور طبع صرف کیا ہے وہ الفاظ کی موزونیت، فقروں کی چستی اور قافیوں

کے ربط و آہنگ سے ظاہر ہے ۔ اور ان چیزوں کو دیکھ کر پڑھنے والا مؤلفین کے ذہن کی کاوش اور تخیل کی رسائی کی داد دیئے بغیر نہیں رہتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ ساری شاعری تصور کو اصلیت اور حقیقت سے دور لے جاتی ہے اور عبارت کو اس قدر دشوار بنا دیتی ہے کہ عام پڑھنے والا اس سے کوئی معنوی لطف و انبساط حاصل نہیں کرتا ۔ وہ ''اشجار گوناگوں بانواع مختلفہ،، اور ''نکہت خوش آیند غنچہ ہائے شگفتہ،، کی پرتکلف اور پر تصنع ترکیبوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے ۔ بلکہ ''کدیور صفت کاملہ،، اور ''فیض ترشح،، کے ٹکڑوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے تو شاید لغت سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔

اس سے اگلے ٹکڑے میں شکار کی افراط کے ساتھ جن بے شمار چرند و پرند کے نام لکھے گئے ہیں اُن میں معلومات کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے اور لکھنوی نسخے کے علمی اور معلوماتی انداز کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

آخری ٹکڑے میں وہی منظر پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے جو اشک والے نسخے میں کھینچا گیا ہے ۔ اس ٹکڑے میں لکھنوی مؤلفین نے اشک کے بنائے ہوئے مرقع کو ذرا بنا سنوار کر ایک دلکش اور قابل قبول صورت دی ہے ۔ اس ٹکڑے میں لفظی تکلفات سے احتراز کر کے سادہ منظر نگاری کو مطمح نظر بنایا گیا ہے، اس لئے پڑھنے والا یہ منظر جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے ۔

اشک کے نسخے کی عبارت کے مقابلے میں جب لکھنوی نسخے

کی عبارت کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنوی مؤلفین نے اپنی کتاب میں بہت سے موقعوں پر ربط و آہنگ پیدا کرنے اور عبارت کو ادبی اور شاعرانہ بنانے کی غرض سے اتنے اضافے کئے ہیں کہ یہ نسخہ بجائے خود ایک الگ تصنیف و تالیف معلوم ہونے لگتا ہے - ایسے موقعوں پر اصل اور نقل (یا نظرثانی) میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں میں کسی طرح کی مطابقت اور یک رنگی تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہے - اسی طرح کے اضافوں نے اس نسخے کی ضخامت اصل سے ڈیوڑھی کر دی ہے -

ہماری داستانوں میں داستان گویوں نے افسانوی دلچسپی کے علاوہ جن چیزوں سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے، اُن میں رزم و بزم کے مضامین، عشق و محبت کے مناظر اور ظرافت و مزاح کے عناصر کی جگہ عموماً نمایاں ہوتی ہے - یہ باتیں ہمارے سب اچھے داستان گویوں نے محسوس کی ہیں اور اپنے اپنے مخصوص ماحول اور معاشرتی مزاج اور ناظر کی پسند کے مطابق ان چیزوں سے اپنی کہانیوں کی دلکشی بڑھائی ہے - اشک کی داستان امیر حمزہ میں بھی انہیں عناصر کو دلچسپی کی بنیاد تصور کیا گیا ہے لیکن اشک اور لکھنوی مؤلفین کے اسلوب فکر، طرز تخیل اور انداز بیان میں جس طرح ہر موقعے پر سادگی و رنگینی، بےساختگی اور تکلف، فنی بے نیازی اور انہماک و توجہ کے عناصر کا غلبہ ہے اسی طرح رزم و بزم کی مرقع کشی، عشق و محبت کے بیان اور ظرافت اور مزاح کے صرف میں بھی دونوں کے مزاج اور مذاق کا فرق نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس فرق کا اظہار اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ لکھنوی نسخہ ایک ہی تالیف کا نقش ثانی

معلوم ہونے کے بجائے ایک علیحدہ اور منفرد تصنیف معلوم ہوتی ہے - اس بات کی وضاحت کے لئے چند مثالوں پر نظر ڈال لیجئے۔ سب سے پہلے دو ایسے مواقع دیکھئے جن میں دونوں مؤلفین نے رزم گاہ کے منظر کی تصویر کھینچی ہے - پہلا موقع سہیل یمنی اور امیر کی جنگ کا ہے - اشک نے داستان کے اس ٹکڑے کی تفصیل یوں بیان کی ہے :

"تمام رات دونوں لشکروں میں طیاری جنگ کی رہی - امیر اس شب یاروں کو ہمراہ لے کر شب بیدار رہے - عمرو عیار جام شراب کا ہاتھ میں لے کر لگا امیر کو پلانے - اس وقت شب مہتاب میں خیمہ کے رو برو وہ جو بڑی بڑی قناتیں تھیں کھول ڈالیں - فقط ایک نمگیر اطلس کا کہ اس میں بادلے کی جھالر لگی ہوئی تھی کلابتوں کی ڈوریوں سے طلائے الماس تراش استادوں پر کھڑا ہوا تھا - اس چاندنی رات میں میدان کا عالم اور ابتدائے برسات کی ہوا۔ مطلع صاف تھا لیکن کہیں لکے ابر کے سفید سفید چاند کی روشنی میں فلک پر معلوم ہوتے اور صدا دریا کی موج کی اور سنّاٹا ہوا کا اور لشکر کی دھوم، آواز کوس و نقارے کی آتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی - اس وقت امیر کو سرور شراب کا اور اس کی گلابی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی نمود، جیسے برگ گل پر رگ گل کا عالم ہوتا ہے، اس حالت میں عمرو کو فرمایا کہ اب تم جام اور شیشہ رکھ دو اور ہتھیاروں کو منگوا لو - عمرو نے اس وقت امیر کا معہ یاروں کے سلاح منگوایا اور لگے سجن

دینے ۔ غرض اسی طرح تمام رات گزری ۔۱

یہی بات لکھنوی نسخے میں اس طرح بیان ہوئی ہے :

”تمام رات دونوں لشکروں میں طبل و نقارہ بجا کیا ۔ امیر شب بیدار رہے اور جناب باری میں مصروف مناجات و استغفار رہے“ ۔ ۲

قصہ گو اور انشا پرداز کی حیثیت سے اشک میں موزونیت، توازن اور اعتدال کے احساس کی جو کمی ہے اس کا اظہار کسی نہ کسی طرح اُن مثالوں میں بھی ہوتا رہا ہے جو اب تک اُن کی داستان کی مختلف خصوصیات کے لئے پیش کی گئیں لیکن ان اہم اور ضروری خصائص قصہ گوئی سے وہ کتنے عاری ہیں، اس کا اندازہ اوپر کے دونوں ٹکڑوں کا مقابلہ کر کے کہیں زیادہ ہوتا ہے ۔ اشک کی یہ طویل تمہید جس میں اُنہوں نے منظر نگاری اور رنگینی تخیل کے جوہر دکھانے کے علاوہ اپنی شاعرانہ جولانیوں سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا ہے، حد درجہ بے محل بھی ہے اور کئی حیثیتوں سے توازن کے فقدان کی غماز بھی ۔ اُنہوں نے اپنی بات اس جملے سے شروع کی ہے :

”تمام رات دونوں لشکروں میں طیاری جنگ کی رہی“

اور اس اجمال کی تفصیل میں امیر کی شراب نوشی، 'اطلس کا نمگیرہ'، (جو بادلے کی جھالر، کلابتوں کی ڈوریوں سے مزین اور الماس کے استادوں پر کھڑا ہے) شب مہتاب، برسات کی خنک ہوا، آسمان پر بکھرے ہوئے لکہ ہائے ابر، موج دریا کا نغمہ شیریں،

---

۱ - صفحہ ۵۳ نسخہ اشک ۔

۲ - صفحہ ۵۸ لکھنوی نسخہ ۔

امیر کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی امود جوسی چیزیں شامل ہیں۔ سلاح کی طلبی اور ان پر سن لگانا محض روا روی کی چیزیں ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ ساری ''شاعری،، نہ صرف اس فضا کی ضد ہے جو صبح کو برپا ہونے والی جنگ کا پیش خیمہ ہونی چاہئے بلکہ امیر کے کردار پر ایک بدنما داغ ہے، اور اس قصہ گو میں قصہ گوئی کی صلاحیتوں کے خلاف ایک بین اور صریح شہادت۔ اس کے برخلاف لکھنوی مؤلفین کے احساس توازن کو دیکھئے جو لفظی اور معنوی تکلفات کو اپنا شعار سمجھتے اور شعریت، ادبیت اور عبارت آرائی کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ طبل و نقارہ کا ذکر اشک کی طرح انہوں نے بھی کیا ہے لیکن امیر کو بادہ نوشی میں مسرور و مخمور دکھانے کے بجائے مصروف مناجات و استغفار دکھایا ہے کہ یہی چیز فطری بھی ہے اور اس خاص محل اور کردار کی نوعیت کے اعتبار سے قابل قبول بھی۔ واقعہ نگاری اور منظر کشی کے لئے بھی انہوں نے اس محل کو قطعی ناموزوں جانا ہے اور اپنی تخیلی قوت کو بے محل صرف کرنے کے بجائے اسے وقعہ کے اگلے اور زیادہ اہم حصے کے لئے محفوظ رکھا ہے۔

صبح ہوتی ہے اور میدان کارزار گرم ہوتا ہے۔ اس کا نقشہ پہلے اشک کی نظروں سے دیکھئے:

''صبح کو نعمان بن منظر دس ہزار سوار لے کر میدان میں کھڑا ہوا۔ اس طرف سلطان صاحب قران امیر حمزہ نامدار ہزار سوار کی جمعیت ہمراہ لے کر تمام سلاح نبیوں کا

لٹکائے ہوئے، مرکب سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے اور طوق بن حران ہاتھ میں علم لیا ہوا، اس کا سایہ صاحب قران پر کیا ہوا ۔ دست راست امیر کے سلطان بخت مغربی سلاح جواہر اگار میں مغرق اور دست چپ کو سہیل اور اسی طرح پیچھے امیر کے مقبل وفادار دو ترکش قضاق ایک گھوڑے سے لٹکائے ہوئے اور ایک کمر بند سے کمان ہاتھ میں لئے ہوئے مستعد اور آگے جلو میں عمر و عیار پیک نامدار، خنجر گزار، چست و چالاک بنا ہوا، اس طرح آہستہ آہستہ جس وقت کچھ ایک کرن سورج کی نکلنی شروع ہوئی، اس وقت مقابل نعمان کی فوج کے جا کر کھڑے ہوتے۔ لیکن عمر نے اس قرینے سے صفیں استادہ کی تھیں کہ وہ ہزار سوار بھی چار ہزار سے کم نہ معلوم ہوتے تھے ۔ اور اس وقت ہلکا ہلکا خفیف سا کچھ ابر بھی آسمان پر چھایا ہوا تھا اور سبزہ میدان کا بھلا معلوم ہوتا ہوا۔ خنکی ہوا کی، نشان دونوں فوجوں کے لہراتے ہوئے ۔ سبزہ کی زرہ جوشن کی اور گھوڑوں کا ہنہنانا نقیبوں کی صدا، اس وقت سب منتظر ملکہ ہمائے تاجدار کھڑے تھے کہ ایک مرتبہ قلعہ کی طرف سے ایک سوار جواہر پوش نکلا ۔ گویا سراسر یہ مرکب جواہرات کے دریا میں غوطہ مارے تھا ۔ لیکن ایک نقاب سبز زمرد نگار منہ پر پڑا ہوا مع سپر، تلوار، خنجر، ترکش کمان مسلح اور ایک چوگان ہاتھ میں لئے ہوئے آیا ۔ مانند شعلۂ آتش منہ مسلمانوں کی طرف کیا اور آواز دی ”کہاں ہے خواہندۂ مغربی، آوے میدان میں کہ اس کا

کسب و ہنر دیکھ لوں،، ۔ ساتھ ہی اس کہنے کے امیر
نے خنگ نبی اسحاق کو ران میں گدگدایا ۔ مثل برق کے
میدان میں آیا اور برابر اُس کے آ کر کہا ''او معشوق!
دیکھوں تیرا کمال، جو یہ شہرہ تو نے پیدا کیا ہے،،
اس نے اشارہ کیا اپنے عیار کو ۔ اُس نے ایک گوئے میدان
میں ڈالا ۔ اُس معشوق نے چوگان کو گوئے سے آشنا کیا
اور میدان میں لے چلی ۔ امیر نے تامل کیا ۔ جب کہ
آدھے میدان میں گزر گئی تو امیر نے بھی چوگان عمر کے
ہاتھ سے لے کر سیاہ قیطاس کو میدان میں ڈالا اور برابر
آ کر چوگان گوئے کو مارا اور طرف میدان کے پھیرا ۔
اُس معشوقہ نے نقاب کھول کر سر پر ڈالا اور امیر کو
کہا ''میری طرف دیکھ،، ۔ جوں ہی نگاہ امیر کی اُس پر پڑی
تو واقعی ایک معشوقہ ہے کہ حسن و جمال میں لاثانی ۔
آفتاب اور ماہتاب اُس کے حسن کی تجلی کے آگے شرمندہ
ہیں ۔ ایک سکتہ کی حالت ہوگئی ۔ اس معشوقہ نے امیر
کی یہ حالت دیکھ کر گھوڑے کو جولان دیا اور پھر
چوگان سے گوئے کو لے چلی ۔ امیر نے دفعتاً ہوش میں
آ کر اپنے مرکب کو بھی ایڑ دی اور کہا ''او
علامہ! معلوم ہوا اسی طرح تو مردان عالم کو فریب
دے کر شرط جیت لیتی ہے ۔ لیکن میں ہرگز تیرے حسن
کا فریفتہ نہیں ہوا ۔ میرے ہاتھ سے کہاں جاسکتی ہے،،
یہ کہہ کر چوگان کو اس پر لائے اور میدان کی طرف
لے چلے ۔ ہر چند ہما نے چاہا کہ گوئے تک پہنچے
لیکن امیر لے ہی گئے اور فرمایا''اے ہما اب کیا کہتی ہے؟ !!،،

کہا ''ایک مرتبہ پھر آزمائیے''، امیر نے گوئے اس طرف پھینکا اور وہ اس دفعہ مثل ہوا کے لے چلی ۔ امیر نے پھر گھوڑا دبا کر گوے پھیری ۔ اُس نے دیکھا کہ حمزہ گوے کی طرف مصروف ہے ۔ بھاگی اور چاہا کہ بھاگ کر صف میں جاوے ۔ نظر امیر کی اس پر پڑی ۔ گوے اس پر چھوڑ کر اس کے برابر گئے اور کمر دے پکڑ کر گوے سمیت اُٹھا لیا اور لا کر عمرو کے حوالے کیا ۔ اُس نے کمند کو ہاتھ سے باندھ کر لشکر کی راہ لی۱ ۔

اب اس محل کی لکھنوی نسخے کی عبارت ملاحظہ کیجئے :

''جب شاہ خاور تخت فلک پر جلوہ افروز ہوا اور شعاع نورانی سے میدان زمین پر نیزہ بازی کرنے لگا، نعمان اپنے لشکر کو لے کر میدان میں نکلا ۔ پہلوانان صف شکن و فیلان تہمتن کا پراجمانے ہوئے عرصۂ وغا میں آ پہنچا ۔ سلطان ذی وقار صاحب قران روزگار امیر باوقار یعنی حمزۂ نامدار خود برسر، زرہ در بر، شمشیر در کمر، یوں مسلح ہو کر سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے ۔ نیزہ ہاتھ میں لیا ۔ جلو میں اصحاب و رفیق جان نثار ہوئے ۔ طوق بن حران نے علم کا سایہ صاحب قران پر کیا ۔ ہمائے اوج سعادت اپنے دام میں لیا ۔ دست راست سلطان بخت مغربی اور دست چپ کو سہیل یمنی سلاح جواہر نگر بدن پر سجے ہوئے بادۂ غرور شباب سے جام کاسۂ سر بھرے

۱ ۔ صفحات ۵۴، ۵۵ داستان امیر حمزہ، اشک ۔

ہوئے اور عمرو عیار پیک نامدار، خنجر گزار جگر فگار بکمال چستی و چالاکی گھوڑے کے آگے پھلانگیں مارتا خوش فعلیاں کرتا اور لشکریوں کو ہمت دلاتا، بڑھاوے دیتا چلا ۔ آن و بان سے، بڑی شوکت و شان سے خنداں خنداں گھوڑے کے آگے بڑھا ۔ مقبل وفادار کو اس دن امیر نے ہراول کیا ۔ وہی رسالہ ہزار سوار کا جو سہیل یمنی کے ساتھ مسلمان ہوا تھا مقبل کے ہمراہ کر دیا ۔ عمرو نے اس تدبیر سے صفیں قائم کیں کہ غنیم بھی اس لشکر ظفر پیکر کو دیکھ کر حیران ہوا ۔ پانچ چھ ہزار سپاہی کا امیر کے لشکر پر گمان ہوا ۔ دونوں طرف سے جب صف آرائی ہو چکی، مبارز طلبی کی جب نوبت پہنچی، امیر ہمائے تاجدار کے اشتیاق میں منظر شاہ کے مقابل کھڑے تھے ۔ شیر غراں کی طرح ہکارتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ ایک جوان نقاب زمردیں چہرے پر ڈالے سر سے پاؤں تک مع مرکب دریائے جواہر میں غرق، سپر، تلوار، خنجر و کمان، ترکش، نیزہ خطی دوش پر سنبھالے چوگان ہاتھ میں لئے رہوار کو خیز کیے اوجھیوں پر لایا ۔ خراماں خراماں میدان میں آیا ۔ امیر کی طرف دیکھ کر آواز دی کہ ''خواہندۂ ہمائے تاجدار کون ہے؟ میرے سامنے آوے ۔ یہی گوے یہی میدان ہے اپنا کسب و ہنر دکھلاوے،، ۔ امیر نعرہ سنتے ہی خنگ اسحاق نبی علیہ السلام کو برق کی طرح چمکا کر میدان میں آئے ۔ کاوا ایڑن پر لگائے، کبھی آڑانے، کبھی جماتے، آس اسپ خوش خرام کو معرکے میں لائے اور فرمایا کہ

او جوان ہوشیار ہو، ہمیں میدان ہمیں چوگن ہمیں گوئے۔
اس کے عیار نے گوئے کو میدان میں لا کر ڈال دیا اور اس معشوقہ نے گھوڑے کو ران سے گدگدا کر گوئے کو چوگان سے آشنا کیا۔ چاہتی تھی کہ گوئے کو لے جاوے، اپنی چالاکی اور استادی دکھاوے کہ امیر نے عمرو کے ہاتھ سے چوگان لے کر گھوڑے کو آگے بڑھا کر اس برق کردار کو آسن سے دبایا۔ چوگان کو سنبھال کر گوئے پر مارا۔ قوت خدا داد کا جلوہ دکھایا۔ اس معشوقہ نے دیکھا کہ ہاتھ سے بازی جاتی ہے۔ تمام شعبدہ بازی اور مشاقی خاک میں ملی جاتی ہے، جھٹ پٹ نقاب الٹ کر چہرۂ پرنور وا کیا۔ جمال جہاں آرا سے سطح میدان کو منور کر دیا، ترجمہ:

الٹ جو دیا رخ سے اس نے نقاب
زمیں پر دکھائی دیا آفتاب
ہوئی اس سے جب چشم حمزہ دو چار
ہوئے غرقۂ حیرت آئینہ وار

امیر تو دیکھ کر ششدر ہوگئے۔ صانع مطلق کی قدرت کا مشاہدہ کر کے متحیر ہوگئے۔ ہمائے تاجدار نے فرصت پا کر پھر گھوڑے کو جھچکارا اور چوگان کو گوئے پر لگایا۔ اس نے اپنی دانست میں گوئے کے لے جانے میں کوتاہی نہ کی تھی، کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی، لیکن امیر نے دل کو سنبھالا، لاحول ولا قوۃ پڑھ کر استقلال شہامت کو کام فرمایا۔ مرکب کو جولان کر کے کہا "ہم تیرا فریب اور چالاکی سمجھے اور تیری مکاری اور

مذاق سمجھے ۔ معلوم ہوا یوں ہی تو تو گوئے کو میدان سے لے جاتی ہے اور مردان عالم سے شرط جیت کر ان کے سروں کو قلعے کے کنگروں پر لٹکاتی ہے ۔ مگر کسی صاحب ہنر سے سابقہ نہ پڑا ہوگا، کسی مرد دلیر سے معاملہ نہ پڑا ہوگا۔ گوئے کو میدان سے یوں لے جاتے ہیں، دیکھ جوہر شجاعت و مردانگی یوں دکھاتے ہیں ۔ دیکھ! خبردار ہو، ہوشیار ہو ۔ میں گوئے کو میدان سے لے چلا اور خدا کے فضل سے میدان میرے ہاتھ رہا،،۔ یہ فرما کر گوئے کو میدان سے لے گئے، ہمائے تاجدار کو شکست فاش دے گئے ۔ ہرچند ہمائے تاجدار نے مکرر چوگان گوئے تک پہنچائی، اپنی چالاکی اور ہنروری دکھائی لیکن امیر سے کب سبقت لے جا سکتی تھی ۔ اس شیر بیشۂ شجاعت کے روبرو کب فروغ پا سکتی تھی ۔ امیر گوئے کو لے گئے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ ''اے ہمائے تاجدار! کہہ اب کیا کہتی ہے؟ کچھ اور حوصلہ باقی ہے؟،، اس نے کہا ''ایک مرتبہ اور امتحان کیا چاہیئے، عرصۂ کارزار کو گرم کر کے اپنے اپنے جوہر دکھایا چاہیئے،،۔

''امیر نے بموجب اس کے کہنے کے گوئے کو میدان میں پھینک دیا اور پھر چوگان سنبھال کر اس چستی و چالاکی کو کام فرمایا کہ پھر میدان دوبارہ جیت لیا ۔ ہمائے تاجدار نے دیکھا کہ بازی ہاتھ سے گئی، ہزاروں آدمی میں عزت و آبرو خاک میں ملی ۔ چاہا کہ گھوڑے کو ایڑ کر کے اپنے بھائی نعمان تک پہنچے میدان چھوڑ کر اپنے لشکر میں جا ملے ۔ امیر نے گھوڑے کو خیز

کر کے ھمائے تاجدار کا کمر بند پکڑ کے مرکب سے جدا کیا اور عمرو کی طرف گیند کی طرح پھینک دیا ۔ عمرو نے کمند کے لچھے سے ھاتھ اُس کے باندھ کر اپنے لشکر کی طرف رخ کیا ۔ ھمائے اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا،، ۱ ۔

اشک کے کھینچے ہوئے مرقعے کو دیکھ کر پڑھنے والا کئی باتیں محسوس کرتا ھے :

۱ ۔ اشک نے میدان کارزار کا تصور پیش کرتے ھوئے اس بات کی کوشش کی ھے کہ اس مخصوص محل اور واقعہ کے متعلق ساری باتیں وہ سیدھے سادے لفظوں میں بے تکلفی سے بیان کر دیں ۔ اس وقت انہوں نے یہ فنی نکتہ قطعی فراموش کر دیا کہ میدان کارزار کا نقشہ پیش کرتے وقت لکھنے والے کو اپنی تصویر میں ایسے رنگ بھرنے چاھئیں جو دیکھنے والے کے لئے جذباتی جوش اور ولولہ انگیزی کا سبب بن سکیں ۔

۲ ۔ میدان جنگ کی تصویر کشی کرتے وقت آنہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی ھے کہ پڑھنے والے کے سامنے وقت اور مقام کا صحیح تصور آ سکے ۔ یہ تصور قائم کرنے کے لئے آنہوں نے سورج کی کرن، ھلکے ھلکے خفیف ا ر، میدان کے سبزے اور ھوا کی خنکی کا ذکر کیا ھے ۔ اس کے باوجود کہ یہ جزئیات اُس وقت اور محل کے عین مطابق ھیں جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ھوئی تھیں، ان چیزوں کا ذکر اس لئے بے محل اور ناموزوں ھے کہ اس سے اُس بنیادی تاثر میں انتشار

۱ ۔ صفحات ۵۹، ۶۰ داستان امیر حمزہ، لکھنوی نسخہ ۲ ۔

پیدا ہوتا ہے جو رزم کے مضامین کے ساتھ مخصوص ہے ۔

۳ ۔ رزم گاہ کا یہ محل کچھ اس انداز کا ہے کہ ہمائے تاجدار کی موجودگی نے اس میں ایک ہلکا سا رومانی رنگ پیدا کر دیا ہے ۔ رزم گاہ میں ایک حسین عورت کا وجود ایک ایسا تضاد ہے جسے نباہنے کے لئے لکھنے والے کو تخیل اور بیان کی پوری احتیاط اور نزاکت سے کام لینے کی ضرورت ہے ۔ اشک نے اس تضاد کی نزاکت کا احساس کیے بغیر تصویر کے رومانی نقوش کو زیادہ ابھار دیا اور رزم گاہ کا ذکر پڑھنے اور سننے والے کے لئے ولولہ خیز ہونے کے بجائے خاصی حد تک ہیجان انگیز بن گیا ہے ۔

۴ ۔ ہیجان انگیزی کی اس کیفیت میں سامع یا قاری کے علاوہ امیر حمزہ بھی شریک ہیں ۔ ہمائے تاجدار جیسی ''معشوقہ'' کے ''حسن و جمال'' سے ''جس کے حسن کی تجلی کے آگے آفتاب و ماہتاب شرمندہ ہیں ۔ امیر پر بھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے گو وہ ''دفعتاً ہوش میں آ جاتے ہیں''۔ یہ کیفیت امیر کے کردار کی عظمت سے مطابقت نہیں رکھتی ۔

۵ ۔ اشک کی قصہ گوئی اور اسلوب نگارش میں ہر جگہ توازن اور احتیاط کی جو کمی ہے اس کا اظہار اس عبارت میں بھی کئی طریقوں سے ہوتا ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اشک کو واقعہ نگاری اور منظر کشی میں اس بات کا اندازہ نہیں کہ واقعہ اور منظر کا صحیح تصور قائم کرنے

اور قاری پر ایک خاص طرح کا تاثر پیدا کرنے کے لئے کون سی تفصیلات کو ابھارنا اور کہیں دبانا ضروری ہے۔ توازن اور احتیاط کے احساس کی کمی دوسری طرح یوں ظاہر ہوتی ہے کہ اشک نے کرداروں کو قصے میں جگہ دیتے وقت یہ بات پیش نظر نہیں رکھی کہ ان کی رفتار و گفتار میں مطابقت، مناسبت اور ہم آہنگی نہ ہو تو کردار کا نقش بگڑ کر رہ جاتا ہے اور پھر تیسرے یہ کہ لفظوں کا انتخاب موقع اور محل کی مناسبت سے نہ کیا جائے تو عبارت کا سارا لطف ختم ہو جاتا ہے۔

۶ - اشک کی اس خاص عبارت کو پڑھ کر یہ اندازہ کرنا بھی دشوار نہیں کہ واقعہ نگاری میں ابتدائی اور خاتمے کے جملوں کی جو اہمیت ہے اسے اشک نے پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے۔ اس نے عبارت کو شروع کرنے اور ایک خاص انجام تک پہنچانے میں لفظوں کی سجاوٹ اور فقروں کی ترتیب کا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا کہ چاہیئے۔

اس کے مقابلے میں لکھنوی نسخے میں نمایاں طور پر یہ خصوصیتیں نظر آتی ہیں:

۱ - طرز بیان کی رنگینی، پرتکلف اور پرتصنع عبارت‌آرائی، قافیے اور سجع کی پابندی، بیان میں شاعرانہ تخیل اور تصور اور التزام، الفاظ کا موزوں انتخاب اور ان سب سے بڑھ کر مجموعی حیثیت سے عبارت کی چستی اور سجاوٹ اس کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

۲ - ان خصوصیات کو لکھنوی مؤلفوں ہر موقع اور محل پر یکساں قادرالکلامی اور اهتمام کے ساتھ برتا ہے - چنانچہ موجودہ عبارت میں واقعہ کی تصریر کشی اور کرداروں کی ہلکی سی جھلک دکھاتے وقت بھی اس اهتمام اور قادرالکلامی میں کمی نہیں آئی -

۳ - لکھنوی مؤلفین ہر بات میں مبالغہ آمیزی کے عادی ہیں - اس کے باوجود اُن کی واقعہ نگاری اور کردار نگاری میں ایک ایسی احتیاط اور توازن ہے کہ واقعہ کا حسن اور کردار کا وہ نقش برقرار رہتا ہے جو اُس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے - یہی وجہ ہے کہ ہمیں اوپر والی عبارت میں رومان کی ایک بڑی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے اور شخصیتوں کی عظمت اور وقار کو بھی ٹھیس نہیں لگتی -

۴ - لکھنوی نسخے میں ہر باب کے آغاز کو بڑی اهمیت دی گئی ہے اور اُس کے ابتدائی دو ایک جملے ہمیشہ فضا قائم کرنے اور آنے والے واقعات کی طرف بے حد متوازن اشارہ کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں - چنا چہ یہاں بھی ابتدائی جملے میں شاہ خاور کی جلوہ افروزی کے ساتھ اُس کی شعاع نورانی کی نیزہ بازی کا مذکور اُن واقعات کی طرف ایک ہلکا سا شاعرانہ اشارہ ہے جو ابھی پیش آنے والے ہیں -

۵ - باب کے آغاز کے ساتھ ساتھ انجام کو لکھنوی مؤلفین نے تاثر پیدا کرنے کا ایک یقینی وسیلہ جان کر ہمیشہ آسے

اپنی ذہنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ۔ چنانچہ اس محل پر بھی جو داستان اشک نے ان الفاظ پر ختم کی کہ ،،گونے اس پر (یعنی ہمائے تاجدار پر) چھوڑ کر اس کے برابر گئے اور کمربند پکڑ کر گونے سمیت اٹھا لیا اور لا کر عمر کے حوالے کیا ۔ اس نے کمند کو ہاتھ سے باندھ کر لشکر کی راہ لی،، اسے لکھنوی نسخے میں یوں ختم کیا گیا ہے :

''امیر نے گھوڑے کو خیز کر کے ہمائے تاجدار کا کمر بند پکڑ کے مرکب سے جدا کیا اور عمر کی طرف گیند کی طرح پھینک دیا ۔ عمر نے کمند کے گچھے سے ہاتھ اس کے باندھ کر اپنے لشکر کی طرف رخ کیا ۔ ہمائے اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا،،

اس ٹکڑے میں جزئیات کا جو ہلکا سا لیکن سوچا سمجھا فرق ہے اس سے قطع نظر ''ہمائے اوج حسن و جمال کو اپنے دام میں لیا،، والے ٹکڑے کا اضافہ قابل تحسین ہے ۔ اس کی شعریت ، موزونیت اور خیال کے اندر چھپی ہوئی رنگین کیفیت نے پوری عبارت کا تاثر ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا ہے ۔

٦ ۔ لکھنوی نسخے کی عبارت کی آخری (لیکن خصی اہم) خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفصیلات اور جزئیات کے انتخاب میں شروع سے آخر تک پوری توجہ اور کاوش صرف کی گئی ہے ۔

اشک کے نسخے میں رزمیہ مرقع نگاری کے جو دو نمونے ہم

نے اوپر درج کئے ان کے علاوہ پوری داستان میں ایسے بہت سے موقعے آتے ہیں جن پر امیر حمزہ اور ان کے لشکر کو حق کی حمایت میں باطل کی زبردست قوتوں کے خلاف رزم آرائی کرنی پڑی ہے ۔ ان جنگوں میں ہمیشہ فتح و ظفر امیر کے ساتھ رہی ہے، اس لئے کہ اول تو امیر اور ان کے ساتھی شجاعت و مردانگی کی ان تمام صفات سے مزین تھے جو ہمیشہ انسان کو فاتح و مظفر بنانے کی ضامن رہی ہیں ۔ ان کی کامیابی و کامرانی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امیر کی ساری شجاعت و مردانگی حق اور خیر کی حمایت اور شر و باطل کی شکست و ریخت کے لئے وقف تھی ۔ داستان امیر حمزہ کے دونوں نسخوں میں ایسے سب موقعوں پر برتری کا شرف امیر اور ان کے رفقا کو حاصل رہا ہے ۔ یہ فرق البتہ ہے کہ واقعات کے بیان اور کرداروں کی رفتار و گفتار کی پیش کش میں اشک نے عموماً توازن و اعتدال کی کمی کا ثبوت دیا ہے ۔ اس کے برخلاف لکھنوی مؤلفین نے توجہ، انہماک اور ذہنی کاوش کی بدولت واقعہ نگاری اور کردار نگاری دونوں کو حسب دلخواہ موثر بنایا ہے اور عموماً حسن بیان سے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی تکلفات کی شدت اور عبارت آرائی کے تصنع سے پڑھنے والے کے لئے ذہنی تکدر کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے ۔

لکھنوی نسخے میں عبارت آرائی کا جو اہتمام اور لفظی تکلفات کی جو کثرت ہے وہ لکھنوی مذاق اور اس شائستہ و مہذب ماحول کا اثر ہے جس نے زندگی کے ہر گوشے میں سادگی کے ترک اور تکلف و تصنع کو اپنا شعار بنایا ہے ۔ داستان امیر حمزہ کے لکھنوی نسخے کی خوبی اور اس کے مؤلفین کا شرف اسی بات میں ہے کہ

انہوں نے اس طویل داستان میں ہر موقع پر لکھنوی مذاق اور اس کے مہذب تکلف و تصنع کی کامیاب پیروی کی ہے اور بہت کم موقعے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے تھک ہار کر یا عاجز آکر اپنے اسلوب کی طرف سے بے توجہی برتی ہے ۔ بلکہ سچ تو یوں ہے کہ کسی طرح کی بے توجہی کے بجائے ان کی عبارت میں پوری ذہنی کاوش اور ایک خاص طرح کے فنی احساس کا عکس موجود ہے ۔ اب تک آپ نے لکھنوی داستان امیر حمزہ کی جتنی عبارتیں دیکھیں وہ موضوعات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے پر بھی اسلوب نگارش کے نقطۂ نظر سے یکساں خصوصیات کی حامل ہیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں رزمیہ نگاری کے دو نمونے ابھی آپ کے سامنے آچکے ہیں ۔ اب میدان رزم چھوڑ کر ذرا بزم کی ایک جھلک دیکھ لیجئے ۔

یہ موقع وہ ہے جب امیر حمزہ چھپ کر ملکہ مہر نگار کے محل میں پہنچے ہیں ۔ اشک کے نسخے میں یہ داستان جلد اول کی دسویں داستان ہے اور اس کا عنوان ہے :

''داستان دسویں ۔ امیر کا جانا محل میں مہر نگار کے اور اس کے چونکنے میں،،

لکھنوی نسخے میں بھی یہ داستان دفتر اول میں ہے ۔ اس کا نمبر البتہ کوئی نہیں ۔ اس نسخے میں اس داستان کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے :

''پہلی ملاقات امیر کی سر حلقۂ خوبان روزگار سے، یعنی ملکۂ مہر نگار سے،،

اب دونوں نسخوں کی عبارت ملاحظہ ہو :

عبارت نسخۂ اشک:

''جوہریان بازار معانی کہتے ہیں کہ جب صاحب قران اوپر گئے اور دور سے لگے نگاہ کرنے، دیکھیں تو مہر نگار نے محل میں ایک جانب محفل نشاط آراستہ کی ہے اور اپنے ہم نشینوں سے بادہ خواری میں مشغول ہے اور مہرنگار بہتر از صد نگار درمیان میں معشوقان ماہ رویاں کے، مانند بہار بیٹھی ہے کہ اس کے جمال کی تجلی سے وہ تمام مکان روشن ہے ....۱ - مہر نگار نے جس وقت امیر کو دیکھا تھا اس وقت سے اس کو عجب طرح کی وحشت تھی ۔ دن اس نے بہ ہزار دقت کاٹا، جب رات ہوئی واسطے جی بہلانے کے صحبت نشاط آراستہ کی اور اپنی دائی کی بیٹی فتنہ خانم کو بلا کر کہا ''آج ہم کو نہایت قلق ہے اور جی گھبراتا ہے تو اپنے ہاتھ سے شراب پلا ۔ غرض جو جو اس کی محرم راز تھیں آ کر اس کے پاس حاضر ہوئیں ۔ اس وقت گلستان حسن و جمال میں ان غنچہ رویوں کا گرد اس کے بیٹھ کر گانا اور بجانا ایک جلوۂ نور کا سا معلوم ہوتا تھا ....
غرض اس شب مہر نگار دوپہر رات سے آگے تک بیٹھی شراب پیا کی ۔ ہر پیالے کے ساتھ امیر کو یاد کیا کی اور کہا افسوس یار جانی وائے محبوب زندگانی اس وقت

۱- اس جگہ اشک نے چار پانچ سطروں میں مہر نگار کا سراپا بڑے روایتی اور فرسودہ انداز میں بیان کیا ہے جو ہماری مثنوی کا عام دستور ہے، اسے میں نے ترک کر دیا ہے ۔

تو کہاں ہوگا - چل پہنچ - ہردم یہ کہتی تھی اور بےقراری کرتی تھی ....''

اس کے بعد ملکہ نے خواصوں کو رخصت کیا اور چھپر کھٹ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگی - صبح ہوتے نیند آ گئی - امیر نے یہ موقع غنیمت جانا اور بقول اشک :

''اندر اس بارہ دری کے گئے - دیکھیں تو پردے اس کے چاروں طرف کو پڑے ہیں اور شمع ہائے مومی گل کاری کی ہر جا مانند آہ عاشقاں روشن ہیں اور چپر کھٹ میں مہر نگار سوتی ہے - لیکن اس کے حسن کے روبرو تمام شمعوں کی روشنی پھیکی معلوم ہوتی تھی اور وہ مکان اس کے جمال سے مانند آفتاب کے منور تھا - امیر نے جی میں خیال کیا کہ ایسے معشوقوں کا وصال قسمت سے میسر ہوتا ہے - شاید پھر تیرے نصیب نہ ہو - اب اس مکان میں تو بڑی محنت سے آیا ہے، اس معشوق کے رخسارۂ برگ گل سے ایک بوسہ تو لے - یہ کہہ کر اس چپر کوٹ کے پاس گئے - برابر مہر نگار کے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے اس کے سر کے دونوں طرف تکیہ پر ٹیک دئے اور چاہا کہ جھک کر اس کے لب لعل سے بوسہ لے لیکن ابتدائے عشق تھا اور ناکردہ کار، ہاتھ امیر کا تکیے سے پھسل گیا - چھاتی پر اس معشوق کی پڑے ....''

اس طرح مہر نگار جاگ گئی اس نے شور مچادیا لیکن امیر کو پہچان کر نادم ہوئی - جو خواصیں شور سن کر آ گئی تھیں انہیں بہانہ کر کے ٹلا - خواصیں چلی گئیں تو امیر کو پلنگ کے

نیچے سے نکالا اور اپنے پاس بیٹھا لیا ۔ دونوں ایک دوسرے کو حسرت سے تکتے رہے ۔ اتنے میں سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو بقول اشک :

''امیر مانند شبنم کے، جو برگ گل پر ہوتی ہے آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا 'اے مہر نگار جو تو نے میرے آھوئے دل کو کمند ناز سے گرفتار کیا ہے، اس صید زخم زدۂ عشق کو نیم بسمل نہ چھوڑنا ۔ اب رخصت ہوتا ہوں............'' ۱۔

اب ذرا یہی ٹکڑے لکھنوی نسخے میں دیکھئیے :

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی ایک نئی ہے چال

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے

گہ نمک اس کو داغ کا پایا
گہ پتنگا چراغ کا پایا

کہیں طالب ہوا کہیں مطلوب
اس کی باتیں غرض ہیں دونوں خوب

خامۂ دل افگار، نبض شناسان عشاق، مزاج دانان بیماران فراق، کلک شوریدہ سر، مضامین ذوق و شوق زبان پر لاتا ہے، ہجر و وصل کی داستان سناتا ہے کہ امیر نے سقف قصر پر سے دیکھا کہ ملکۂ مہر نگار ماہرویان پری پیکر کے حلقہ میں بیٹھی ہے اور صراحی مئے گلگوں سے بھری ہوئی سامنے رکھی ہے ۔ جام بلوریں ہاتھ میں چھلک رہا ہے، بادۂ ارغوانی پیالہ سے جھلک رہا ہے، لیکن گوہر

۱ ۔ نسخہ اشک صفحات ۱۰۸ تا ۱۱۰

اشک کی لڑی نوک مژہ سے مسلسل تا بدھن ھے، آتش عشق کا نور سینہ میں شعلہ زن ھے ۔ آہ سرد لبوں پر ھے، نالہ کشی کا شغل اکثر ھے ۔ دن کو تو امیر نے دور سے دیکھا تھا اب متصل سے جو نظارہ کیا کہ چشمۂ خورشید درخشاں اس کے حسن کے آگے پانی بھرتا ھے اور ماہ تاباں اُس کے چہرۂ پرنور کے پرتو سے ضیا اقتباس کرتا ھے ۔ امیر اُس کے حسن دل آویز کو دیکھ کے آپ میں نہ رھے اور بھی شعلہ ھائے شوق دل میں بھڑکے..................۱

ملکہ کا رونا موقوف ھوا اور فتنہ بانو نے کہ ملکہ کی دایہ کی بیٹی تھی ساغر مے ملکہ کے ھاتھ میں دیا کہ اس کو پیو ۔ ملکہ نے کہا، میں سب کے پیچھے پیوں گی ۔ تھوڑی دیر کے بعد نوش کروں گی ۔ تم تو اپنے اپنے صیاد کا نام لے کر پیو ۔ قدرے قلیل میرے واسطے رھنے دو....۲

پھر کامل بزم بادہ خواری گرم رھی....جب دو پہر سے زیادہ رات گزری مجلس برخاست ھوئی ۔ ملکہ چھپر کھٹ پر جا لیٹی ۔ ھر چند کروٹیں لیتی مگر صاحب قراں کے خیال میں نیند نہ آتی ۔ زار زار روتی جاتی، آخر روتے روتے تھک گئی ۔ صاحب قراں نے

---

۱ ۔ اس کے بعد کی چند سطروں میں اس بات کا مذکور ھے کہ ملکہ مہر نگار کی محرم راز خواصیں اُسے سمجھا بجھا رھی ھیں ۔ خواصوں کے سمجھانے سے ملکہ کو قدرے تشفی ھوئی اور غم غلط کرنے کو دور جام چلا ۔

۲ ۔ اس کے بعد سب خواصیں اپنے اپنے محبوب کا نام لے کر جام نوش کرتی ھیں اور آخر میں ملکہ کی باری آتی ھے ۔ اس طرح امیر کو پتہ چلتا ھے کہ ملکہ اُن کے دام محبت میں اسیر ھے اور خواصوں میں سے ایک کو عمرو عیار سے اور دوسری کو مقبل سے محبت ھے ۔ اشک نے ان باتوں کی تفصیل یوں ھی بیان کی ھے ۔

دیکھا کہ ملکہ بھی سوئی اور ہر عورت اپنے مقام پر جا کر سو رہی، سیڑھیوں کی راہ بام قصر سے نیچے اترے ۔ دبے پاؤں ملکہ کے چھپر کھٹ کے پاس گئے ۔ دیکھا کہ ملکہ سو رہی ہے، مگر چشم انتظار کھلی ہے ۔

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو گیا ہے در فتنہ باز ہے

دیر تک روئے منور کو دیکھا کئے ۔ دل میں سوچا کئے کہ بڑی محنت سے یہاں تک پہنچ ہے ۔ کمال تکلیف اٹھا کے یہ قرب نصیب ہوا ہے، دل کی ہوس تو نکال ۔ کسی حیلے سے صاحب قران نے اپنے دونوں ہاتھ گل تکیوں پر رکھے ۔ چاہا کہ اس کے لب شیریں کو چومیں اور رخسار تاباں کا بوسہ لیں ۔ ہاتھ تکیوں سے پھسل گئے ملکہ کی چھاتیوں سے لگ گئے ۔ (اس کے بعد عبارت کا وہ ٹکڑا ہے جس میں ملکہ کے چونکنے اور خواصوں کے اس کے گرد جمع ہو جانے کا ذکر ہے ۔ ملکہ امیر کو پہچان کر خواصوں کو رخصت کرتی ہے اور صاحب قران جو چھپر کھٹ کے نیچے چھپ رہے تھے، باہر نکلتے ہیں)....

صاحب قران ان کے جاتے ہی نیچے سے نکل کر اوپر آئے، ملکہ مہر نگار کے برابر آئے ۔ ملکہ نے دن کو تو دور سے نظارہ کیا تھا، اب جو پاس سے دیکھا اور بھی غش کر گئی، ہوش سے گزر گئی۔ صاحب قران نے منہ سے منہ ملا ۔ اپنی جو بو سنگھائی، تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی ۔ اتنے میں روئے صبح نمودار ہوا ۔ صاحب قران نے مانند شبنم اپنی چشم نرگس میں اشک بھر کے کہا ''اے جان خدا حافظ ہے ۔ اب کشندۂ علقمہ قنبری ٹھہر نہیں سکتا ہے کہ

خوف افشائے راز کا ہے ۔ ۔ ۔مگر اس بسمل خنجر ناز کو بھول نہ جانا، مبتلائے فراق کو دل سے نہ بھلانا ۔

ملکہ نے ایک سرد آہ کھینچی اور آبدیدہ ہو کر بولی کہ دیکھئے اتنا دن کیونکر بسر ہوتا ہے، کس طرح مطمئن دل مضطر ہوتا ہے ۔ اچھا خدا کو سپرد کیا، اللہ کی امان میں دیا ۔

بس اب آپ تشریف لے جائیے
جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہو گا قلق تھوڑی دیر
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

اس کے بعد امیر رخصت ہوئے۔۔۔۱

اشک اور لکھنوی نسخے کی ان دونوں عبارتوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر ان کا مقابلہ کیا جائے تو پہلا بدیہی فرق تو یہی نظر آتا ہے کہ لکھنوی مؤلفین نے اشک کی عبارت کی تعقید دور کر کے اس میں سلاست و روانی پیدا کی ہے اور دوسرے اسے مقفیٰ و مسجع بنانے کے علاوہ اپنے شاعرانہ تخیل سے شعریت و رنگینی کے محاسن سے مزین کیا ہے ۔ لکھنوی نسخے کی یہ خصوصیت اس میں شروع سے آخر تک نمایاں ہے ۔ مختلف موقعوں پر قصہ گوئی کے تقاضوں کے مطابق لکھنوی مؤلفین نے اشک کی عبارتوں میں کمی بیشی کر کے جو تبدیلیاں کی ہیں اس کے بہت سے نمونے ہمارے سامنے آ چکے ہیں ۔ عبارت کا آہنگ اور قصہ کے مختلف اجزا میں موقع اور محل کے مطابق توازن پیدا کرنا لکھنوی مؤلفین کا مقصد رہا ہے اور اس مقصد کے حصول میں انہوں نے ہر جگہ توجہ اور انہماک سے کام لیا ہے ۔ اوپر کی دونوں

۱ ۔ عبارت صفحات ۹۹—۱۰۱ لکھنوی نسخہ داستان امیر حمزہ

عبارتوں میں بھی مختلف طریقوں سے بھی فرق موجود ہے ۔ یہ فرق لکھنوی مؤلفین نے عبارتوں میں کون کون سی کمیاں اور کون کون سے اضافے کر کے پیدا کیا ہے، اس کا اندازہ ایک ایک ٹکڑے پر نظر ڈال کر کیجئے ۔

اشک نے عبارت کا آغاز صرف یہ کہہ کر کیا ہے کہ :

''جوہریان بازار معانی کہتے ہیں کہ جب صاحب قران اوپر گئے اور دور سے لگے نگاہ کرنے، دیکھیں تو مہرنگار کے محل میں ایک جانب محفل نشاط آراستہ اور اپنے ہم نشینوں سے بادہ خواری میں مشغول ہے ۔

مہر نگار کی بادہ خواری کا ذکر چھیڑنے سے پہلے لکھنوی نسخے میں اس تمہید کا اضافہ کیا گیا ہے جو اس مصرعہ سے شروع ہو کر کہ ''عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال،، اس جملے پر ختم ہوتی ہے ''کلک شوریدہ سر مضامین ذوق وشوق زبان پر لاتا ہے، ہجر و وصل کی داستان سناتا ہے،،

یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ شاعرانہ اور پرلطف ادبی تمہید نے آنے والے واقعات کی نوعیت کی طرف اشارہ کر کے ایک موزوں اور دلکش فضا پیدا کر دی ہے ۔ افسانوی مقصد کے احساس کے علاوہ تمہید کے اشعار کا حسن انتخاب اور نثر میں الفاظ، ترکیبوں اور فقروں کی موزونیت، چستی، ترنم اور آہنگ بھی ایسی چیزیں ہیں جن سے پڑھنے والا لطف محسوس کئے بغیر نہیں رہتا ۔ اب آگے دیکھئے ۔

اس تمہید کے بعد دونوں نسخوں میں ملکہ مہر نگار کی بزم نشاط

کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ اس محفل کی تصویر کے نقوش کی وضاحت کے لئے اشک کے نسخے میں مندرجہ ذیل جملے استعمال کئے گئے ہیں :

''مہر نگار نے محل میں ایک محفل نشاط آراستہ کی ہے اور اپنے ہم نشینوں سے بادہ خواری میں مشغول ہے،،

''مہر نگار بہتر از صد نگار درمیان میں معشوقان ماہ ویان کے، مانند بہار بیٹھی ہے کہ اس کے جمال کی تجلی سے وہ تمام مکان روشن ہے،،

''اس وقت گلستان حسن و جمال میں ان غنچہ رویوں کا گرد اس کے بیٹھ کر گانا اور بجانا ایک جلوۂ نور کا سا عالم معلوم ہوتا تھا،،

لکھنوی نسخے میں اس بزم مے کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے :

''......ملکۂ مہر نگار ماہرویان پری پیکر کے حلقہ میں بیٹھی ہے اور صراحی مئے گلگوں سے بھری ہوئی سامنے رکھی ہے ۔ جام بلوریں ہاتھ میں چھلک رہا ہے ۔ بادۂ ارغوانی پیالہ سے جھلک رہا ہے،،

فتنہ بانو نے کہ ملکہ کی دایہ کی بیٹی تھی ساغر مے ملکہ کے ہاتھ میں دیا کہ اس کو پیو...پہر بھر کامل بزم بادہ خواری گرم رہی.....جب دوپہر سے زیادہ رات گزری مجلس برخاست ہوئی،،

اشک اور لکھنوی نسخے کی ان عبارتوں کو پڑھ کر ایک بات

تو یہ ذہن میں آتی ہے کہ اشک جن کا عام انداز نگارش سادگی کی طرف مائل ہے اس موقع پر سادگی کی جگہ شعریت کے گرویدہ ہوگئے ہیں ۔ یوں عبارت میں اگر کہیں کہیں لکھنے والا ادبی اور شاعرانہ رنگ آمیزی سے کام لے تو پڑھنے والے کے لئے یہ تبدیلی عموماً خوش گوار ہوتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ادبی اور شاعرانہ قوتوں کے صرف کے لئے لکھنے والے نے صحیح محل کا انتخاب کیا ہو ۔ جس طرح اس سے پہلے بعض مثالوں سے واضح ہو چکا ہے اشک نے شاعرانہ تخیل کی رنگینیاں عموماً منظر نگاری کے موقعوں پر صرف کی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پڑھنے والا اس منظر سے کوئی واقعاتی تاثر قبول کرنے کے بجائے محض بےمحل حسن تخیل کے دام میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے ۔ یہی صورت اس جگہ بھی پیش آئی ہے ۔ اشک کی واقعہ نگاری میں واقعہ کے نقش مبہم اور شعریت کے نقش نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں ۔ اس کے برخلاف لکھنوی نسخے میں، جو باتیں کہی گئی ہیں اُن سے بزم کا واضح تر تصور نظر کے سامنے آ جاتا ہے ۔ اس خاص موقعے پر مؤلفین نے اپنے معمول اور عام رجحان کے خلاف سادگی کو رنگینی پر ترجیح دی ہے کہ محل کا تقاضا یہی ہے ۔

اس ٹکڑے میں ملکہ مہر نگار کے حسن و جمال اور غم و اندوہ کی جو مصوری کی گئی ہے اس میں بھی لکھنوی مؤلفین اشک کے مقابلے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں اس لئے کہ اُنہوں نے دونوں چیزوں کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں الفاظ چنے اور صرف کئے ہیں ۔ اُن کے بیان میں ان موقعوں پر بھی شاعرانہ تخیل کی رنگینی اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھی ۔ اشک یہاں بھی اعتدال اور توازن قائم نہیں رکھ سکے ۔

عبارت کے اگلے حصے میں منظر کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ بزم مے برخاست ہو چکتی ہے تو ملکہ چپر کھٹ پر جا لیٹتی ہے اور بے چینی سے کروٹیں بدلتے بدلتے سو جاتی ہے۔ امیر اس موقع کو غنیمت جان کر چھپر کھٹ کے قریب پہنچتے ہیں اور ملکہ کے لب لعلیں کا بوسہ لینا چاہتے ہیں لیکن اُن کی کہنیاں پھسل جاتی ہیں۔ ملکہ جاگ اٹھتی ہے۔ خوف سے چلاتی ہے۔ خواصیں اکھٹی ہو جاتی ہیں۔ ملکہ انہیں حیلے سے رخصت کرتی ہے۔ اتنے میں سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے اور امیر بادل ناخواستہ اپنے محبوب سے رخصت ہوتے ہیں۔

اس منظر کے مجموعی نقش میں کئی اجزا شامل ہیں۔ جب تک لکھنے والا اُن میں سے ہر جزو کو اس کی اہمیت کے مطابق منظر میں صحیح جگہ نہ دے پڑھنے والے کے ذہن پر اس نقش کا خاطر خواہ اثر ناممکن ہے۔ آئیے پہلے دیکھیں کہ اس منظر کے اہم اجزا کیا ہیں :

(۱) امیر کے فراق میں ملکہ کے دل کی کیفیت۔
(۲) ملکہ کے حسن کو دیکھ کر امیر کے دل کی حالت۔
(۳) امیر کا اقدام اور اُن کی ناکامی۔
(۴) ملکہ کا اضطرار اور محبوب کے غیر متوقع قرب سے اُس کا جذباتی ہیجان۔
(۵) امیر کی رخصت کے وقت امیر اور ملکہ کے دلوں کی کیفیت۔

اس مقصد کے حصول کے لئے کہ اس طرح کا کوئی منظر قاری کے ذہن پر چھا جائے اور اُس کی آنکھوں میں اپنی نظر سے دیکھی

ہوئی چیز کی طرح بھر جائے اور وہ اپنے آپ کو اُس تجربہ میں جو اس منظر میں پیش کیا گیا ہے پوری طرح شریک کر سکے، ضروری ہے کہ لکھنے والا منظر کے مختلف اجزا کی اُس قدر و اہمیت کا احساس کر سکے جو ان اجزا کو اس منظر کی تعمیر میں اپنی اپنی جگہ حاصل ہے، وہ الفاظ کے موزوں انتخاب سے ان مختلف اجزا کی کڑیوں کو اس طرح مربوط کر سکے کہ وہ الگ الگ ہو کر بھی ایک زنجیر کے الگ نہ ہو سکنے والے ٹکڑے بن جائیں۔ وہ اُن کرداروں کے مزاج، منصب اور شخصیت و کردار کو پوری طرح پہچانتا ہو جو اس منظر کی روح رواں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قاری کے مذاق اور پسند سے اس حد تک آشنا ہو کہ ہر چیز کو اُسی کے سانچے میں ڈھال سکے۔

لکھنوی مؤلفین کی عبارت کے مختلف ٹکڑوں میں جو ربط، آہنگ اور موزونیت ہے اُس کا اندازہ تو دونوں نسخوں کے یہ ٹکڑے پڑھ کر ہی ہو جاتا ہے۔ اب دونوں کے الگ الگ اجزا کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر یہ اندازہ بھی کر لیجئے کہ وہ قصہ‌گوئی کے منصب، کرداروں کے مزاج اور قاری کے مذاق کو کس حد تک پہچانتے ہیں:

اشک کے نسخے کی عبارتیں	لکھنوی نسخے کی عبارتیں
(۱) اور آپ (یعنی ملکہ) ایک بارہ دری میں جا کر چھپر کھٹ جواہر نگار پر واسطے آرام کے لیٹی لیکن اشتیاق میں امیر کے نیند نہ	(۱) ملکہ چھپر کھٹ پر جا لیٹی۔ ہر چند کروٹیں لیتی مگر صاحب قِران کے خیال میں نیند نہ آتی۔ زار زار روتی جاتی، آخر روتے روتے تڑک

آتی تھی - پڑی ہوئی کروٹیں
لیتی تھی - اور صاحب قران
کے تصور میں روتی تھی -
جب گھڑی چار ایک رات
باقی رہی اس وقت اسی
خیال میں آنکھ جھپک گئی -

گئی - صاحب قران نے
دیکھا کہ ملکہ بھی سو گئی
اور ہر عورت اپنے مقام پر
جا کر سو رہی -

(۲) امیر نہایت خوش ہوئے -
اندر اس بارہ دری کے گئے -
دیکھیں تو پردے اس کے
چاروں طرف کو پڑے ہوئے
اور شمع ہائے موسی گل کاری
کی ہرجا مانند آہ عاشقاں
روشن ہیں اور چھپر کھٹ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
میں مہر نگار سوتی ہے - فتنہ تو سو گیا ہے، در فتنہ باز ہے
لیکن اس کے روبرو تمام
شمعوں کی روشنی پھیکی معلوم
ہوتی تھی - اور وہ مکان اس
کے جمال سے مانند آفتاب کے
منور تھا - امیر نے جی میں
خیال کیا کہ ایسے معشوقوں
کا وصال قسمت سے میسر
ہوتا ہے - شاید پھر تیرے

(۲) امیر سیڑھیوں کی راہ سے
بام قصر سے نیچے اترے -
دبے پاؤں ملکہ کے چھپر کھٹ
کے پاس گئے - دیکھا کہ
ملکہ سو رہی ہے، مگر
چشم انتظار کھلی ہے -
دیر تک روئے منور کو
دیکھا کئے - دل میں سوچا
کئے کہ بڑی محنت سے
یہاں تک پہنچا ہے کمال
تکلیف اٹھا کے یہ قرب
نصیب ہوا ہے -

نصیب نہ ہو۔ اب اس مکان میں تو بڑی محنت سے آیا ہے اس معشوق کے رخسارۂ برگ گل سے ایک بوسہ تو لے۔

(۳) یہ کہہ کر اس چھپر کھٹ کے پاس گئے۔ برابر مہر نگار کے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اپنے اس کے سر کے دونوں طرف تکیہ پر ٹیک دئے اور چاہا کہ جھک کر اس کے لب لعل سے بوسہ لے، لیکن ابتدائے عشق تھا اور ناکردہ کار، ہاتھ امیر کا تکیے سے پھسل گیا۔ چھاتی پر اس معشوق کی پڑے،،

(۳) کسی حیلے سے صاحب قران نے اپنے دونوں ہاتھ گل تکیوں پر رکھے۔ چاہا کہ اس کے لب شیرین کو چومیں اور رخسار تاباں کا بوسہ لیں، ہاتھ تکیوں سے پھسل گئے۔ ملکہ کی چھاتیوں سے لگ گئے۔

(۴) مہر نگار نے امیر کو نکالا اور اپنے برابر بٹھلایا اول مرتبہ امیر کو دور سے دیکھا تھا۔ اب نزدیک سے دیکھا کہ عجب طرح کا جوان، زیبا صورت و پاکیزہ سیرت ہے۔ مانند شب چاردہ کے،

(۴) صاحب قران خواصوں کے جاتے ہی نیچے سے نکل کر اوپر آئے، ملکہ مہر نگار کے برابر آئے۔ ملکہ نے دن کو تو دور سے نظارہ کیا تھا اب جو پاس سے دیکھا اور بھی غش کر گئی، ہوش سے

نور رخسار اس کا، چاند کی صورت اس شب تیرہ کو روشن کر رہا تھا ۔ صاحب قراں کی صورت کو دیکھ کر مثال تصویر کے حیران رہ گئی ۔ امیر بھی اس نگار کو دیکھ کر دیوانہ وار تک رہے تھے ۔

گزر گئی ۔ صاحب قراں نے منہ سے منہ ملا ۔ اپنی بو جو سنگھائی تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی ۔

(۵) سفیدہ سحر کا نمودار ہوا ۔ امیر مانند شبنم کے جو برگ گل پر ہوتی ہے آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا ''اے مہر نگار ! جو تو نے میرے آہوئے دل کو کمند ناز سے گرفتار کیا ہے ۔ اس صید زخم زدۂ عشق کو بسمل نہ چھوڑنا ۔ اب رخصت ہوتا ہوں ۔

(۶) اتنے میں سپیدۂ صبح نمودار ہوا ۔ صاحب قراں نے مانند شبنم اپنی چشم نرگس میں اشک بھر کے کہا ''اے جان ! خدا حافظ ہے ۔ اب کشندۂ علقۂ حبری ٹھہر نہیں سکتا ہے کہ خوف افشائے راز کا ہے .....مگر اس بسمل خنجر ناز کو بھول نہ جانا ۔ مبتلائے فراق کو دل سے نہ بھلانا ۔
ملکہ نے ایک آہ سرد کھینچی اور آبدیدہ ہو کر بولی کہ دیکھئے اتنا دن

کیوں کر بسر ہوتا ہے۔
کس طرح مطمئن دل مضطر
ہوتا ہے۔ اچھا خدا کو
سپرد کیا، اللہ کی امان
میں دیا ہے
بس اب آپ تشریف لے جائیے
جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہو گا قلق تھوڑی دیر
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی
اس کے بعد امیر رخصت ہوئے۔

پہلے ٹکڑے میں لکھنوی مؤلفین نے اختصار سے وہی مقصد حاصل کر لیا ہے جو اشک نے بات کو نسبتاً پھیلا کر حاصل کیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں اشک نے جو تفصیلات استعمال کی ہیں وہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے بے محل اور کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے ناموزوں ہیں اس لئے کہ منظر کا طول قاری کے ذہن کو بھٹکاتا اور صاحب قراں کے زبان سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ ان کے اعلی منصب کو گراتا ہے۔ لکھنوی نسخے میں ان دونوں چیزوں کے ذکر میں اختصار برتا گیا ہے، الفاظ کی رنگینی کے بجائے سادگی سے کام لیا گیا ہے اور عبارت کی سادگی کی کمی ایک اچھے اور برمحل شعر سے پوری کی گئی ہے۔ تیسرے ٹکڑے میں لکھنوی نسخے میں جس اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس سے منظر بھی زیادہ واضح اور حقیقی بن جاتا ہے اور امیر کے کردار میں جو غیر اہم اور غیر واقعاتی تفصیل ہے وہ بھی باقی نہیں رہتی۔ چوتھے ٹکڑے میں بھی لکھنوی مؤلفین نے غیر ضروری اور غیر اہم تفصیلات ترک کی ہیں اور ان کے بجائے دو جملوں کا اضافہ کر کے تصویر کو زیادہ حقیقی اور رومان انگیز بنا دیا ہے۔

پانچواں ٹکڑا اشک کے یہاں مختصر اور لکھنوی نسخے میں طویل ہے ۔ طوالت کی کئی وجہیں ہیں ۔ لکھنوی مؤلفین اس ٹکڑے کو زیادہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے زیادہ حقیقی بنانا چاہتے تھے ۔ اشک کے نسخے میں ملکہ مہر نگار کے جذبات کے ذکر کو نظر انداز کر کے مؤلف نے جو غلطی کی ہے اس کی تلافی ضروری سمجھتے تھے اور ساتھ ہی فن کے اس منصب کی تکمیل بھی ضروری جانتے تھے کہ منظر کی ابتدا کی طرح اس کا خاتمہ بھی گہرے اور دیرپا نقش اور تاثر کا حامل بن سکے ۔ ملکہ کے الفاظ، اس کی زبان سے نکلے ہوئے دو بر محل سادہ اور پرمعنی شعر اور یہ جملہ کہ اس کے بعد امیر رخصت ہوئے نقش اور تاثر کو گہرا اور یقینی بنانے کے ضامن ہیں ۔

اشک اور لکھنو والے داستان امیر حمزہ کے مختلف ٹکڑوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جو جو نتیجے ہمارے سامنے آئے، انہیں یکجا کر کے دیکھا جائے تو دونوں نسخوں میں بنیادی طور پر دو امتیازی فرق نظر آتے ہیں ۔ ایک فرق طرز بیان اور اسلوب نگارش سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے کا تعلق قصہ گوئی کے مختلف عناصر سے ہے ۔ ان دونوں بنیادی امتیازات کا تجزیہ کیا جائے تو دونوں کے ضمن میں اور بے شمار فرق پڑھنے والے کو محسوس ہوتے ہیں ۔ لیکن ان تفصیلات سے قطع نظر، اشک اور لکھنوی نسخے کے بنیادی امتیازات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ لکھنوی مؤلفین نے اشک کے نسخے پر نظرثانی کرتے وقت اسے ہر لحاظ سے قاری کے لئے دلچسپ اور دلنشین بنانے کو اپنا فنی منصب جانا ہے۔ لکھنوی مؤلفین میں سے ایک (یعنی شیخ تصدق حسین)

اپنے عہد کے مشہور داستان گو ہیں اور بڑی داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں کے ترجمہ اور تصنیف میں سب سے زیادہ حصہ انہیں کا ہے ۔ ایک ماہر داستان گو ہونے کی حیثیت سے انہیں اندزہ ہے کہ داستان میں واقعہ نگاری، منظر کشی، کردار نگاری اور لطف بیان کے اعتبار سے کیا کیا چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں جو پڑھنے والوں کی نظر میں اسے زیادہ سے زیادہ پسندیدہ بنا سکیں ۔ چنانچہ انہوں نے اشک کے متن پر نظرثانی کرتے وقت اس کے ایک ایک لفظ کو توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ترتیب میں تقدم و تاخر کر کے، متن کی جزئیات میں بھی حسب ضرورت اور حسب موقع کمی بیشی کر کے اسے ایسی صورت دی ہے کہ بعض اوقات اصل تالیف اور ترمیم شدہ نسخے میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ اتنا بڑا فرق یقیناً مصنفوں کے نقطۂ نظر کے اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو اپنے فن کی طرف سے انہوں نے اختیار کیا ہے ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ لکھنوی مؤلفین کا نقطۂ نظر ہر جگہ فن اور اس کے تقاضوں کا پابند رہا ہے اور اس نقطۂ نظر نے اشک کی بظاہر سیدھی سادی تالیف کو ایسا فنی کارنامہ بنا دیا ہے کہ اسے اور داستانوں کی تاریخ میں ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت حاصل رہے گی ۔

(اگست ۱۹۵۶)



ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی

حالات حسن کے دو مآخذ

(۱)

اردو کے دوسرے قدیم شعراء کی طرح میر حسن کے مفصل حالات بھی نہیں ملتے - معاصر تحریروں میں حسن کے حال کے لئے قدیم ترین بیان گلزار ابراهیم کا ہے جو میر حسن کے بھیجے ہوئے حالات پر مبنی ہے - ان کے حلقۂ احباب میں بھگوانداس بھی تھے جن کا سفینۂ هندی بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے - یہ تذکرہ اگرچہ میر حسن کی وفات کے بعد لکھا گیا ہے لیکن صاحب تذکرہ حسن سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور ان کے والد سے بھگوانداس کے دوستانہ روابط تھے - اس لئے حسن کے حال کے لئے یہ بھی اهم ہے - اسی طرح کمال کا مجمع الانتخاب ہے - قدرت‌اللہ شوق کا طبقات الشعراء بھی میر حسن کے زمانے کا تذکرہ ہے - لیکن حسن کے حال میں کوئی خاص بات پیش نہیں کرتا - تذکرہ مسرت افزا اگرچہ میر حسن کے حین حیات میں لکھا گیا لیکن اس میں ان کا ترجمہ تمام و کمال تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) سے ماخوذ ہے - مصحفی کا تذکرۂ هندی

بھی اسی زمانے کی چیز ہے اور اس کے محتویات عام طور پر معلوم ہیں ۔ مبتلا کا طبقات سخن، قائم کا مجموعۂ نغز اور احد علی یکتا کا دستور الفصاحت بھی میر حسن کے قریبی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ان سب کتب سے حسن کے حالات پر تسلی بخش روشنی نہیں پڑتی۔ اب لے دے کے میر حسن کی اپنی تحریریں ہیں جن پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ ان میں سے تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کچھ درج ہے عام طور پر معلوم ہے ۔ عہد حاضر کے مصنفین نے حسن کے حالات کے لئے بالعموم اسی پر انحصار کیا ہے ۔ کلام حسن سے اس پر مزید کوئی اضافہ نہیں ہوتا ۔ البتہ دیباچۂ دیوان حسن ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے ۔ دیباچۂ دیوان حسن کا ذکر اب سے قبل دو ادیبوں نے کیا ہے ۔ واقعات انیس میں میر مہدی حسن احسن لکھنوی نے (اصح المطابع ٹھوی ٹولہ لکھنو ص۔ ۲۰ تا ص۔ ۲۳) اس کا ایک اقتباس درج کیا ۔ مرزا علی حسن نے غزلیات میر حسن (غیر مطبوعہ) (طبع ۱۹۴۴ ص ۳ تا ص ۱۰) کے دیباچے میں اس سے کچھ کام لیا ہے ۔ لیکن دونوں ادیب اس بات کے مقر ہیں کہ یہ دیباچہ کلیات حسن کا ہے ۔ حالانکہ یہ دیوان حسن کا دیباچہ ہے کلیات کا نہیں۔ علاوہ ازیں اس کے نفس مضمون سے ان صاحبوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے اس میں بہت کچھ تسامحات ہوئے ہیں ۔ دوسری تحریر جو حالات حسن پر روشنی ڈالتی ہے وہ میر شیر علی افسوس کا دیباچۂ سحر البیان ہے ۔ یہ دیباچہ مثنوی کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا ۔ ''سحر البیان کے بعض ایڈیشنوں میر حسن کا حال اسی ماخذ سے لیا گیا ہے'' (اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۲۶ ص ۳) علاوہ ازیں حسن کے حال کے لئے دتاسی نے اپنی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی (طبع ثانی جلد اول ص ۵۲۸ بعد) میں اس سے فائدہ

اٹھایا ۔ کریم الدین کے طبقات الشعراء میں میر حسن کا حال دتاسی ہی سے لیا گیا ہے ۔ اس درمیانی واسطے کے سبب میر حسن کے حالات میں کریم الدین سے بعض غلطیاں بھی ہو گئی ہیں ۔ (ملاحظہ ہو طبقات الشعراء طبع اول ص ۲۱۳) آب حیات میں محمد حسین آزاد نے کریم الدین کی عبارت سے فائدہ اٹھا کر حسن کا حال لکھا ہے (آب حیات ص ۲۵۴) ۔

ان مآخذ کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں ہم انہیں پیش کرتے ہیں ۔

(۲)

پہلے دیباچۂ دیوان حسن پیش کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ دیباچہ مکمل طور پر اب سے پہلے شائع نہیں ہوا ۔ اس کا متن برٹش میوزیم کے نسخۂ کلیات حسن کے مائیکروفلم پر مبنی ہے ۔ یہ نسخہ شعبان ۱۲۷۹ھ میں کرنیل جارج ہملٹن کے لئے لکھا گیا اور غالباً انہیں کی وساطت سے برٹش میوزیم میں پہونچا (تفصیل کے لئے دیکھئے فہرست مخطوطات موزۂ برطانیہ ۔ بلوم ہارٹ) ۔ بعض حصوں کا مقابلہ واقعات انیس کے اقتباسات اور کلیات حسن رضا لائبریری رامپور کے اقتباسات سے بھی کیا گیا ہے ۔ کلیات حسن (رضا لائبریری) کے اقتباسات ہم نے بیاض فائق (کاب علی خاں) سے حاصل کئے ہیں اور ان کی مزید تصدیق عابد رضا خاں صاحب کے ذریعے کتاب‌خانۂ رامپور سے بھی کر لی گئی ہے ۔ نسخۂ رامپور کے سرورق کی عبارت سے خاندانی نسخہ معلوم ہوتا ہے ''کلیات میر حسن گزرانیدۂ فرزند حسن نبیرۂ میر انس یکم جولائی ۱۹۰۶'' لیکن اس نسخے میں

دیباچہ یک لخت ان الفاظ پر رہ جاتا ہے :''توقع از صاحبان معنی دارم کہ ہرگاہ بہ نسبتی معانی،، (اس کے بعد چند ورق غائب ہیں) مائی کروفلم سے بعض حصے صاف نہیں پڑھے جا سکے اور ان کا مقابلہ مذکورہ مآخذ سے بھی نہیں ہو سکا ۔ اس لئے شروع کی عبارت گنجلک رہ گئی ہے ۔

(۳)

(دیباچہ دیوان حسن)

بسم‌اللہ الرحمن الرحیم

(صفحہ ۲۳۲) سخن سنجان گلشن مقال چون گل رخان معانی را بر چار بالش صفحۂ دیوان زینت جلوس بخشیده، اول خرگاه حمد سبحان الذی، خلق الانسان و علمہ البیان۲ نمایند و انجمن آرایان شبستان خیال ہرگاہ سخن بوبان ابیت را بر مسند بیاض مربع نشین می کنند و نعت نشید (و بر تخت نشاند ؟) صاحب و ما ینطق عن الھوی ھو ان الا وحی ۳ می سرایند ۔ اول مخمس منقبت پنجۂ قدرت کہ یداللہ فوق ایدیھم۴ بیان اوست دست او تبر (بسر ؟ برتر ؟)دارند و کرسی نشینان مطلع تابر (تاثیر ؟) سر (ستیز؟ سیر؟) غزل (غزل) مقام یابند اول دوازدہ بند توصیف ایمۂ اطہار علیہم الصلوۃ والسلام (صفحہ ۲۳۳) الملک الغفار در پردۂ حسنی (حسن)

۱ - پارہ ۲۷ سورہ الرحمن (مرتب)
۲ - پارہ ۳۰ (مرتب)
۳ - سورہ نجم (مرتب)
۴ - پارہ ۲۷ (مرتب)

بیان می آردند ۔ من هیچمدان تهی دست که از حیرت رنگ بر رو ندارم، چنان شبیه اطفال مقال خود را بر اوراق کاغذ نسیم(کشم ؟) که صاحب نظران جمال آنها دیده دهن بدرود کشایند، مگر سخن آفرین قبولے بخشد که منظور اولی الاصار گردد و حسنے عطا کند که دیدهٔ چشم بوسن حسد کیش چون دیدهٔ تصویر بے نور شود که سما حون (کذا) حسن ماکم (راکم؟) کرده حسن قبول بگفتارم در حس(برخش یا (نا؟) مقبول صاحبان اخلاق حسن شود ۔ آمین، رب العالمین ۔ اما بعد بر سخنوران شاطر و دانشوران ماهر [مخفی نماند] که اصل این مولف این میر غلام حسین ابن میر عزیزالله ابن میر براتالله ابن میر امامی موسوی از شاهجهان آباد است که میر امامی موسوی در وقت شاهجهان آ بادشاه (سهو قلم : ''درقت شاهجهان بادشاه،، چاهیے) از هرات آمده منصب سه هزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند ۔ فاضل متبحر و فقیه همان بودند و گه گه بجهت تفریح طبع فکرشعرهم می نمودند که افکار معاد فرصت بے فائده گوئی نمی بخشید (بخشد) پس این عاجز بسخن را سر رشتهٔ شاعری احدادی ست نه امروزی، و قبله گاهی سلمه الله تعالیٰ (..؟) این همه قدرت علم چون طباع سامعان را در سخن بلند نیافتد (کذا) بقدر حوصلهٔ آن (ها) بطرف هزل توسن قلم راندند، بحکم آن که هرگاه که زمانه باتو نسازد تو بازمانه بساز ۔ چون این ابجد خوان دبستان سخن در سن صغیر (کذا) که هنوز ایام صبا منقضی نشده بود بیتے گفته بود و آن این است :

یک سخن گویم ترا بشنو زمن اے یار من
گر نخواهی رنج خود اےجان مده آزار من

دیباچہ یک لخت ان الفاظ پر رہ جاتا ہے :''توقع از صاحبان معنی دارم کہ ہرگاہ بہ نسبتی معانی،، (اس کے بعد چند ورق غائب ہیں) مائی کروفلم سے بعض حصے صاف نہیں پڑھے جا سکے اور ان کا مقابلہ مذکورہ مآخذ سے بھی نہیں ہو سکا ۔ اس لئے شروع کی عبارت گنجلک رہ گئی ہے ۔

(۳)

(دیباچہ دیوان حسن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(صفحہ ۲۳۲) سخن سنجان گلشن مقال چون گل رخان معانی را بر چار بالش صفحۂ دیوان زینت جلوس بخشیدہ، اول خرگاہ حمد سبحان الذی۱ خلق الانسان و علمہ البیان۲ نمایند و انجمن آرایان شبستان خیال ہرگہ سخن بویان ابیات را بر مسند بیاض مربع نشین می کند و نعت نشید (و بر تخت نشاند ؟) صاحب و ما ینطق عن الھوی ھو ان الا وحی ۳ می سرایند ۔ اول مخمس منقبت پنجۂ قدرت کہ یداللہ فوق ایدیہم۴ بیان اوست دست او تبر (بسر ؟ برتر ؟)دارند و کرسی نشینان مطلع تابر (تاثیر ؟) سر (ستیز؟ سیر؟) عزل (غزل) مقام یابند اول دوازدہ بند توصیف ایمۂ اطہار علیہم الصلوۃ والسلام (صفحہ ۲۳۳) الملک الغفار در پردۂ حسنی (حسن)

۱ - پارہ ۲۷ سورہ الرحمن (مرتب)
۲ - پارہ ۳۰ (مرتب)
۳ - سورہ نجم (مرتب)
۴ - پارہ ۲۷ (مرتب)

بیان می آرند - من هیچمدان تهی دست که از حیرت رنگ بر رو ندارم، چنان شبیه اطفال مقال خود را بر اوراق کاغذ نسیم (کشم ؟) که صاحب نظران جمال آنها دیده دهن درود کشایند، مگر سخن آفرین قبولے بخشند که منظور اولی الابصار گردد و حسنے عطا کند که دیدۂ چشم بوسن حسد کیش چون دیدۂ تصویر بے نور شود که سما حون (کذا) حسن ما کم (را کم؟) کرده حسن قبول بگفتارم بر حس (برنخش یا (نا؟) مقبول صاحبان اخلاق حسن شود - آمین، رب العالمین - اما بعد بر سخنوران شاطر و دانشوران ماهر [مخفی نماند] که اصل این مولف این میر غلام حسن ابن میر عزیزاللہ ابن میر براتاللہ ابن میر امامی موسوی از شاهجهان آباد است که میر امامی موسوی در وقت شاهجهن آ بادشاه (سہو قلم : ''در وقت شاهجهان بادشاه،، چاهیے) از هرات آمده منصب سه هزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند - فاضل متبحر و فقیه همان بودند و گه گه بجهت تفریح طبع فکر شعر هم می نمودند که افکار معاد فرصت بے فائده گوئی نمی بخشید (بخشد) پس این عاجز سخن را سر رشتۂ شاعری اجدادی ست نه امروزی، و قبله گاهی سلمه الله تعالی (۱۰؟) این همه قدرت علم چون طباع ساممان را در سخن بلند نیافتند (کذا) بقدر حوصلۂ آن (ها) بطرف هزل توسن قلم راندند، بحکم آن که هرگه که زمانه با تو نسازد تو بازمانه بساز - چون این ابجد خوان دبستان سخن در سن صغیر (کذا) که هنوز ایام صبا منقضی نشده بود بیتے گفته بود و آن این است :

یک سخن گویم ترا بشنو زمن اے یار من
گر نخواهی رنج خود اے جان مده آزار من

گفته، بر صاحب سخنان ثابت گردیده که این طفل البته موزون است، و ازین کلامی مقبول تر خواهد زد، حاصل که السعید من سعید فی بطن آمه والشقی من شقی فی بطن آمه۲ هر کرا حق سبحانه تعالیٰ بهر کاری می آفرید ـ از صغر سن میلان طبعیت او بسوئے اکتاب (اکتساب) آن می کند (کشد) و این امور کسبی۳ نیست بلکه موهبی است ـ لهذا عارفان ربانی زبان بطعن کسی نمی کشایند که نظر اوشان بر فاعل حقیقی است و شکایت اوتعالیٰ نمودن شرک عظیم ـ عیاذ با الله (بالله) ـ غرض از گردش روزگار به اکنون (به لکهنؤ) رسیدم، گفتم زبان فارسی که شیخ صاحب نورالله مرقد از زبان حضرت قبله گاهی ابدالله عاطفه سنیده (شنیده) بحق این عاصی دعا فرموده اندم (صفحه ۲۳۴) (وشاید این نتیجهٔ دعائے : برٹش میوزیم کے نسخے میں سیاهی بهری هوئی ہے) آن بزرگ عالی قدر باشد که توفیق سخن یافتم و الا من کجا و این گفتکوها (کجا)[رباعی] اینست :

جانا(ن) ز تو امید نگاهی دارم
امید نگاهی ز تو گاهی دارم

---

۱ ـ اس کا ترجمه مرزا علی حسن صاحب نے یوں کیا ہے ”تو میرے والد نے سن کر کہا که بے شک یه لڑکا موزوں هوگا، یه ترجمه کسی طرح نہیں

۲ ـ یه حدیث اصل میں یوں ہے : السعید و من هو سعیده فی بطن آمه والشقی من شقی فی بطن آمه ـ

۳ ـ واقعات انیس میں ”مکتسبی،، لکھا ہے ـ

۴ ـ ”فرمودند،، هونا چاهیے ـ

ما کشته به چشم سرمه سایت هستیم۱
نی ناله ونی فغان نه آهے دارم (کذا)

و شعری نیز باین بود۲ :

ای شمع مپرس سرگذشتم
خاموش که من ز سرگذشتم

چون در فیض آباد حرسه الله تعالیٰ عن۳ الافات رسیدم، بخدمت میر حبیب‌الله برادر زادهٔ (شاه۴) سجن قدس‌الله سره که درویش معروف اند، و میر ابراهیم نورالله مضجعه برادر ایشان نیز مشهور، صحبت گزیدم، زاد های طبع خود را می نمودم، اگرچه سید مسطور موزون ندارند لیکن سلمه الله تعالیٰ در فهمیدن ممتاز سنجیدگانند ـ و بزرگان فهمیدن شعر را به از گفتن جائز داشته اند که گفته اند :

شعر گفتن گر چه در سفتن بود
بسکه فهمیدن به از گفتن بود

روزی بفرمائش آن شفیق ریخته انشا کردم که در فصاحت زبان دانان هند فصیح آمد، اران باز چون زبان خود گفتم۵ از فارسی گذشته آنچه بدل آمد گفتم، لیکن اصلاح حروف و معنی (کذا) بخدمت

---

۱ ـ مائی کروفلم میں ''ماگشتهٔ چشم سرمه‌سائیم،، لکھا ہے جو درست نہیں ـ

۲ ـ همراه این رباعی بود؟ یا باین طور بود؟

۳ ـ ''مائی کروفلم اور بیاض فائق میں ''عن،، لکھا ہے لیکن واقعات انیس میں ''عن،، موجود نہیں ـ

۴ ـ مائی کرو فلم میں یہ لفظ نہیں ہے ـ

۵ ـ یہ فقرہ الجھا ہوا ہے مطلب نہیں کھلتا ـ در زبان خود گفتم؟ او گفت در زبان خود گو؟

میر صاحب، ضیائے بزم سخندانان، آتش زن کانون سوختہ درونان، میر ضیاءالدین حسین ادام افضالہ کہ (ضیاء) تخلص دارند، گرفتم، لیکن طرز سخن ایشان گاہی از من سر انجام نیافتہ، بر قدم دیگر بزرگان، مثال حضرت خواجہ میر درد صاحب، کہ درد مندی و بزرگی‌های اوشان عالم‌گیر است، از کلام درد اوشان جگر عالمی فیض رسان درد و ذات با برکات اوشان میان درویشان (چون) فرید فرد ۔ دیگر صاحب وقت (کذا) رفیع منزلت میرزا محمد رفیع (سودا) سلمہ‌اللہ تعالی (کہ از رائے صائب زیادہ ناطق اند) نظیر نظیری وجان قدسی اشعار اوشان ست (میر) میر محمد تقی، همشیر زادۂ شیخ سراج‌الدین خان آرزو کہ سراج محفل شعراء بودہ و از صر صر زمانہ خاموش گردیدہ نوراللہ مرقدہ کہ تخلص (میر) دارند (و) بابا فغانی را در نالۂ خود زیر (کذ) می خوانند و صیت قطرت اوشان طنطنہ در جہان افگندہ (و) دیگرے بخیال خود قائم نکردم کہ وضع آن را پسندم و دل بگفتار آن (ها) بربندم، حق تعالی این هرسہ را چون موالید ثلاثہ تا جہان ست قائم دارد ۔ و من شعرهای آبدار کہ بہ هزار جانکنی جمع نمودہ ام آتشی کہ بہ کلبۂ فقیر افتاد سراپا سوختہ مگر بر زبان محبان کہ باقی بود ازان بار دیگر گرد آوردہ ۔ پس آنچہ آنچہ طبع زادہ معروف نمودہ ۱ توقع از صاحبان‌معنی دارم کہ هرگاہ بر نسبتی (کذا) معانی (صفحہ ۲۳۵) و الفاظ نگاہ کنند از بلندئی حوصلۂ خود قلم رو (براو؟) بکشند اگر توفیق باشد (در؟) اصلاح ۲ آن کوشند کہ در مذلت (منزلت؟) بزرگن دین سعی‌ها نمودہ

۱ - اعنی : زادۂ طبع را معروف نمودہ ۔

۲ - متن میں صلاح لکھا تھا ۔

اند و سخن نکردہ و ما (تو) فیقی الا باللہ (علیہ) توکل و اللہ (الیہ؟) مآب ۱ -

(۴)

دیباچۂ سحرالبیان پہلی دفعہ سنہ ۱۸۰۵ء میں کلکتے سے شائع ہوا اور سحرالبیان کے شروع کے بعض ایڈیشنوں میں چھپتا رہا - اورئنٹل کالج میگزین اگست سنہ ۱۹۲۶ء کے پرچے میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے ایک قلمی نسخے سے اس کا خاصا حصہ شائع کر دیا (ص ۱ تا ۷) پھر سید احمداللہ قادری صاحب نے ۲۷ رمضان سنہ ۱۳۵۲ھ میں شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن سے مثنوی رموزالعارفین کے ساتھ اسے شائع کیا - مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے مثنویات میر حسن (نولکشور پریس طبع سنہ ۱۹۴۴ء ص ۱۳ تا ص ۲۰) کے ساتھ بھی اسے طبع کیا - اتنی بار شائع ہونے کے بعد اسے پھر شائع کرنے کا کوئی موقع نہ تھا - لیکن برٹش میوزیم کے نسخے کے مائی کرو فلم کو بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ متن مطبوعہ متن سے بعض جگہ مختلف ہے اور کچھ عجب نہیں جو مصنف کے اولیں مسودے کی نقل ہو - اختلافات کو آسی کے ایڈیشن سے فٹ نوٹوں میں پیش کیا جا رہا ہے - دیباچہ نگار میر علی افسوس میر علی مظفر داروغۂ توپ خانۂ میر قسم (ناظم بنگال) کے لڑکے

---

۱ - متن میں جو جملے یا الفاظ بڑی خطوط وحدانیوں میں ہیں وہ بیاض فائق، واقعات انیس اور مرزا علی حسن کے مرتبہ دیوان کے اقتباسات سے لئے گئے ہیں- چھوٹی خطوط وحدانیوں کی عبارتیں قیاسی تصحیحات ہیں- عربی عبارتوں کے اعراب قرآن پاک کی مدد سے لگائے گئے ہیں - جمل عربی کی تصحیح کے لئے مرتب جناب عبدالحئی صدیقی صاحب کا ممنون ہے-

تھے - (تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۱) ۱۱۵۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ عمدۃالملک امیر خان انجام کی شہادت کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاش معاش میں نکلے تو افسوس کی عمر گیارہ برس کی تھی (ارباب نثر اردو سید محمد قادری، انجام ۲۳ ذالحجہ سنہ ۱۱۵۹ھ کو شہید ہوئے) افسوس دلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد انجام کی سرکار میں تھے - میر مظفر کو ''نواب خان عالم بقاءاللہ خان مرحوم نے لکھنؤ میں بلوایا اور سرکار وزیرالممالک نواب‌شجاع‌الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے کے واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا،، (گلشن ہند ص ۵۷) - شجاع‌الدولہ کا قیام لکھنؤ سنہ ۱۱۶۷ھ سے سنہ ۱۱۷۸ھ تک رہا اس کے بعد انہوں نے فیض‌آباد کو دارالحکومت کرلیا تھا - ''بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خان کے کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خان صوبہ دار بنگالہ کے تھے سید مظفر علی خان (پدر افسوس) وارد مرشد آباد ہوئے اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت وامداد ہوئے . . . غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع‌الدولہ بہادر مع صوبیدار بنگالہ، صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہوئے تو سید مظفر علی خان بھی ہمراہ رکاب کے تھے - بعد میر محمد جعفر خان کی وفات کے روزگار نواب سیف‌الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا بلکہ لکھنؤ چلے آئے اور بعد کئی برس کے حیدرآباد کی طرف گئے (گلشن ہند ص ۵۷) - میر جعفر ۲۸ جون سنہ ۱۷۵۷ء کو سراج‌الدولہ کی جگہ نواب بنگال ہوئے (شوال سنہ ۱۱۷۰ھ) ان کی نوابی کا زمانہ ۱۰ ربیع‌الاول سنہ ۱۱۷۴ھ تک ہے - گویا مظفر علی خان ۱۰ ربیع الاول سنہ مذکورہ سے قبل لیکن ۱۱۶۷ھ کے بعد لکھنؤ پہونچ چکے تھے اور چند سال وہاں رہ کر ۱۰ ربیع‌الاول

۱۱۷۳ھ سے قبل ہی مرشد آباد پہونچ چکے تھے۔ ۱۰ ربیع اول سنہ مذکور میں میر قاسم ناظم بنگال ہوئے تو یہ ان کے ساتھ تھے بکسر کی لڑائی میں (۲۳ اکتوبر سنہ ۱۷۶۴ء = ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۸ھ) یہ میر قاسم کی طرف سے شریک تھے۔ میر جعفر کو انگریزوں نے اپنی طرف سے ۷ جولائی سنہ ۱۷۶۳ کو بنگال کا ناظم بنا دیا لڑائی کے ساڑھے تین ماہ بعد ۱۴ شعبان روز سہ شنبہ سنہ ۱۱۷۸ھ کو میر جعفر فوت ہوگئے (۵ فروری) نجم الدولہ غالباً ذی الحجہ سنہ ۱۱۷۹ھ میں اور سیف الدولہ اواخر سنہ ۱۱۸۳ھ میں فوت ہوئے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد اودھ پر انگریزی قبضہ ہوا۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۷۶۵ء اله آباد میں شجاع الدولہ سے انگریزوں کا معاہدہ ہوا تو یہ علاقہ انہیں واپس ملا۔ شجاع الدولہ (سنہ ۱۱۷۹ھ) اسی سال لکھنؤ آیا اور پھر فیض آباد کو دارالحکومت قرار دے دیا۔ بظاہر افسوس کے والد کو بھی سنہ ۱۱۷۹ھ میں لکھنؤ آنا چاہیے اور شجاع الدولہ کے ساتھ ہی وہاں سے فیض آباد گئے ہوں گے۔ افسوس نے سنہ ۱۱۸۹ھ میں سالار جنگ برادر نسبتی شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی اور دس سال تک اس کے بیٹے میر نوازش علی سردار جنگ کے زمرۂ مصاحبین میں رہے (ملاحظہ ہو دیباچۂ سحرالبیان) میر حسن سے دس سال تک ان کا ساتھ رہا۔ سنہ ۱۱۸۹ھ یا سنہ ۱۱۹۰ھ میں جب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو سالار جنگ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ میں اٹھ آئے تھے۔ میر حسن اور افسوس دونوں ان کے متوسلین میں تھے۔ ظاہر ہے یہ بھی لکھنؤ آگئے ہوں گے۔ لیکن افسوس کی گذر اوقات لکھنؤ میں مشکل سے ہوتی تھی۔ سنہ ۱۱۹۳ھ میں صاحب مسرت افزا لکھتے ہیں۔

افسوس کہ از چندی فلک بلنگ فطرت بروباہ باری او را در شاخ گوزن افلاس آویختہ و بناخن کینہ جوئی رشتۂ اقتدارش گسیختہ اکنون در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد (ص ۲۴، ۲۵)۔

۵ جمادی الاخر سنہ ۱۱۹۸ھ میں جہاندار شاہ لکھنؤ پہنچے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ میں افسوس ان کی سرکار میں ملازم ہوگئے اور بنارس چلے گئے (ملاحظہ ہو دیباچۂ سحرالبیان) ''جن ایام میں نیر اوج شہر یاری (جہاندار شاہ) کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا اور کوچ شاہجہان آباد کو ہوا تو میر مذکور (افسوس) بہ سبب بعضے عوارض کے رہ گئے اور ساتھ نہ جاسکے،، (گلشن ہند ص ۵۷) جہاندار شاہ سنہ ۱۲۰۱ھ میں دلی گئے تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۱ھ میں اکبرآباد میں تھے۔ ۱۵ رجب کو فرخ آباد کے راستے سے لکھنؤ آئے (تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص ۲۶۶) اور پھر بنارس پہنچے ہوں گے جہاں انہوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۰۲ میں وفات پائی (قاموس المشاہیر ترجمہ جہاندار شاہ) سر جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے کہ ۲۱ مئی سنہ ۱۷۸۸ء (= ۲۴ شعبان سنہ ۱۲۰۲ھ) کو وفات پائی (پچھلے مغل جلد چہارم ص۲۲۷) افسوس سنہ ۱۲۰۱ھ کے اوائل میں (لیکن وفات میر حسن کے بعد) لکھنؤ آئے ہوں گے۔ بعد میں مرزا فخرالدین احمد خان کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں نوکر ہوئے (دستور الفصاحت ۔ احمد علی یکتا ص ۱۰۲، ۱۰۳ نیز آرائش محفل، افسوس، مطبوعہ انجمن ترقی اردو طبع اول ص۵) کلکتہ جاتے ہوئے مرشدآباد میں افسوس مرزا علی لطف (صاحب گلشن ہند) سے بھی ملے تھے۔ افسوس نے کلکتے میں سنہ ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی۔ ''رفت افسوس زین جہان افسوس،، مندرجہ ذیل دیباچہ سحرالبیان سے میر حسن اور افسوس دونوں کے حالات اور تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۵)

دیباچۂ سرالبیان
(شیر علی افسوس)

حمد کی لیاقت اُسی صانع کو ہے جس نے عناصر اربع۱ کو کہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اپنی قدرت کاملہ سے ربط دے کر ارکان ٹھہرایا اور کیفیت متوسط پر مرکبات کے اجسام کو بنایا، لیکن انسان کو ہر مخلوق سے شریف تر اور لطیف تر خلق کیا کہ نفس ناطقہ نے علاقہ اُسی سے پکڑا اور وہی کلیات و جزئیات کی حقیقت سے ماہر ہوا۔ یہاں تک تعلیم و تعلم کا سلیقہ اُسے بخوبی آگیا اور اُس کی زبان میں بڑی استعداد ہر لغت کے تلفظ کی بخشی۔ چنانچہ اُس نے جس بولی کو چاہا سمکھ لیا بلکہ سکھا دیا۔ پس لازم ہے کہ اس کے شکر میں ہر دم اپنی زبان گویا رکھے اور اُس کی حمد کو ہر حال میں اپنا ورد کرے۔ مثنوی۲:

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول
کہ یاد اس کی ہے دونوں جگ کا حصول

اُسی کو مددگار اپنا سمجھ
اُسی کو فقط یار اپنا سمجھ

برے وقت میں کوئی اُس کے سوا
ترے کام آوے یہ امکان کیا

محبت سے سب کے اٹھا اپنا دل
فقط اُس سے ہی بس لگا اپنا دل

۱ - آسی کے ایڈیشن میں ''اربعہ''۔
۲ - آسی: یہ لفظ نہیں ہے۔

زباں تیری گویا رہے جب تلک
اور امکاں سخن کا رہے جب تلک

کیا کر ثنائے جہاں آفریں
سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں

جو بعد اس کے منظور ہو کوئی بات
تو کہہ نعت احمدص شہ کائنات

فی‌الواقع ستودۂ خدا سب انبیا و اولیا ہیں، تعریف ان کی موافق مقدر ہر ایک کو ضرور ہے، خصوصاً نعت و منقبت خاتم‌المرسلین اور آں کے وصی امیرالمومنین علیہما‌السلام کی کیونکہ انہوں ہی نے دنیا میں ہم کو راہ ہدایت کی بتلائی کہ ہم نے منزل ایمان کی سہولت پائی، عاقبت میں بھی امید شفاعت کی اور نعمائے جنت کی انہیں سے رکھتے ہیں - مثنوی۱ :

بھروسہ کسی کا نہیں اک ذرا
ہے ان کا ہی ہم کو فقط آسرا

نبیص و علیرض اپنے ہیں پیشوا
نبیص و علیرض اپنے ہیں رہنما

انہیں سے ہے کونین میں مجھ کو کام
وے مولا ہیں میرے میں ان کا غلام

درود ان پر اور ان کی اولاد پر
بدل بھیجتا ہوں میں شام و سحر

بعد اس حمد و نعت کے مثنوی سحرالبیان اسم با مسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کے لبھانے کو موہنی

۱ - یہ لفظ آسی کے ہاں نہیں ہے۔

منتر ہے اور۱ داستان اس کی سحر سامری کا دفتر، جو چیز کہ حقیقت میں خوب ہوتی ہے وہی طبائع کو مقبول و مرغوب ہوتی ہے۔ راست ہے کہ اس کا انداز سراپا اعجاز ہے، اور وہ ہر ایک صاحب طبعیت کے دم ساز، تعریف اس کی جہاں تک کیجے بجا ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کا اس میں ایک دریا بہا ہے۲ صلے کا اس کے ماجرا یہ ہے کہ نواب وزیرالمالک آصف‌الدولہ بہادر۳ مرحوم نے ایک دو شالہ خاص اپنے اوڑھنے کا دست بقچہ۴ میں سے نکلوا کر مصنف۵ عنایت کیا۔ رتبہ تو اُس کا البتہ بڑھا پہ دل گھٹ گیا۔ اس لئے کہ مطلب دلی حاصل نہ ہوا۔ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے کیونکہ مال کھرا، خریدار اتنا بڑا، اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا، بلکہ گھاٹا آیا۔۶ مصنف سحرالبیان۷ میر حسن۸ خلف

---

۱ - آسیؔ : ''اور'' کے بعد ''ہر''۔

۲ - آسی : یہاں یہ فقرے بھی ہیں : احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اس کی بندش میں سستی پائی جائے تو قابل نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اس لئے کہ جہاں ہنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بہ قلت شمار میں نہیں آتا۔ اور تعرض اس کا منصف مزاجوں کو نہیں بھاتا۔ بقول شخصے :

شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست

۳ - آسی : ''بہادر'' نہیں لکھا۔

۴ - دست بقچے۔

۵ - کو۔

۶ - آسی : ''یہ چند سطریں مصنف کے حسب و نسب اور احوال میں ہیں''۔

۷ - ''اس کا'' ''سحرالبیان'' کی جگہ۔

۸ - اضافہ : ''دہلوی متخلص بہ حسن''۔

میر غلام حسین صاحب (ضاحک؟)۱ -

(وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات اور دادا اُس عالی قدر کا فاضل متبحر اور فقیہ بے مثال تھا اور باپ کو فضیلت تھی لیکن فارسی کی استعداد خوب ہے بلکہ شعر بھی رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ رباعی طبع زاد اُس کی راقم نے اُس کی زبانی سنی ہے - رباعی۲ :

فریاد دلا که غم‌گساران رفتند
سیمین بدنان و گل عذاران رفتند
چو بوئی گل آمدند بر باد سوار
در خاک چو قطره های باران رفتند

قصیدہ بھی ایک۳ اور اسی مغفور کا تہہ دار۴ دیکھا ہے - لیکن هزل بر از بسکہ مزاج مرغوب تھا - غزل کہنی ترک کی تھی،

---

۱ - اضافہ ''ضاحک کا،، -
۲ - اس پیرے کی جگہ آسی نے مندرجہ ذیل عبارت دی ہے :
''وطن اجداد شہر ہرات قوم سادات گردش فلکی سے آنہوں نے شہر مذکور کو چھوڑا اور دلی میں آ کر پرانے شہر کا رهنا اختیار کیا - وهیں یہ بزرگ پیدا هوا بلکہ سن تمیز کو پہونچا - دادا اس عالی قدر کا سنتے هیں کہ حاجی و فاضل تھا - لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی مگر طالب علمی میں شرح ملا تک پڑھا تھا، پر فارسی میں استعداد اچھی تھی - بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا چنانچہ یہ رباعی طبع زاد اُس کی راقم نے اُس کی زبانی سنی ہے : ،، -
۳ - اور کی جگہ ''آدھ،، -
۴ - ''تہ دار،، کی جگہ ''رتبہ وار،، -

قیامت ہنسوڑ اور ٹھٹھول تھا ۔ تخلص اُس کا اس در دال ہے ۔ بہ ظاہر نہایت ثقہ اور متشرع، اکثر عمامہ سبز سر پر باندھا تھا، اور جامہ کم گھیر اصل پتی کا گلے میں، ڈاڑھی متوسط لبی لی ہوئیں۱، قد میانہ گندم گوں لیکن میرحسن ڈاڑھی منڈواتے تھے پر جامہ نیمہ ان کا بھی ویسا ہی تھا اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستان زادوں کی سی، قد لمبا تھا اور رنگ گندمی، ہر چند وضع تو ایسی تھی پر شوخ مزاج و لطیفہ گو۲ بھی تھے۳ ۔

سوائے اس کے بردباری اور ملنساری آن کی خلقت میں تھی، کسی کو میں نے اس عزیز سے شاکی نہیں دیکھا۔۴ طبع اس کی موزوں طفولیت سے تھی ۔ شعر کی طرف رغبت رکھتا تھا، خواجہ میردرد کی صحبت سے مستفید شاہجہان آباد میں اکثر۵ لڑکپن کے بیچ ہوا ہے، اور بعد برہم ہونے سلطنت کے شہر مذکور سے مجبور اپنے والد کے ساتھ صوبۂ اودھ میں آیا۔ سکونت فیض آباد کی اختیار کی، علاقہ روزگار کا نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کی سرکار میں بہم پہونچایا ۔ مرزا صاحب۶ مرزا نوازش علی خاں بہادر سردار جنگ دام ثروتہ کا ہوا، مرزائے موصوف بڑا بیٹا نواب مغفور کا ہے،

---

۱ ۔ ”لی ہوئیں“ کی جگہ ”لی ہوئی“ ۔
۲ ۔ ”وے“ : اضافہ ۔
۳ ۔ اضافہ : ”نہ ہزال و فحاش“ ۔
۴ ۔ ”دیکھا“ کی جگہ ”پایا، اور بیزارنہیں دیکھ“ ۔
۵ ۔ ”اکثر“ نہیں ہے ۔
۶ ۔ مرزا صاحب کی جگہ ”مصاحب“ (برٹش میوزم کے نسخے میں ممکن ہے کاتب کی غلطی ہو) ۔

خدا اُسے سلامت[1] کہ اشعار فارسی[2] سے اُسے رغبت اور شعر کی اُسے[3] محبت ہے، چنانچہ میر مذکور کو بھی اُس نے اپنا جلیس و انیس[4] کیا تھا، اور وہ تھا بھی اسی لائق، اگرچہ علم مبہا[5] نہ تھا بلکہ[6] فارسیت تھی بلکہ جستہ جستہ شعر یا کوئی رباعی[7] کہہ[8] لیتا تھا۔ لیکن علم مجلس میں بے بدل اور شعر ہندی میں اکمل تھا۔ مشق سخن اُس نے اسی ملک میں میر ضیاالدین ضیاء تخلص سے، کہ ہم مشق مرزا سودا اور میر تقی میر کے تھے، کی تھی لیکن میدان سخن میں ان صاحبوں سے توسن طبع کو بڑھا لے گیا[9] غرض میر مرحوم صاحب دیوان ہے۔ غزل، رباعی مثنوی، مرثیہ میں سلیقہ نہایت خوب رکھتا ہے، بلکہ سوائے قصیدے کے ہر قسم کی نظم پر قادر تھا، سچ تو یہ ہے کہ ادا بندی کا حق آن۔ خوب ادا کیا، اور انداز شعر کا کس خوبی سے کہا کہ بیان اس کا کیا نہیں جاتا[10] خدائش بیامرزاد حلیہ ہائے بہشت عطا کناد[11] راقم کو اُس سے

۱ - اضافہ : رکھے۔
۲ - ''فارسی'' نہیں ہے۔
۳ - ''شعر کی اُسے'' کی جگہ ''شعرا سے''۔
۴ - ''انیس و جلیس''۔
۵ - ''مبہا'' کی جگہ یہ عبارت ہے ''عربی اُسے مطلق''
۶ - ''بلکہ'' کی جگہ ''ہاں''
۷ - اضافہ : ''کبھو''
۸ - اضافہ : بھی۔
۹ - اس فقرہ کی جگہ مندرجہ ذیل عبارت : ''سوائے ان کے مرزا نے مرحوم سے بھی ان کی غیبت میں اکثر اوقات اصلاح لی تھی، چنانچہ اس کا اقرار راقم کے سامنے کیا ہے''۔
۱۰ - اس فقرے کی جگہ صرف ''رکھا''
۱۱ - یہ فقرہ بھی نہیں ہے۔

دوستی دلی تھی کبھی۱ خفگی و رنجش۲ باہم نہیں ہوئی، حالانکہ اسی سرکار میں میں بھی نوکر اور اسی صاحب زادے کا ہم نشین تھا، دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے بلکہ اکثر آپس میں غزلیں۳ طرح ہوئیں اور صحبتیں شعر کی رہیں، لیکن نہ بطور استفادہ کے جتنا۴ کہ علی ابراہیم خاں مرحوم۶ نے بے تحقیق اپنے تذکرے میں لکھا ہے، صاف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے مشورہ سخن کا اس مرحوم سے بھی کیا ہے، اگر یہ بات حقیقت میں ہوتی تو کچھ عیب نہ تھا ۔ ہرگاہ حقیر میر حیدر علی حیران کی شاگردی کا مقر ہے، باوجود اس کے کہ شاعری ان کی میر حسن سے زیادہ نہ تھی ۔ پھر کس لئے اس بات سے انکار کرتا ۔ قاعدہ یہی ہے کہ ایک سے سیکھتے ہیں اور دوسرے کو سکھاتے ہیں، لیکن جھوٹی بات پر اقرار نہیں کیا جاتا اور سچی بات سے انکر نہیں کیا جاتا ہے۷

آخر چرخ تفرقہ پرداز نے باہم تفرقہ ڈ لا، اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سے ننانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا، میں ان کے ہمراہ بنارس میں آیا ۔ بعد اس کے اس بزرگ کو آخر ذی الحجہ سنہ بارہ سے میں مرض الموت لاحق ہوا بدان (کذا) ماہ محرم کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے کہ

---

۱ - ”کبھو،،
۲ - ”رنجش خفگی،،
۳ - اضافہ : ہم
۴ - ”جیسا،،
۵ - اضافہ : ”نواب،،
۶ - ”مرحوم،، کی جگہ ”مغفور،،
۷ - ”ہو سکتا،،

بتاریخ پانچویں ماہ محرم کے اس دارفانی سے اُس سرائے جاودانی کو کوچ کیا، اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج بیچ مرزا قاسم علی خان بہادر دام ظلہ کے باغ کے پہوچے مدفون ہوا ۔ خدائے کریم اس کو یہاں دارالسلام عطا کرے اور وہاں قصر جنت بخشے :

عدم سے مسافر جو آیا یہاں
مقرر وہ ایک روز جاوے گا واں

رکے جگ میں ہر چند وہ ہر کہیں
پر اُس کا ٹھکانا ہے زیر زمیں

نہ غفلت میں اپنی تو اوقات کھو
ارے بے خبر جاگتے میں نہ سو

جہاں میں تو مہمان ہے چند روز
ترے جسم میں جان ہے چند روز

یہ مہلت غنیمت ہے کر لے وہ کام
کہ جس سے رہے تا ابد نیک نام

فی‌الواقع نیک نامی بھی عجیب چیز ہے، انسان کا نام اسی سے زندہ رہتا ہے یا کلام و اولاد سے، سو وہ خوش نصیب ہیں (کذا) ۱

---

۱ - اس فقرے کی جگہ : ''سنہ بارہ سے ہجری میں مرض‌الموت لاحق ہوا، ندان غرۂ محرم کو کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے اس دارفانی سے اُس سرائے جاودانی کو کوچ کیا،،

۲ - ''بیٹے،، (اور یہی صحیح ہے)

دونوں اس سمت (کذا)، چھوڑ گیا، چار بیٹے فضل الہی سے اس کے اب تک موجود ہیں، تین شاعر ہوئے، کہ بود و باش انہوں نے فیض آباد میں اختیار کی ۔ معاش نوکری پر ہے، چنانچہ میر مستحسن خلیق تخلص اور میر محسن محسن تخلص، مرزا تقی بہو بیگم صاحب مادر آصف‌الدولہ مد ظلہما کے داماد کے رفیق ہیں اور میر احسن۲ خلق تخلص داراب علی خان ناظر کے ساتھ ہیں۳ ۔ یہ اور خلیق دونوں صاحب دیوان ہیں، شعر اپنے باپ ہی کے انداز پر کہتے ہیں، لیکن خلیق کا سرشتہ اصلاح کا میاں مصحفی سلمہ اللہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ خدا۴ انہیں سلامت رکھے ۔ یہ۵ چند فقرے بطور دیباچہ زبدۂ دوستان۶ عالی شان مشیر۷ خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی لارڈ۸ گورنر بہادر دام اقبالہ کے عہد میں۹، ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء کے ہیں، حسب‌الارشاد صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ صاحب۱۰ بہادر مدرس ہندی دام دولتہ

---

۱ ۔ ''دونوں اس سمیت'' (یہی درست ہے)

۲ ۔ ''میر حسن خلق۔'' (یہ درست نہیں ۔ صحیح وہی ہے جو اوپر مذکور ہے)

۳ ۔ ''ہیں''؛ کی جگہ ''ہے''

۴ ۔ اضافہ : ''آسے اور''

۵ ۔ ''یے''

۶ ۔ ''دوستان'' کی جگہ ''نوینان''

۷ ۔ اضافہ ''مظہر''

۸ ۔ ''لارڈ''

۹ ۔ اضافہ : ''کہ''

۱۰ ۔ ''صاحب'' ندارد

کے اس عاصی نے لکھے اور ان کو اس مثنوی کا مضیمہ (کذا)۱ کیا، واللہ الی التوفیق۲ - تمام شد۳ -

(مئی ۱۹۵۷ء)

۱ - ضمیمہ (اور یہی صحیح ہے) نسخہ برٹش میوزیم میں کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے

۲ - آسی کے ہاں یہ عبارت نہیں ہے

۳ - تمام شد کے بعد آسی کے ہاں : دیباچۂ میر شیر علی افسوس،،



ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم

چندا

(اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ)

خدا نے شاعری کا ملکہ ودیعت کرنے میں اگرچہ مرد و زن کی تخصیص نہیں کی لیکن اس میں شک نہیں کہ دنیا کی ہر زبان کے شاعروں کی غالب اکثریت مردوں کی رہی ہے ۔ اس کے جہاں اور وجوہ ہو سکتے ہیں ایک بڑی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ عورت کی فطری حیا انسان کے متنوع خیالات اور متلون جذبات کے اظہار کے راستے میں حائل رہی ہے ۔ دنیا کے دوسرے ملکوں اور زبانوں کی شاعری کے سلسلے میں یہ بات پورے طور پر درست نہ بھی ہو، اسلامی مشرق خصوصاً ہندی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں غور طلب ضرور ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں عورت کا مقام جب تک کلی طور پر پس دیوار رہا، اردو شاعرات کا سراغ نہیں ملتا ۔ اس کی شہادت ان تذکروں سے بھی ملتی ہے جو اردو شاعری کے آغاز سے لے کر شاہ عالم ثانی

کے زمانے تک کے شاعروں پر لکھے گئے ہیں ۔ ان میں سے دو تذکرے، ایک خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا گلشن گفتار اور دوسرا لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا چمنستان شعراء تو جنوبی ہند میں لکھے گئے ہیں اور باقی دہلوی ماحول کی پیداوار ہیں ۔ دہلی میں لکھے جانے والے تذکروں میں میر کے نکات الشعراء، قیام الدین قائم کے مخزن نکات اور فتح علی گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ ان سب تذکروں کے اوراق کی سیاہی میں صنف نازک کا ایک نام بھی چمکتا ہوا دکھائی نہیں دیتا ۔ نواب درگاہ قلی خان نے اپنی مشہور تصنیف مرقع دہلی میں بارھویں صدی ہجری کی دہلی کی جو رنگین تصویر کھینچی ہے اس میں بھی جہاں ارباب نشاط اور بعض دوسرے اہل فن اور شاعروں کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں، کسی اردو شاعرہ کا نقش نظر نہیں آتا ۔

سیاسی اور اقتصادی حالات کے تحت جب اردو شاعری کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنو منتقل ہوا تو یہاں پہلی دفعہ چند شاعرات منظر عام پر آئیں ۔ جن میں سے کچھ تو شہزادیاں تھیں اور کچھ بازاری عورتیں ۔ غلام ہمدانی مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویاں میں ان میں سے پانچ چھ کے حالات لکھے ہیں ۔ لکھنؤ میں شاعرات کا وجود وہاں کی اس مخصوص تہذیب اور منفرد معاشرت کا مرہون منت ہے جو شاہان اودھ کے زمانے میں پیدا ہوگئی تھی ۔ اس معاشرے میں عورت اور مرد کے درمیان وہ آہنی پردے اور اونچی دیواریں حائل نہ رہی تھیں جو دہلوی تہذیب کا خاصہ تھا اور عورت پردے سے نکل کر تیزی سے میلے ٹھیلوں، عرس تماشوں، مجلسوں اور سیرگاہوں بلکہ کوٹھوں کی زینت بن رہی تھی

اور امرا و شرفا طوائفوں اور رنڈیوں سے راہ رسم رکھنے کو معاشرت کا ایک ضروری جز تصور کرنے لگے تھے ۔ فیض بخش نے تاریخ فرح بخش اور غلام علی نے عمادالسعادت کے نام سے شاہان اودھ کے جو حالات لکھے ہیں ان میں بادشاہوں اور رعایا کی رنگینی طبع کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے مضمون ''مشرق تمدن کا آخری نمونہ'' میں تو بڑی وضاحت سے سب کچھ لکھا ہے ۔ آخری شاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کی زندگی اور تصانیف میں بھی لکھنو کی اندر سبھاؤں کے مرقعے موجود ہیں ۔ اردو اصناف سخن میں ریختی کی اختراع بھی عورتوں کے ساتھ اسی کھل کھیلنے کا نتیجہ ہے ۔ ایسی فضا میں جہاں انشاءاللہ خاں انشا، سعادت یار خاں رنگین اور جان صاحب نے عورتوں کی زبان اپنے منہ میں لے کر شاعری میں چٹخارے لئے اور قلندر بخش جرأت نے معاملہ بندی کے پردے میں صنف نازک کے ساتھ چوما چاٹی کے مزے لوٹے، خود عورتوں نے بھی جذبات دل کے اظہار میں کوئی جھجک یا شرم محسوس نہ کی اور پھر جب دہلی اور لکھنو کی سلطنتوں کے سقوط کے بعد مغربی تمدن کی عام رو نے اخلاقی قدروں کو بالکل نئے زاویے بخشے تو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کئی شاعرات پیدا ہونے لگیں اور ان کے حالات و کوائف پر باقاعدہ تذکرے لکھے جانے لگے ۔ ایسے تذکروں میں کریم الدین کے تذکرہ گلدستہ ناز، عبدالحی صفا کے تذکرۂ شمیم سخن اور درگا پرشاد نادر کے تین تذکروں، تذکرۂ گلشن ناز، تذکرہ چمن انداز اور تذکرہ بہارستان ناز کے نام قابل ذکر ہیں ۔ ان تذکروں میں جن عورتوں کا ذکر ہے وہ معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں

شہزادیوں اور شریف زادیوں سے لے کر رنڈیوں اور طوائفوں تک کے نام دیکھنے میں آتے ہیں، مگر ان میں کثرت ایسی شاعرات کی ہے جن کا سرمایۂ شعری چند اشعار، غزلوں یا نعتوں سے زیادہ نہیں ۔ باقاعدگی سے شعر کہنے والی عورتیں گنتی کی ایک دو ہیں اور ان میں ایک طوائف ماہ لقا متخلص بہ چندا کا نام اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے باقاعدہ اپنا دیوان مرتب کیا ہے اور غالباً اس میدان میں اولیت کا سہرا بھی اسی کے سر ہے ۔

چندا ایک بہت اونچے گھرانے کی عورت تھی ۔ اس کا باپ مرزا سلطان بلخ سے ہندوستان آیا تھا ۔ شاہنواز خان نے مآثرالامراء میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عالم کی شہزادگی کے زمانے میں صلابت خاں اور بادشاہی زمانے میں بسالت خاں کے خطاب سے بخشئی فوج کے عہدہ پر ممتاز تھا ۔ اس کی شادی گجرات کی ایک حسینہ راج کنور بائی سے ہوئی تھی ۔ اسی راج کنور بائی کی کوکھ سے ۱۱۷۲ھ میں چندا پیدا ہوئی ۔

چندا کو بچپن ہی سے معیاری تعلیم و تربیت دی گئی اور علم و ادب کے ذوق کے ساتھ ساتھ اس میں بعض مردانہ فنون کا شعور بھی پیدا کیا گیا، چنانچہ اس نے عنفوان شباب کو پہنچنے تک اسپ تازی، نیزہ بازی اور تیراندازی کے فن میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچالی ۔ درگاپرشاد نادر تذکرۂ چمن انداز میں اس کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"وہ سوار ہو کر اس قدر آسن جماتی تھی کہ جولانگاہ میں اچھے اچھے چابک سواروں کا قافیہ تنگ کرتی تھی"۔

مولوی کریم الدین، صاحب طبقات الشعراء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مردوں کی مانند ورزش کرتی تھی، لیکن چندا اپنے ان مردانہ اور سپاہیانہ مشاغل کے باوجود علم و فن میں سرآمد روزگار تھی۔ شعرگوئی کا نہ صرف خود ذوق رکھتی تھی بلکہ دوسرے شاعروں کی سر پرستی بھی کرتی تھی۔ عبدالغفور نساخ نے تذکرہ سخن شعرا میں کہا ہے کہ وہ شاعروں کی بہت عزت کرتی تھی۔ عبدالحی صفا نے شمیم سخن میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ چند شاعر اس کے باقاعدہ نوکر تھے۔ اس فقرے سے غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ کچھ شاعر چندا سے توسل رکھتے تھے اور وہ ان کی معیشت کی کفیل تھی۔ یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ چندا طبعی ذوق رکھنے کے علاوہ ایک مالدار اور صاحب حیثیت عورت بھی تھی۔ اس نے بےشمار دولت ورثے میں پائی تھی۔ اس کا ثبوت تذکرہ بہارستان ناز کی اس عبارت سے مل سکتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ :

”چندا ایک امیر عورت تھی اور پانچ سو سوار ہر وقت اس کے جلو میں رہتے تھے“۔

چندا کے گھر پر شاعرانہ محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں دوسرے اچھے اچھے شاعروں کے علاوہ عہد آصفیہ کے مشہور شاعر اور وقائع نگار، شیر محمد خاں ایمان خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ ایمان چندا کے استاد تھے اور اس پر جان چھڑکتے تھے۔ محی الدین زور نے مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایمان کا چندا سے خاص تعلق تھا۔ اس تعلق کی غمازی کلیات ایمان کے بعض اشعار، رباعیوں اور نظموں سے

بڑی ہوتی ہے ۔ چندا کی شان میں ۱۷۵ اشعار کی ایک مثنوی میر عالم بہادر نے بھی لکھی ہے جس میں اس کے حسن کی بہت تعریف کی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو دیکھیے ۔

اے مہر سپہر روشنائی　　سر تا پای تو دلربائی
اے مردم دیدۂ محبت　　سر تا قدمت طلسم الفت

یہ محض شاعرانہ خیال آرائی اور مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ اس زمانے کے بعض تذکرہ نگاروں اور دوسرے مصنفوں نے بھی اس کے حسن شور انگیز کا ذکر کیا ہے قدرت‌الله قاسم مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں کہ :

''بہ‌عشوہ و ناز دلہا می رباید اما سرش بہ ہر کس فرونمی آید،، ۔

سید نصیرالدین خاں قدرت نے سلاطین آصفیہ کی تاریخ دلفروز کے دیباچے میں جس کی تالیف چندا کی مرہون منت ہے، اسے ''ماہ منیر فلک انبساط،، اور ''نازنین چار بالش رعنائی،، کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ اس تاریخ کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔ اس کی وجہ تالیف خود چندا نے ان الفاظ مین بیان کی ہے ۔

''چون حقوق تربیت و عنایت خاندان عالیہ آصفیہ خصوصی نوازش و عنایت حضرت نواب غفران مآب آصف جاہ ثانی برین عاجزہ بے مقدار بہ چندین سرفرازی ها ثابت و محقق است لہذا دل فدویت چنان می خواهد کہ تاریخ در مآثر ایام سلطنت آن حضرت بہ عنوان اجمال کردہ شود،، (بحوالہ یورپ میں دکنی مخطوطات) ۔

اس اقتباس سے جہاں چندا کی علمی مصروفیات پر روشنی پڑتی ہے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ آصف جاہ ثانی کی پروردہ تھی۔ نصیرالدین خاں قدرت نے راجہ راؤ رنبھا بہادر سے بھی اس کے توسل کا ذکر کیا ہے۔

سپاہیانہ مشاغل، علمی مذاق اور ادبی ذوق کے علاوہ چندا رقص و موسیقی کے فن میں بھی اپنی نظیر آپ تھی۔ اس کا مظاہرہ وہ اکثر ایسی مجلسوں میں کیا کرتی تھی جن میں امراء اور شرفاء شریک ہوتے تھے۔ بعض دفعہ اونچے طبقے کے انگریزوں کی محفلوں میں بھی مدعو کی جاتی تھی۔ بلوم ہارٹ نے کتب خانہ انڈیا آفس لندن کے مخطوطات کی فہرست میں ایک ایسی ہی تقریب کا ذکر کیا ہے جو ۱۸ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو مسٹر ایلسن کے گھر پر منعقد ہوئی تھی اور اس میں سر جان ملکم بھی موجود تھے۔

چندا کی اس پہلودار شخصیت سے رقص و موسیقی کے پہلو کو لیکر ہی شاید بعض تذکرہ نگاروں نے اسے بازاری عورت اور رنڈی کہہ دیا ہے۔ چنانچہ مولوی کریم الدین طبقات شعراء میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک محبوبۂ بازاری ہے۔ مولف تذکرہ اختر تاباں نے تو اس کی نوچیوں کا ذکر بھی کر دیا ہے یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ فارسی میں اردو شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں چندا کو رقاصہ اور طوائف کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً قدرت اللہ قاسم مجموعۂ نغز میں کہتے ہیں :

"چندا رقاصہ زنی است روشن اندام"

اور اس رقاصہ کے لفظ سے بعد کے تذکرہ نگاروں نے دھوکا کھا کر اسے بازاری عورت بنا دیا ۔ اصل میں نہ وہ بازاری عورت تھی اور نہ رنڈی بلکہ محض ایک رقاصہ یا طوائف تھی ۔ طوائف کا لفظ آج کل ہر اس عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو عصمت فروشی کے لئے بازار کی زینت بنتی ہے، لیکن قدیم زمانے میں اس لفظ کا اطلاق محض اس عورت پر ہوتا تھا جو مختلف جگہ گھوم پھر کو اپنے رقص خصوصاً موسیقی کے فن کا مظاہرہ کرتی تھی ۔ چندا کو تذکرہ نگاروں نے انہی معنوں میں طوائف یا رقاصہ کہا ہے البتہ یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ اتنے اونچے اور شریف خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے رقاصہ اور طوائف بننا کیوں پسند کیا ۔ تذکرہ نویس اس بارے میں خاموش ہیں ۔ مجھے اس میں چندا کی ماں راج کنور بائی کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے ۔ یہ راج کنور بائی کون تھی ۔ مورخوں نے اسے محض محمد حسین کی بیٹی اور گجرات کی حسینہ کہنے پر اکتفا کی ہے، ایک آدھ نے اسے گجرات کی خاندانی حسینہ بھی کہا ہے لیکن نام سے کچھ یوں شبہ پڑتا ہے کہ وہ خاندانی ہونے کے بجائے اہل نشاط میں سے تھی یا کم از کم اس زمانے کی عام مسلمان گھریلو عورتوں کے برعکس آزاد منش ضرور تھی ۔ ماں کی شخصیت و اثر کا یہ عکس چندا کے نام میں بھی نظر آتا ہے ۔ وہ اگر راج کنور بائی تھی تو یہ ماہ لقا بائی . . . . قیاس کہتا ہے کہ چندا نے ماں کے سایۂ عاطفت میں رقص و سرود کے جس فن میں گھر پر کمال حاصل کیا تھا اسی کی نمود کے شوق اور بعض احباب کے تعلقات اور تقاضوں نے اسے معزز اور خاندانی گھرانوں کی مختلف تقاریب میں شریک ہونے پر بھی مجبور کیا ۔

ورنہ وہ ایک با اخلاق عورت تھی ۔ چندا کی شخصیت کے ان متضاد عناصر کا کئی مصنفوں نے ذکر کیا ہے :

منصف تاریخ دل افروز اس کے نظام الاوقات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں ۔

"صبح اٹھ کر نماز پڑھتی اور طلوع آفتاب تک داعیہ میں مصروف رہتی ۔ پھر قرآن پڑھتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوپہر کو ظہر کی نماز پڑھ کر عصر تک برابر تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتی ۔ نماز عصر کے بعد دیوان خانہ میں آتی اور گھریلو امور کی طرف توجہ دیتی ۔ اس کے بعد اہل علم و سخن جمع ہوتے اور دیر تک علمی ادبی گفتگو ہوتی ۔ کتابوں کا بڑا شوق رکھتی تھی ۔ اکثر حبیب‌السیر اور روضۃالصفا زیر مطالعہ رہتیں ۔ بعض فارسی اور ریختہ دیوان بھی پڑھتی یہ صحبت نماز مغرب تک جاتی ۔ اس کے بعد کھانا ہوتا ۔ نماز عشا سے فارغ ہونے کے بعد اساتذہ موسیقی جمع ہوتے اور آدھی رات تک یہ محفل گرم رہتی ۔ ۔ ۔ ۔ رمضان میں روزہ کی بجائے روزانہ ۱۲۰ خوان غربا کو دیا کرتی" ۔

(بحوالۂ دکن میں اردو)

اس پسندیدہ صورت اور نیک سرشت شاعرہ نے ۱۲۳۶ھ میں (تقریباً ۷۹ برس کی عمر میں) حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں کوہ مولا کے قریب مدفون ہوئی ۔ جہاں اس کا مقبرہ اب بھی موجود ہے ۔

چندا کا دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔ ایک نسخہ . . . . مخطوطہ کی صورت میں انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں اور غالباً ایک نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ اس کے شروع میں نصیرالدین خاں قدرت کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ ہے، جس میں پہلے حمد و نعت و منقبت ہے پھر آصف جاہ ثانی کی مدح میں شعر ہیں، اس کے بعد ارسطو جاہ دیوان وقت کی تعریف ہے پھر راجہ راؤ رنبھا بہادر کی مدح ہے اور آخر میں چندا کے کمال کی داد دی ہے۔ انڈیا آفس کے مخطوطہ کی تشریح بلوم ہارٹ نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''نمبر ۲۱۸۔ سائز ۹/۱/۲ × ۵/۳/۴ ہر صفحے پر ۱۱ سطریں نستعلیق''۔

یہ نسخہ چندا نے خود ایک رقص کی تقریب کے موقعہ پر سر جان ملکم کو تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ یہ بات دیوان کے سر ورق کی اس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔

''دیوان چندا۔ حیدر آباد کی ذی شان ملکہ یہ کتاب اس غیر معمولی عورت کی طرف سے سر جان ملکم کو ایک محفل رقص میں نذر کے طور پر پیش کی گئی''۔

یہ دیوان ۱۲۱۵ھ میں جب نواب نظام علی خاں آصف جاہ کی حکمرانی کے ۳۷ سال ختم ہو چکے تھے، مرتب ہوا۔ دیوان کی ترتیب کی تاریخ ''هوالطف الاعظم'' ہے۔

نو ورق کے دیباچے کے بعد اصل دیوان شروع ہوتا ہے۔ آغاز میں اس زمانے کی ادبی روایت کے مطابق حمد و نعت کے اشعار ہیں اور پھر ردیف وار غزلیں موجود ہیں۔

دیوان میری دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے میں چندا کے کلام پر کوئی ناقدانہ نظر نہیں ڈال سکتا ۔ البتہ جو اشعار مختلف تذکروں میں دیکھنے میں آئے ہیں ، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خوشگو اور شگفتہ کلام ہوگی ۔ نمونے کے طور پر چند شعر دیکھیے ۔

ملتے ہیں توقع پہ تری غیر سے کم ہم
رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشم کرم ہم

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے
قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

کم بخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینہ کو
پر کیا کروں کہ تیرا رو درمیان ہیگا

اور شاید یہ شعر اس نے اپنی صفائی میں کہا ہوگا :

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہیگا
پر آپکو غلط کچھ اب اک گمان ہیگا

(فروری ۱۹۶۰ء)

سخاوت مرزا

صراط المستقیم: کیا وجہی کی تصنیف ہے؟

وجہی تخلص، ایران و ہندوستان میں کئی شاعر گزرے ہیں۔ ایک تو وجہی تفرشی ملازم اکبر بادشاہ تھا، جس کو تقی اوحدی نے ۱۰۱۹ھ میں گجرات میں دیکھا تھا۔ دوسرا وجہی (علی اکبر بیگ) کرد، معاصر شاہ عباس ثانی، مشہور مزاح گو شاعر تھا۔ تیسرے علامہ سید وجیہہ الدین علوی گجراتی (۹۱۰/۹۹۸ھ) بھی فارسی میں کہا کرتے تھے اور تخلص وجہی تھا۔ چوتھا ملا وجہی گولکنڈوی، دکھنی زبان کا ایک باکمال شاعر اور نثرنگار مشہور ہے جس نے چار سلاطین قطب شاہی، یعنی سلطان ابراہیم قطب شہ (۹۰۷/۹۸۸ھ) و محمد قلی قطب شہ (۹۸۸/۱۰۲۰ھ) محمد قطب شہ (۱۰۲۰/۱۰۳۵ھ) اور سلطان عبداللہ قطب شہ (۱۰۸۳) کا زمانہ دیکھا ہے۔ مگر اس کے حالات تاریکی میں ہیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ یہ آخرالذکر تین سلاطین کا درباری شاعر تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ میں محمد قلی قطب شہ کا افسانۂ عشق، لکھا تھا جو مثنوی قطب مشتری کے نام سے مشہور ہے۔

وجہی کی تاریخ ولادت اور وفات کا کچھ پتا نہیں چلتا، اور



سخاوت مرزا

نہ اس کا نام ہی صحیح طور پر معلوم ہو سکا ہے ، البتہ یہ اپنے تخلص وجہی اور وجیہی سے معروف ہے ۔ چنانچہ مثنوی قطب مشتری میں، تخلص وجیہی اور سب رس (نثر) میں وجہی آیا ہے ۔ حدیقۃ السلاطین مولفہ نظام الدین احمد میں، بضمن تولد فرزند سلطان عبداللہ قطب شہ، "وجیہی" کو شاعر دکنی لکھا ہے ۔ ان شواہد سے مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ وجہی اور وجیہی دونوں تخلص کیا کرتا تھا ۔ ہمارے پاس بھی دو قوی دلائل ہیں ۔ وہ یہ کہ اس کے معاصر خواصی نے اس کو وجیہی سے مخاطب کیا ہے مثلاً کہتا ہے :

اس دکن کے شاعراں میں تج شہنشہ کے نزدیک
ہے خواصی ہور وجیہی شاعر حاضر جواب

مگر اس کا دوسرا معاصر افضل گولکنڈوی اس کو وجہی سے مخاطب کرتا ہے :

تجھ ایسے شاہ کو ہونا سو وجہی سار کا شاعر

اب سوال یہ ہے کہ اس کا نام کیا تھا ؟ بعض کاتبوں نے اس کا نام 'وجیہ الدین' اور گجراتی الاصل لکھا ہے ۔ چنانچہ کتبخانہ آصفیہ کے ایک قلمی نسخۂ سب رس مکتوبہ ۱۲۹۵ھ میں ہے :

"تمام شد کتاب گنج الاسرار الحمدللہ و المنتہ بحق حبیبہ، سبرس مصنف حضرت وجیہ الدین رحمۃ اللہ علیہ، بتاریخ روز سہ شنبہ شہر صفر المظفر ۱۲۹۵ھ باختتام رسید"
اور آخری اوراق میں حاشیہ پر مکرر کاتب نے یہ لکھا ہے :
"در تعریف مولانا وجیہ الدین قدس سرہ"

وجہی اپنی تصنیف ''سب رس کو اولاد معنوی کہتا ہے ۔ مثلاً

''اس کو خردمندان ہوے فرزندان خرمندان ہوے اس فرزندان میں ظاہراً فرزند سو یو کتاب لایق مستید ہر بات اپنے وقت کا لقمان، افلاطون اپنے وقت کا خسرو، فرہاد، مجنوں ۔ اپنے وقت کا خاقانی، انوری، سعدی ۔ اپنے وقت کا ظہیر، کمال، سلمان ۔ اپنے وقت کا ہر یک بات کا ہادی ۔ کلام کا صاحب، نام کا صاحب، الہام کا صاحب، ہر یک کام کا صاحب، روشن ضمیر الخ ۔''

نسخۂ تاج الحقایق (جامعۂ بمبئی) میں اس کے کاتب نے وجہی کا نام ''وجیہ الدین محمد'' لکھا اور پروفیسر عبدالقادر سرفراز مرحوم مرتب فہرست کتبخانہ جامعۂ بمبئی نے ''وجیہہ الدین وجہی'' بیان کیا ہے ۔ مگر اس کے متعلق کسی سند کا حوالہ درج نہیں، بہرحال وجہی نے اپنا تخلص اپنے نام ''وجیہہ الدین'' کی مناسبت سے رکھا ہو گا ۔

گجراتی الاصل ہونے کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے البتہ مولوی عبدالحق مدظلہ نے لکھا ہے

''گرچہ وجہی گولکنڈہ کا ہے اور گولکنڈہ اور حیدرآباد تلنگانے میں ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ مرہٹی مثل تو ایک جگہ لکھتا ہے ۔ ایک گجراتی لفظ اور شعر بھی استعمال کرتا ہے ۔ مگر کہیں تلنگی مثل یا فقرہ یا لفظ سوائے ''درا'' یا ''درائی(۱)''

---

۱ ۔ لفظ درا یا درائی کو مسٹر گرنا تھ راج نے لکھا ہے کہ یہ کنڑی لفظ ہے ۔

کے، جس کے متعلق ابھی مجھے شبہ ہے اس کتاب میں نہیں آیا، (سب رس مطبوعہ)،،

رسالہ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ میں ایک مضمون گرناتھ راج دیویکر کا بعنوان، ''قطب مشتری میں گجراتی کنڑی اور مرہٹی الفاظ،، شائع ہوا ہے - مضمون نگار نے گجراتی، مرہٹی، کنڑی الفاظ کی ایک فہرست دیدی ہے جس میں گجراتی الفاظ سے متعلق بھی دس مصرعے درج کیے ہیں - اس میں الفاظ، گمے، بچھیں، آمنہ، جونا، ہمے، نھاٹ کر، ماندگی، نھس، اوتول، ڈوسا، کو گجراتی الفاظ بیان کیا گیا ہے - مگر یہ الفاظ تو ایسے ہیں جن کو دکھنی شعراء عام طور پر استعمال کرتے ہیں - البتہ الفاظ 'جوتا، آمنہ، اور ڈوسا خاص معلوم ہوتے ہیں -

فاضل مضمون نگار نے بعض نامور ادیبوں کو مہاجرین گجرات قرار دیا ہے - ۹۸۰ھ میں زوال گجرات کے بعد نواب دلاور خان وزیر بیجاپور نے بعض علماء احناف متوطن گجرات کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا - وجہی اگر گجراتی الاصل ہے تو ممکن ہے کہ اس نے بجائے بیجاپور کے گولکنڈہ کو ترجیح دی ہو -

بعض کاتبوں نے وجہی کو گجرات کے مشہور و معروف علامہ وجیہہ الدین گجراتی ۹۹۸/۹۱۰ھ سے گڈمڈ کر دیا ہے - جو سلطان محمود بیگڑہ اور سلطان مظفر سوم گجراتی کے معاصر تھے، اور یہی زمانہ سلطان ابراہیم قطب شہ کا ہے -

علامہ وجیہہ الدین علوی (۹۹۸/۹۱۰ھ) گجرات کے ایک بڑے

محقق عالم، محدث اور صوفی تھے، مگر وجہی زیر بحث نے اپنی تصانیف میں علامۂ مذکور کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے ۔ البتہ سب رس میران جی، المعروف تاج الحقائق میں داورالملک ''شاہ داول گجراتی،، سے متعلق ایک ضرب‌المثل درج ہے اور خود سب رس مؤلفہ وجہی میں ایک اشارہ شاید حضرت محمد غوث گوالیاری کی طرف ہے جو علامہ علوی گجراتی کے پیر تھے ۔ مثلاً وہاں ''گوالیار کے چاتراں،، لکھا ہوا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں شاید وجہی نامی ایک اور شخص بھی گزرا ہے جس کا مذہب اثناءعشری تھا اور علوم عقلی و نقلی کا زبردست عالم تھا ۔ اس کی ایک تصنیف علم عقاید و کلام میں ''صراط المستقیم فی دین قویم،، بزبان فارسی، کتبخانۂ نواب سالار جنگ بہادر حیدر آباد میں محفوظ ہے ۔ مصنف نے اس کتاب کو سلطان ابراہیم قطب شاہ ۹۵۷—۹۸۸ھ سے معنون کیا ہے ۔

اب غور طلب یہ ہے کہ آیا یہ وجہی وہی مشہور شاعر و نثر نگار ہی ہے جس کی مثنوی قطب مشتری، تالیف ۱۰۱۸ھ اور ''سب رس،، نثر دکنی تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے؟ اس کا صحیح پتا چلانے کے لئے وجہی کے زمانۂ پیدائش و وفات اور عقاید پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے ۔

وجہی کے زمانۂ ولادت کے متعلق مولوی عبدالحق مدظلہ فرماتے ہیں کہ:

''یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بچپن محمد قلی قطب شہ کے زمانے میں بسر ہوا ۔ ''سب رس،، جب لکھی تو اس وقت ابراہیم قطب شہ کو مرے ہوئے اٹھاون برس ہوئے تھے ۔ اس حساب سے یہ امر مشتبہ ہے کہ وجہی نے ابراہیم قطب شہ کا زمانہ دیکھا تھا . . . الخ،،۔

ڈاکٹر زور حیدر آبادی فرماتے ہیں کہ :

''غالباً یہ ابراہیم قطب شہ (۹۵۷/۹۸۸ھ) کے عہد میں پیدا ہوا،،

اور یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ :

''اتنے قریب کے زمانہ میں ایک ہی دربار کے دو شاعر یعنی مصنف قطب مشتری اور سب رس ایسے گزر سکتے ہیں جن کا تخلص ایک ہی ہو،،۔

مگر یہ کوئی قوی استدلال نہیں معلوم ہوتا ۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ابراہیم قطب شہ کے زمانہ میں ایک وجہی تھا جو محض ایک فاضل تھا اور صرف فارسی کا شاعر تھا، اور دکھنی زبان سے اس کو تعلق نہ تھا ۔ اور محمد قلی قطب شہ کا درباری شاعر وجہی مصنف قطب مشتری تھا اور رس مثنوی کی تصنیف کے وقت وہ ایک مشاق اور مشہور شاعر تھا، جس کو مولوی عبدالحق قبلہ بھی مانتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ سب رس کی تصنیف (۱۰۴۵) کے وقت وجہی ۷۲ سال کا تھا ۔ مگر کوئی سند پیش

نہیں فرمائی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو وجہی کی عمر ابراہیم قطب شہ کے زمانے میں پندرہ سولہ سال کی تھی۔

ہمارا استدلال یہ ہے، اور یہ امر مسلمہ ہے کہ وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں ایک شاعر فیروز کی بڑی تعریف کی ہے، جو، حضرت شیخ ابراہیم ملتانی (المعروف بہ مخدوم جی قادری بیدری المتوفی ۹۷۲ھ) کا دیکھنے والا ہے۔ نیز دوسرے شاعر محمود کی بھی تعریف کی ہے جو مثنوی مذکور کی تالیف سے بہت عرصہ قبل فوت ہو چکے تھے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ وجہی نے فیروز کو دیکھا ہے۔ اور ابراہیم قطب شہ کے زمانے (۹۵۷—۹۸۸ھ) میں اس کا عالم شباب تھا، اور اس وقت اس کی شاعری کی ابتدا تھی۔ جب ہی تو وہ قطب مشتری جیسی مثنوی کے متعلق فیروز و محمود سے اپنی داد کا طالب ہے، جو اس نے ۱۰۱۸ھ میں لکھی۔

ایک تصنیف ''صراط مستقیم فی دین قویم،، کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم حیدر آباد میں ہے۔ جس کے متعلق فاضل مرتبین فہرست مخطوطات عربی و فارسی نے لکھا ہے کہ یہ ''وجہی،، کی ہے جس کو وجہی نے سلطان ابراہیم قطب شہ ۹۵۷/۹۸۸ھ سے معنون کی ہے۔ اور ایک جگہ اسی کتاب میں اشارہ کیا ہے کہ میری اور بھی مبسوط تصانیف علم کلام و عقاید میں ہیں ''فارجع الیہما،، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مذکور کے ابتدائی زمانہ میں اس کی کافی عمر تھی، کم از کم تیس بتیس سال کی تو ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر یہ وجہی وہی ہمارا دکھنی شاعر ہے تو اس کی ولادت کا زمانہ، ابراہیم قطب شہ کا

آخری زمانہ نہیں بلکہ ابتدائی عہد (۹۵۷ھ) ہے ۔

وفات کے متعلق، طبعی گولکنڈوی نے اپنی مثنوی بہرام و گل اندام (تصنیف ۱۰۸۱ھ) میں اس کی دنیا میں عدم موجودگی کا اشارہ کیا ہے ۔ اس لحاظ سے وجہی مثنوی مذکور کی تالیف سے بہت عرصہ قبل فوت ہو چکا تھا ۔ ڈاکٹر زور صاحب ۱۰۸۱ سے پچیس سال قبل وفات کا زمانہ قرار دیتے ہیں ۔ اس طرح گویا وفات تقریباً ۱۰۵۶ھ لکھی ہے ۔ اس لحاظ سے اس کی عمر ۲۷ سال سے زاید تھی، اور اس کی آخری تصنیف ''سب رس،، (۱۰۴۵ھ) ہے ۔ اس کے معاصر غواصی نے ایک قصیدہ عبداللہ قطب شہ کی مدح میں اپنی ضعیف العمری کے زمانے میں کہا ہے، جس میں وجہی کا ذکر ہے، اور وجہی کے ساتھ خود کو ''شیر نیستان شاعری،، کہتا ہے سہ

عارفاں ہیں سو کتے ہیں یوں کہ آج اس دور میں
شیر ہیں یو شعر کے فن میں بحق بوتراب رخ

اس لئے غواصی گو وجہی سے عمر میں چھوٹا ہو مگر دونوں نے طویل عمر پائی ہے ۔ غواصی کے متعلق تو ۱۰۷۷ھ و ۱۰۸۹ھ تک بقید حیات ہونے کے اشارے ملتے ہیں، مگر وجہی کے متعلق، تصنیف سب رس ۱۰۴۵ھ کے بعد، تواریخ میں کوئی اشارہ نہیں ہے ۔ اس لئے ڈاکٹر زور کا قول، جس کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے، زمانۂ وفات ۱۰۵۶ھ مشتبہ ہو جاتا ہے ۔

ان حالات کے تحت اگر ''صراط مستقیم،، کا مصنف وہی دکونی

شاعر وجہی ہے تو اس نے کتاب مذکور قبل ۹۸۸ء لکھی اور ابراهیم قطب شہ سے معنون کی، اور مثنوی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں، یعنی ابراهیم قطب شہ کی وفات کے تیس بتیس سال بعد لکھی جس میں محمد قلی قطب شہ کا افسانہ عشق لکھا، اور سب رس، ۲۸ سال بعد ۱۰۴۵ھ میں لکھی، اور اس وقت اس کی عمر ۸۵/۸۰ سال سے کم نہ تھی -

اس کی مشہور تصنیف سب رس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی کو نہ صرف علم ادب و علم الالسنہ، بلکہ حدیث و تفسیر و تصوف و کلام پرکافی تبحر حاصل تھا - چنانچہ سب رس میں عربی فقروں اور احادیث کے بیسیوں حوالے موجود ہیں، جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ "صراط مستقیم" کا مصنف ممکن ہے وجہی مصنف قطب مشتری و سب رس ہی ہو- مگر "کتاب صراط مستقیم فی دین قویم" کا مصنف "وجہی گولکنڈوی" قرار دینے کے لئے اس کے عقاید پر غور کرنا ہوگا - کہ اس کا مذہب کیا ہے ؟

وجہی کے عقاید :

اپنی تصنیف "صراط مستقیم" تصنیف قبل ۹۸۸ھ کے آئینے میں تو وہ زبردست مجتہد شیعہ ہے اور علوم عقلی و نقلی کا عالم متبحر ہے - اور مثنوی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) کی داخلی شہادت سے بھی وہ اثنا عشری معلوم ہوتا ہے - چنانچہ اس نے خلفاء راشدین کا بالکل ذکر نہیں کیا اور منقبت حضرت علی رض میں ایک

نظم لکھی ہے ۔ وہ حضرت علیؓ کو خاتم ولایت مانتا ہے مگر کسی دوسرے صحابیؓ کا ذکر نہیں کرتا ۔

البتہ سب رس (نثر میں تصنیف ۱۰۴۵) کی تمہید میں خلفائے راشدین کی تعریف کی ہے ۔ یہ تمہید سب رس کے صرف ایک نسخے میں ہے، مثلاً عنوان یہ ہے :

''در نعت محمد مصطفیٰ و چہار یار، منقبت علی مرتضیٰؓ''

ابابکر صدیقؓ صادق ہیں خاص
کھٹے خارجیاں کو شریعت میں راس

عمرؓ جب نبیؐ کی امت میں ہوئے
یہودی عرب نے جو تھے سر نوئے

جمع کر جو عثمانؓ قرآن کوں
شرم کا دیے زور ایمان کوں

ٹوٹیا کفر علیؓ ہت لیے ذوالفقار!
خدا بعد محمدؐ بھی چاروں ہیں یار

مگر اس کو الحاق تصور نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ''سب رس'' کے دوسرے نسخوں میں بعبارت نثر مدح صحابہؓ موجود ہے، کہتا ہے :

''حضرت کہیں خدا شاہد، انا و علی من نور واحد، تن سوں تن جیو سوں جیو، دم سوں دم، نبوت محمدؐ پر ولایت علیؓ پر ختم، ابابکرؓ عمرؓ ہور عثمانؓ جنوں کی نیکی جانتا سب جہان، حضرت کے یاران ہیں، بزرگواران ہیں ایکس تے ایک سب بھلے، جیوں خدا رسول فرمایا تھا

تموں چلے، لاف نیں کہے، خلاف نہیں کہے ۔ حق پر چین ہمارے،
ایسیچ اچھے ہیں خدا کے پیارے، ایسیچ رہتے ہیں حضرت کے یار،
جنہوں سوں حضرت کرتے تھے بچار، آخر بعد از حضرت
کے بیٹھے حضرت کے ٹھار الخ ۔،،

اس لحاظ سے ''صراط مستقیم،، اور ''قطب مشتری،، کے وجہی
اور سب رس کے وجہی کے عقاید میں، بعدالمشرقین معلوم ہوتا ہے ۔
تو کیا وجہی نے آخر عمر میں اپنے عقاید بدل دیے تھے یا تفضیلی
مذہب اختیار کر لیا تھا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ صراط
المستقیم فی دین قویم، کتب خانۂ نواب سالار بہادر کا ایک نادر
مخطوطہ ہے جو ایک مقدمہ، پانچ اصل، ایک خاتمہ پر مشتمل ہے
اور ہر اصل کے ضمن میں مختلف فصول ہیں ۔

تمہید :

و الصلواۃ و السلام بر جمیع انبیاء مرسلین و اولیاء صدیقین،
خصوصاً بر سید انبیاء و مقتدای اولیاء وائمہ ھدیٰ صلواۃ و سلاماً
. . . . اما بعد چون باتفاق جمیع عقلاؑ از آدم تا خاتم و از خاتم
تا این دم معرفت حق تعالی و صفات ثبوتیہ و سلبیہ و ما یصح علیہ
و یمتنع و معرفت نبوت و امامت و معاد بر جمیع متکلفین فرض
عین وتعین فرضیت بدلیل مفید یقین نہ تقلید و ظن فان الظن لا یغنی من
الحق شیاً، چہ باتفاق انبیاء و باتباع ایشان از مکلفین و باتفاق
حکماء مشائین و اشراقین یقین و ایقان بعقاید حقہ موجب نجات اند،
درکات نیران و اصول و ارتفاع بدرجات نہشت عنبر سرشت رضوان،
است، بر محققان علماء و مدققان عرفاء تعلیم و تفہیم و تبئین و

توضیح عقاید حقه جمیع مکلفین را واجب و منحتم و فرض عین بود ۔ اقل ما یجب معرفته من العقاید حقه الفرقته الناجیه الامامیه دربن رساله مسمی :

(نام کتاب)

"صراط المستقیم و دین قویم،، ان هذا صراطا مستقیما نبوة و لاتبعو السبل، متفرق بکم عن سبیله ذالکم و صاکم لعلکم تتقون ، بیان کردیم بزبان فارسی، از جهت تعمیم انتفاع بان جمیع مکلفین ۔

(مقام تصنیف قندهار-دکن)

در اثنای سفرے که هیچ کتابی از کتب علمی خصوصاً کلامی در نظر نبود ۔ چه در قندهار که قصبه ایست از قصبات دکن صانه الله تعالی من الفتن، گرفتار مانده بود، از جهت سرانجام مهام بعضی از دودمان نبوت و ولایت خلد الله ظلالهم و حصل الله لهم ۔

(وجه تصنیف)

و بعضی از صلحاء و فضلای مومنین استدعای رساله چنین فرمودند؛ ذخر الیوم المعاد و ارشاداً للعباد نوشته شد، مبین بر مقدمه و پنج اصل و خاتمه ۔ هو حسبنی و نعم الوکیل ۔

(زمانه تصنیف)

و چون مدت مدید عهد بعید در عرصهٔ امکان و ساحت دوران هرچند سمندانظار و یکران افکار را جولان دادم که پادشاه

سلیمان جاهی بیابم که لائق آن باشد که تصنیف شریف و این تالیف منیف را بنام نامی و اسم سامیٔ او مشرف و مزین سازم، هیچ پادشاهی لائق نیافتم الا ۔

(معنون به ابراهیم قطب‌شاه)

پادشاه جم جاه ملایک سپاه عالم پناه مستخدم الاکاسره مستبعد الاقاصره شرف سریر الخلافة بالارث و الاستحقاق مالک رقاب الامم علی الاطلاق باسط بساط الامن و الامان علی اهل الایمان موید مذهب ائمه اثناعشر ناصب لواء التصنیفة والعدالة کافة البشر، کاحل احداق الحور، کافل ارزاق الوجود محی مراسم جود، حاتم طائی آثار شجاعت، رستم الیغ اعظم و قتلغ معظم همایون اکرم، سلطان ابراهیم قطب شاه خلد الله ظلال سلطنته و مال خلافته علی مفارق الملوک و السلاطین و ابقاء الی اعالی معارج السلطنة و الخلافة" اتاه چه حق سبحانهٗ در این اوقات رحمة" للعالمین این پادشاه جم سپاه را برگزیده و قبای پادشاهی برقامت موزون او بریده، و خلایق را در ظل رایت و رحمت او پرورده و می پرورد ۔

(نام مصنف)

بر وجهی که زبان از بیان شمه ازان لال و قلم دو زبان از تحریر شحهٔ ازان در کلال، مقصد اقصی چه عالی نهمتش تقویت دین متقین، و نصب الیقین ضمیر آفتاب نظیرش تمشیت احکام سیدالمرسلین و ترویج مذهب ائمه معصومین . . . . و طریقت صلواة الله و سلامه علیه وعلیهم اجمعین، . . . . بنا بر این کتاب مستطاب را مزین بنام نامیٔ این پادشاه عالم پناه ساختم، و تا قیام قیامت بر وجنات صفحات ایام ثبت باشد، و موجب دوام ایام خلافت و بقای

عوام سلطنت گردد ۔ و ما ذالک علی بعزیز خانه علی بادشاه قدیر و بتحقیق رجاء الراجین جدیر ۔

مقدمے کا مختصر اقتباس یہ ہے :- در بیان آنکه فرقه ناجیه طایفۂ امامیه اثناء عشریه اند۔پیغمبر ما صلعم بہفتاد و سه فرقه۔علی ماقال ستفرق امتی ثلاثته و بعین فرقة کلهم فی النار احد واحدة قیل منهم یا رسول الله قال ما انا علیه، و اهل سنت و اصحابہ روایت کرده اند۔بدانکه اهل سنت و جماعت برآنند که فرقه ناجیه مائیم، از برای آنکه ما اهل سنت و جماعت ایم یعنی اهل عقیده پیغمبر صلعم و عقیدۂ صحابه ایم، و هر که بر عقیده این هر دو باشد فرقه ناجیه است ۔ لفظ اصحابی در حدیث وارد نیست و عقیده همه صحابه حق نیست، از برای آنکه بعد از پیغمبر صلعم اختلاف بسیار کرده اند الخ :

مگر اس کے جواب میں علماء احناف کی کتابیں بھری پڑی ہیں، ایک قدیم دکھنی شاعر و علامہ کے دو شعر یہاں کافی معلوم ہوتے ہیں :

ما علیہ انا و اصحابی مذہب سنت و جماعت ہے
گرچہ باللہ حسن ہے حب علی بغض صحب نبی شناعت ہے

اصل اول در توحید، کے ضمن میں، لکھا ہے: ''و اصول دین در مذہب امامیه پنج است، توحید و عدل و نبوت و امامت و معاد الخ ۔ اور توحید کے ضمن میں مختلف فصول ہیں ۔ واجب‌لذاته، عرض و جوہر، اور جزو لایتجزی،۔عرض و جوہر کے حدوث زمانی ہر تعدد قدماء۔صفات واجب عین ذات‌وغیرذات ۔ توحید افعالی و صفاتی و

ذاتی پر بحث کرتے ہوے مذہب صوفیہ و سوفسطائیہ پر روشنی ڈالی ہے ۔ آیات متشابہات اور اللہ جمیل، پر بحث کی ہے اور حلول و اتحاد کو باطل قرار دیا ہے ۔ رویت حق کے متعلق یہ لکھا ہے :

''بدانکہ رویت حق تعالی بقوت باصرہ ممکن نیست و ممتنع بالذات الخ ـــ اہل سنت اثبات می کنند کہ رویت اخروی است کہ فی‌الحقیقت راجع است بانکشاف تام، و امامیہ و معتزلہ و حکماء ہمہ قایل اند بآنکہ درآخرت انکشاف نسبت باومنان خواہد بود ۔ پس نزاع لفظی باشد بین‌الفریقین الخ ۔

اس کے بعد مسئلہ حدوث و قدم کلام اللہ اور صفات قدرت و علم واردات وغیرہ پر بحث کی ہے ۔ اصل دویم میں، ''عدل،، سے متعلق ہے، اور علماء امامیہ کا نقطۂ نظر ظاہر کیا کہتا ہے :

''عدل علماء امامیہ بدو معنی مستعمل است، اول آنکہ مباحث متعلقہ بافعال الٰہی را عدل گویند، دویم آنکہ حق سبحانہ تارک واجب و فاعل قبیح نیست الخ ۔ واجب نیست براللہ تعالی رعایت اصلح بعباد الخ ۔

اصل سیوم بعثت انبیاء سے متعلق ہے ۔ کہتا ہے ''علماء امامیہ و معتزلہ برآنند کہ تکالیف شرعیہ لطف حق است . . . . اتفاق حکماء و ملتین یہود و نصاری و مسلمان کہ . . . . تکمیل نفس ناطقہ انسان است الخ ۔ اس کے بعد مختلف فصول میں، معجزات اور معصومیت انبیا پر بحث کی ہے ۔

اصل چہارم میں مسئلہ امامت پر بحث ہے، مثلاً لکھتا ہے :

امامیه بر آنند که نصب امام واجب است بر حق تعالیٰ عقلاً و شرعاً چنانچه نصب انبیاء علیه السلام و میگویند که فرق میان نبوت و امامت الا باصالة و نیابت پس الله تعالیٰ واجب است که نصب امام کند الخ. . . . . اهل سنت معتزله بر آنند که مقصود بالذات از امامت همین مجرد سلطنت ظاهری و ایشان بثمرات و نتائج است، تجهیز جیوش و حفظ بیضة الاسلام از غلبۂ کفار الخ . . . . . .امام بحق بعد از پیغمبر علی بن ابی طالب است باتفاق جماهر مفسرین الخ. . . .

آخری الفاظ دلخراش هیں :

بعد از اطلاع برین دلایل (که فقیر گفته ام) فی‌الواقع حیف از فهم شیخ اشعری و شافعی و محققان شافعیه و ابو حنیفه و اتباع ایشان را بر دین باطل مقر شده اند به محض عناد بے دلیل عقلی و نقلی و همه عمر چندین هزار مسلمانان را گمراه کرده اند.......فقیر ملوث باعتقاد افضلیت ابوبکر نشده الخ ۔

بعض اهم مآخذ صراط مستقیم :

(۱) تفسیر کبیر امام فخرالدین رازی‌رح : (۲) الهیات شفا' مولفۂ شیخ ابوعلی رح (۳)قوال علامه نیشاپوری و صدرالدین محمد شیرازی، و ختم المحققین دوانی ؛ (۴) مدارک ،مختصر کشاف ؛ (۵) اقوال شیخ ابو نجیب از علماءامامیه ؛ (۶) شرح المقاصد تفتازانی ؛ (۷) فصول فارسی محقق طوسی ؛

(۸) شرح اشارات طوسی ؛ (۹) شرح صحایف ؛ (۱۰) احیاءالعلوم امام غزالی‌رح ؛ (۱۱) رسالہ التکلیف الامر شیخ عمرالخیام ؛ (۱۲) شرح شمسیہ ؛ (۱۳) عیون الحکمۃ از شیخ الرئیس ؛ (۱۴) فتوحات مکیہ ابن عربی‌رض، (۱۵) تفسیر طبری ؛ (۱۶) تنزیل الانبیاء، مؤلفہ سید مرتضی علم الهدی، (۱۷) قصص الاخبار ؛ (۱۸) مجمع البحرین در شرح مفاتیح ؛ (۱۹) تصنیفات سید ابوالشکور رسایلی وغیرهم -

کتاب زیر بحث ۲۳۳ صفحات، (سطر ۹) پر مشتمل ہے بخط نستعلیق معمولی، کاغذ جدید رولدار، عنوانات وآیات سرخی سے (تقطیع تقریباً ۴″ × ۷′) -

ترقیمہ :

حسب الفرمایش جناب مستطاب مستغنی عن الالقاب آقا سید امداللہ عرف جناب میر (۱) نواب صاحب دام اجلالہ تعالی مرقوم گردید،

۱ - میر نواب (سید اسد اللہ) حیدرآباد کے ایک کلکٹر تھے، آبا و اجداد اصفہانی، مولد نشونما حیدرآباد سندھ - وہاں سے کلکتہ ہوتے ہوئے ۱۲۷۹ھ میں بزمانہ سالار جنگ اول حیدرآباد آئے - مرزا علی محمد خان معتمد الدولہ کی سرپرستی سے مختلف سرکاری خدمات پر فایض رہے - بیدر شریف کی کلکٹری کے زمانہ میں تاریخ سلاطین بہمنیہ (فارسی) الموسوم بہ مختار لاخیار بایماء سالار جنگ اول لکھی، جو ۱۲۹۴ھ میں طبع و شائع ہوئی- میرصاحب ۱۳۱۱ھ تک بقید حیات تھے، تاریخ وفات نہ مل سکی-ان کی قبر متعمد پورہ میں بیان کی جاتی ہے-بہر حال میر نواب نے اپنے عقاید کے لحاظ سے اس کتاب کو اپنے لیے نقل کرایا تھا، کس نسخے سے نقل کی گئی پتا نہ چل سکا-علماء اهل تشیع کی بیشمار تصانیف تفاسیر و احادیث و فقہ و عقاید کا نایاب ذخیرہ بھی کتب خانہ سالار جنگ بہادر میں موجود ہے -

نمیقه اقل الناس محمد عباس شوستری عفی عنه بتاریخ ۲۹ شہر ذیقعدہ الحرام ۱۳۱۱ هجری در بلدۂ پونه ۔

ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ ''صراط مستقیم فی دین قویم'' ملا وجہی گولکنڈہ کی تصنیف نہیں ۔ دیباچہ میں لفظ ''وجہی'' بیائے معروف لکھنے کی وجہ سے مرتب کو مغالطہ ہوا ہے کہ یہ ''وجہی کی ہے ۔ مصنف کی عبارت یہ ہے :

''این بادشاہ جم سپاہ را بر گزیدہ و قبای بادشاھی برقامت موزون او بریدہ و خلایق را در ظل رایت او پروریدہ و می پرورد، بر وجہی کہ زبان از بیان شمہ ازان لال و قلم دو زبان از تحریر رشحہ ازان در کلال مقصد اقصیٰ الخ ۔

بلحاظ ربط مضمون در اصل لفظ وجہی، بیائے معروف پڑھنا چاہیے ۔ (یعنی وجہے) ورنہ ربط قایم نہ رہے گا ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنف نے بمقام قندھار اپنے قیام کا اشارہ کیا ہے ، جہاں اس نے یہ کتاب لکھی ۔ قندھار (دکن) ضلع ناندیڑ (حیدرآباد دکن) وہ مشہور تاریخی مقام ہے جس کو سلطان برھان نظام شاہ والیٔ احمد نگر نے ۹۵۵ھ میں بریدی سلاطین بیدر سے چھین لیا تھا، اور اس معرکہ میں سلطان جمشید قلی، قطب شہ بھی شریک تھا ۔ برھان نظام شاہ نے قندھار فتح کیا، اور وہاں ائمہ اثناعشر رض کا خطبہ پڑھوایا، خلفاء راشدین کے نام خارج کر دئے ۔ یہاں سادات امامیہ علماء اور فضلاء آباد ہوئے ۔ علامہ شاہ طاہر متوفی (۹۵۶ھ) کے اثر سے برھان نظام شاہ نے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا ۔ شیعیت کی دکن میں بڑی ترویج ہوئی ۔ اس کے زمانہ میں خور شاہ ابن

قبادالحسینی ایران سے احمد نگر آیا ۔ اور شاہ طاہر کی وفات کے بعد ابراہیم قطب شاہ (٩٨٨/٩٥٧ء) کے زمانے میں گولکنڈہ آ گیا، اور (٩٧٣ھ) میں وفات پائی ۔ ''تاریخ ایلچی نظام شاہ،، اس کی مبسوط تاریخ ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ در اصل یہ تصنیف ''صراط مستقیم،، خور شاہ کی ہے ۔ اور یہ اس زمانہ میں لکھی گئی ہے جب کہ سلطنت قطب شاہی میں جمشید قلی کے بعد تخت نشینی کے متعلق ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا، اور مصنف جیسا کہ اس نے خود اشارہ کیا ہے اس فکر میں تھا کہ اس تصنیف کو کس بادشاہ کے نام سے معنون کرے ۔ الفاظ یہ ہیں :

> ''چون مدت مدید و عہد بعید در عرصہ امکان و ساحت دوران ہر چند سمندانظار و یکران افکار را جولان دادم کہ بادشاہ سلیمان جاہے بیابم کہ لایق آن باشد کہ تصنیف شریف و این تالیف منیف را بنام نامی و اسلم سامی او اشرف و مزین سازم الخ ۔

اس نے یہ تصنیف ٩٥٥ھ یعنی فتح قندھار کے بعد قندھار میں لکھی ۔ اور ٩٥٦ھ میں جب علامہ شاہ طاہر کا انتقال ہو گیا اور اس کو احمد نگر سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور اوائل عہد سلطان ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں گولکنڈہ چلا آیا، اور اپنی یہ کتاب سلطان موصوف کے نام معنون کر دی ۔ اس سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی اور موقعہ نہ تھا، جہاں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ۔ سلطان مذکور ہی کے ایما سے اس نے اپنی مشہور و معروف ''تاریخ ایلچی نظام شاہ،، تالیف کی جس کا ایک ناقص نسخہ کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن (سنٹرل لائبریری) میں

ہے ۔ دوسرا (شاید مکمل نسخہ) کتبخانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے ۔
کتبخانہ آصفیہ کے نسخے میں حسب ذیل مقالے ہیں :

مقالہ گفتار سوم : آل تیمور سے اکبر اعظم تک ۔

مقالہ ششم گفتار چہارم : شاہان ایران اور امرائے شروان و ماژندران ۔

مقالہ ہفتم : گفتار پنجم ۔ سلاطین بہمنیہ پر مشتمل ہے ۔
مولف نے ۹۷۳ھ میں وفات پائی ۔

(نومبر ۱۹۶۰ء)

ڈاکٹر مظفر حسن ملک

انیس کی وفات پر دبیر کا قطعۂ تاریخ

دبیر کے لئے اپنے بڑے بھائی مرزا غلام محمد نظیر[۱] کے انتقال کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ ان کے حریف اور مدمقابل میر انیس نے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ع مطابق ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بروز جمعرات وفات پائی[۲] - میرزا دبیر کو اس حادثہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ میر صاحب

---

۱ - متوفی ۲۸ صفر ۱۲۹۱ھ حیات دبیر، ج : ۱ -

۲ - اودھ اخبار شمارہ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۴ مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ بروز سہ شنبہ یہ خبر شائع ہوئی اور بتایا گیا کہ گذشتہ پنج شنبہ کو یہ حادثہ ہوا - آب حیات اور اس کے حوالے سے حیات انیس میں ۱۲۹۲ درج ہے جو غلط ہے - واقعات انیس میں لکھا ہے کہ انیس ۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ کو درد سر اور تپ میں مبتلا ہوئے اور ۲۹ شوال بروز دو شنبہ انتقال کیا - یہاں تاریخ درست ہے لیکن یوم غلط (مہدی حسن احسن، واقعات انیس ص ۲۶) یادگار انیس (ص ۱۲۰ مولوی امیرالدین احمد علوی) میں ۲۹ ذیقعد روز دو شنبہ درج ہے، یہ بھی غلط ہے - شیخ فضل احمد کیف کی فی‌البدیہہ تاریخ ارتحال شاد عظیم آبادی نے فکر بلیغ حصہ دوم میں درج کی ہے ؎

جان بہ شب اول ذیقعد داد



ڈاکٹر مظفر حسن ملک

کی لاش پر جا کر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان فصیح اللسان قدردان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا[1] ۔ مولف حیات دبیر لکھتا ہے[2] :

''مرزا صاحب نے خون جگر سے رنگین ایک تاریخ وصال میر صاحب کی لکھی اور میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ میں پڑھی تھی ۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے ۔''

۹ فروری ۱۸۷۵ع کے اودھ اخبار میں کسی شخص کا ایک طویل مراسلہ چھپا ہے مگر مراسلہ نگار نے اپنے نام ظاہر نہیں کیا ۔ مراسلہ مذکور میں دبیر کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ وفات میر انیس درج ہے اور اس پر اعتراض کیے گئے ہیں :

داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث
از کہ دل مانوس گردد بے سخنور، بے انیس

وا دریغا عینی و دینی دو بازوئم شکست
بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس

---

۱ ۔ اودھ اخبار مذکور ۔

۲ ۔ حیات دبیر، ج : ۱، ص ۱۰۷ ۔ (افضل حسین ثابت مولف حیات دبیر نے ۱۹۲۲ میں اپنی عمر باسٹھ سال بتائی ہے ۔ گویا انیس کے انتقال کے موقعہ پر ان کی عمر چودہ سال تھی ۔ اس عمر کا ذہین بچہ اگر موقعہ پر موجود ہو تو واقعات کو یاد رکھ سکتا ہے ۔ (ثابت کی عمر کے لئے دیکھیے دیباچہ برق غم مراثی افضل حسین ثابت مطبوعہ دہلی ۱۹۲۳)

یاد کار رفتگان هستیم و مهمان جهان
چند روزه چند هفته بے برادر بے انیس

الوداع اے شوق تصنیف، الفراق اے ذوق نظم
شد حواس خمسه و ده عقل ششدر بے انیس

بسکه در بزمم بسوزد داغ غم بالائے داغ
هست جز طاؤس دل پروانه دیگر بے انیس

سوخت آتش بر دل یاران مگر جائے سپند
نالۂ آهسته می آید ز مجمر بے انیس

اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما
رفته رفته رفت تا دامان محشر بے انیس

تازه مضمون نظم می فرمود در هر بحر شعر
چشمۂ چشم بود هم چشم کوثر بے انیس

سال تاریخش بزبروبینه شد زیب رقم
طور سینا بے کلیم الله و منبر بے انیس

مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ چار مزید اشعار حیات دبیر (ثابت) و شمس الضحیٰ (میر صفدر حسین) میں منقول ہیں مگر اخبار مذکور میں درج نہیں ہوئے۔

عبرة للناظرین گردید افلاک و زمین
دیدنی نبود مه و خورشید و اختر بے انیس
پوست کنده موشکافان سخن گویند حیف
هر سرمو بر رگ جانست نشتر بے انیس

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین ۹۲۹
+
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس ۹۴۵
۱۸۷۴ع

میر مہدی حسن لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ جس تاریخ کو شہرت ہوئی وہ جناب مرزا دبیر مرحوم کی تصنیف ہے اور اُس کا مادۂ مصرعہ یہ ہے ''طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس''، پوری تاریخ کلیات مطبوعہ مرزا صاحب میں موجود ہے۱ اس مادہ میں مرزا صاحب نے صنعت زبر و بینہ کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر اکثر گروہ شعراء کو اس میں کلام ہے۔ کیونکہ زبر و بینہ کے قاعدے سے سن مقصود کا استخراج نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے صاحبزادے نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار میں تاویلاً تصحیح کی ہے مگر واقفان فن کی تسلی نہیں ہوئی۲۔

ثابت نے اپنی تالیفات میں سن مطلوب کا مبینہ مادہ تاریخ اس سے اس طرح استخراج کیا۳ ہے:

زبر بینہ زبر بینہ زبر و بینہ زبر بینہ
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس
۱۲۵ ۲۲۷ ۱۱۲ ۱۹۳ ۱۳ ۳۰۴ ۲۲۷ میزان ۱۲۹۱ھ

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ کلیات دبیر (مجموعہ غم) میں شامل نہیں۔
۲۔ واقعات انیس (احسن) ص ۱۲۸/۱۲۹۔
۳۔ حیات دبیر ج دوم، حصہ اول (۱۹۱۵ع) و دیباچہ سبع مثانی۔

الفاظ و اعداد تو خوب مرتب ہوئے ہیں مگر کوئی اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ۔ مثلاً 'بے' ایک الگ لفظ ہے اگر وہ مل سکتا ہے تو بعد کے لفظ سے مل سکتا ہے ۔ لیکن ثابت نے ایک جگہ تو بے کلیم، لیا اور دوسری جگہ 'منبر بے' لے لیا یہ 'منبر بے' کیا چیز ہوئی ۔ بے کلیم تو ایک با معنی بات تھی ۔ دونوں جگہ یکساں ہونا چاہیئے ۔

اس کے علاوہ کہیں کہیں بینہ کے اعداد میں بھی غلطی ہوئی ہے ۔ ''زبر،، کہتے ہیں کسی حرف کے حروف باطنی میں صرف پہلے حرف کے اعداد کو 'بینہ' میں حروف باطنی کے پہلے حرف کو چھوڑ کے باقی کے اعداد لیے جاتے ہیں ۔

ثابت نے بینہ سینا ، ۲۲۷ لیے ہیں ۔ لیکن حرف اول (س) کو چھوڑ کر باقی یا/۱۱ + نون/۱۰۶ + الف/۱۱۱ کے اعداد لیے جائیں تو (۲۲۷) نہیں بلکہ (۲۲۸) ہوں گے ۔ اس طرح اللہ کے بینہ اعداد ۱۹۳ لیے گئے ہیں حالانکہ لام/۷۱ + لام/۷۱ + ہا/۶ کے ۱۴۸ ہوتے ہیں ۔

اس کے علاوہ تاریخ میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں کہ ایک لفظ زبر اور دوسرے کے بینہ لیے جائیں جیسا کہ کیا گیا ہے ۔

موضوع بحث قطعۂ تاریخ کے نہ صرف ''مادۂ تاریخ،، ہی پر اعتراضات کیے گئے ہیں بلکہ قطعۂ تاریخ میں بھی کئی اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے[۱] مثلاً دوسرے شعر کا قافیہ 'آخر' بالکسر 'خا' ہے ۔ حالانکہ باقی قوافی مفتوح ہیں ۔ اور اگر بالفتح خا پڑھا

۱ ۔ مثلاً دیکھیے رسالہ ملہم تاریخ سید اقتدار احمد ساحر، مطبع العلوم مرادآباد ۔

جائے تو معانی غلط ہو جاتے ہیں ۔ چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ ساقط الوزن ہے ۔ چھٹے شعر میں ''نالۂ آہستہ'' کی ترکیب ہندی طریقے سے وضع شدہ ہے ۔ آٹھویں شعر ''ہر بحر شعر'' کی ترکیب بےمعنی ہے ۔ آخری شعر میں ''شد زیب رقم'' تاریخ وفات کے لئے غیر مناسب ہے ۔ اس کے علاوہ سارے کے سارے قطعہ میں کہیں شاعر نے اپنے لیے صیغہ واحد متکلم استعمال کیا ہے اور کہیں جمع متکلم استعمال کیا ہے اور سب سے بڑھ کر جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے مادۂ زیر بحث سے میر انیس کا سال وفات مستخرج نہیں ہوتا ۔ حیرت ہے کہ اس نوع کا کلام مرزا صاحب سے کیوں کر منسوب ہو گیا ۔

اس کے برعکس مطلع اور ان چار اشعار کے خلاف جو ثاقب نے حیات دبیر میں دئیے ہیں اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا آخری شعر سے تاریخ وفات بھی نکلتی ہے ۔ اور کلام بھی مرزا دبیر کی شان کا ہے ۔ اس کی تائید شاد عظیم‌آبادی کے مضمون مرزا دبیر سے بھی ہوتی ہے ۔ انھوں نے قطعۂ مذکورہ بالا کے صرف مندرجہ ذیل اشعار حافظے کی مدد سے نقل کیے ہیں ۔ راقم‌الحروف کے خیال میں قطعۂ تاریخ کی صحیح صورت یہی ہے ۔

داد خواہم یا غیاث المستغیثینالغیاث
از کہ دل مانوس گردد بے سخنورِ بے انیس

عبرۃ للناظرین گردید افلاک و زمیں
دیدنی نبود مہ و خورشید و اخترِ بے انیس

یادگار رفتگان ہستیم و مہمان جہان
چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس[1]

اس سلسلے میں مندرجہ امور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں -

۱ - یہ قطعہ تاریخ مرزا صاحب کے کلیات میں موجود ہیں -

۲ - اس کی سب سے پہلی اشاعت اودھ اخبار شمارہ ۹ فروری ۱۸۷۵ع میں کسی ایسے شخص کی طرف سے ہوئی جس نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور قطعۂ تاریخ پر اعتراضات بھی کیے -

۳ - یہ وہ ایام ہیں جب مرزا صاحب بیمار ہیں اور لکھنؤ سے باہر عظیم آباد محرم کی مجالس کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں - اپنی موت سے صرف چند دن پیشتر عظیم آباد سے واپس آئے جبکہ مرض الموت میں مبتلا تھے - اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس امر کا اعلان کر دیتے کہ یہ قطعہ جزوی طور آن کی طرف غلط منسوب ہوا ہے -

۴ - اگرچہ صاحب ملہم[2] تاریخ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنھوں نے اخبار اودھ میں اس قطعہ تاریخ کے مطالعے کے بعد

---

۱ - فکر بلیغ حصہ دوم شاد عظیم آبادی -

۲ - دیکھیے رسالہ ملہم تاریخ سید اقتدار احمد ساحر مطبع العلوم مراد آباد -

اس موضوع پر مرزا دبیر سے خط و کتابت کی ہے مگر یہ بیان بھی قابل اعتنا نہیں۔ کیونکہ :

۱ - انیس کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ع کو ہوا۔

۲ - یہ قطعہ تاریخ اس سانحہ کے دو ماہ بعد یعنی ۹ فروری ۱۸۷۵ع کے شمارہ میں طبع ہوا۔

۳ - یہ ایام محرم ہیں جبکہ مرزا صاحب عظیم آباد میں ہیں۔ وہیں ۹ محرم ۱۲۹۲ھ یعنی ۱٦ فروری ۱۸۷۵ع کو بیمار ہوئے۔ اور ۲٦ فروری کو مراجعت ہوئی۔ یہی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی۔

۴ - ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۸ مارچ ۱۸۷۵ع مرزا صاحب کا انتقال ہوگیا۔

۵ - وہ دس دن جو مرزا صاحب نے اس قطعۂ تاریخ کی اودھ اخبار میں اشاعت کے بعد لکھنؤ میں گزارے، بقول مؤلف حیات دبیر (ج ص ۱۲۸) نہایت بے چینی اور تکلیف میں تھے۔ اس حالت میں صاحب ملہم تاریخ سے قطعۂ تاریخ پر خط و کتابت کرنا ممکن نہیں۔

آج وہ ذرائع مفقود ہیں جن کی روشنی میں صحیح نتائج اخذ کیے جائیں۔ تاہم اس قدر یقینی ہے کہ اس قسم کی اغلاط جو اس قطعۂ تاریخ میں پائی جاتی ہیں مرزا صاحب کے پائے کے شاعر سے منسوب نہیں کی جا سکتیں لہذا قطعۂ تاریخ کی صحیح صورت وہی ہے جو شاد عظیم آبادی نے نقل کی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دبیر کی وفات کے بعد جب قطعۂ مذکور کا چرچا ہوا اور

زبرو بینہ و الے مادۂ تاریخ پر اعتراضات ہوے تو ان کے تلامذہ نے اپنے استاد کی حمایت ضروری خیال کی ۔ جذبات عقیدت کے زیر اثر انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہ کی کہ قطعۂ مذکور تحریف شدہ یا جزوی طور پر غلط تو نہیں ۔ تعجب ہے کہ خاندان دبیر کے پاس اس قطعہ کا اصل مسودہ بھی موجود نہیں ۔

نومبر ۱۹٦۳ء



ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مقدمہ

چار گلشن (بینی نرائن جہان)

بینی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں کسی طرح کم مرتبہ نہیں ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زیادہ مشہور نہ ہوئے ۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ ان کی دلچسپ داستان چار گلشن کبھی شائع نہیں ہوئی ۔ اگر یہ کتاب، بعض دوسری کتابوں کی طرح، اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہو جاتی تو، اس میں شبہہ نہیں، کہ وہ بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح اس وقت کے نامور مصنف تصور کئے جاتے ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔ اس لئے ان کو کچھ زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی ۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک بلند مرتبہ لکھنے والے تھے اور ان کی داستان 'چار گلشن' ایک اعلیٰ پائے کی ادبی تالیف تھی ۔

یہ کتاب بینی نارائن جہاں نے ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ میں منشی امام بخش کی فرمائش پر اردو زبان میں لکھی اور اس کا مسودہ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی (اردو) زبان کے پروفیسر کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا۔

دیباچے میں لکھتے ہیں :

" اب یہ ذرۂ بے مقدار، عاصی، گنہگار، بندہ بینی نارائن ابن رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ مہاراجہ لچھمی نارائن مرحوم قوم کھتری مہتد، ساکن دارالسلطنت لاہور، جو بیچ سال ۱۲۱۵ھ کے عہد میں نواب معلی القاب، مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ رائے کھیم نارائن صاحب دام اقبالہ کے، کہ بہ عہدۂ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہ کے، بیچ شہر لطافت بھر کلکتہ کے آئے تھے، وارد ہوا۔ اس کو دس برس کا عرصہ ہوا ہوگا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے۔ اور اب کہ سنہ ایک ہزار اور دوسو پچیس ہجری ہیں عہد دولت میں نواب مستطاب، گردوں رکاب، مہر سپہر دولت بختیاری، ماہ تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز، مشیر خاص الخاص بادشاہ کیوان بارگاہ انگلستان، زبدۂ نوئنیان عظیم الشان، گورنر جنرل، اشرف الامراء لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک دن اس کہانی کو، کہ بہت دنوں سے اس گنہگار کو یاد تھی، برسبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان، معدن لطف و احسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا۔

منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بہ ضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا کہ 'اس قصۂ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان نظم میں لائیے اور زبان ہندی میں اوپر صفحہ کاغذ کے لکھیے ۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقب یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ، کے گذرانیے کہ اگر ان کو جان سخن کہیے تو بجا ہے ۔ بلکہ جان سخن کہنا سزا ہے ۔ اس کے سننے سے وہ جناب محظوظ ہووں ۔ اور بہ سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے ۔

سو اس عاصی نے بہ موجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو کہ عقل ناقص میں آیا قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا ۱

کپتان ٹیلر کو یہ داستان پسند آئی اور انہوں نے اس کو انعام کا مستحق ٹھہرایا ۔ چنانچہ اس کا مسودہ کالج کے کتب خانے میں داخل کیا گیا اور بینی نرائن جہاں کو اس کا صلہ انعام کی صورت میں ملا۲ ۔ لیکن یہ کتاب اس وقت کالج کی طرف سے شائع نہ ہوسکی ۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت کالج کے سامنے کتابوں کی اشاعت کے کوئی خاص منصوبے نہیں تھے ۔ چنانچہ اس کا قلمی نسخہ کالج کے کتب خانے میں محفوظ رہا ۔ اس کا ایک نسخہ کسی طرح ایک صاحب مسٹر ایچ ایچ ولسن (H. H. Wilson) کے

---

۱ - بینی نارائن جہان ۔ دیباچہ چار گلشن قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ۔ صفحہ ۱ - ۲ -

۲- ROEBUCK : Annals of the college of Fort william p. 339

ہاتھ بھی لگا اور ان کے ساتھ لندن پہنچا - برٹش میوزیم لندن نے اس کو مسٹر ولسن سے ۱۲ جنوری ۱۸۶۱ء کو خریدا - چنانچہ اس نسخے پر انگریزی کی یہ عبارت ملتی ہے -

Purchased of Mr. Wilson, 12 Jany. 1861

یہ نسخہ بڑے سائز کے ۹۰ اوراق پر مشتمل ہے - اور خط نستعلیق میں جلی لکھا ہوا ہے - صفحے کی لمبائی $10\frac{3}{8}$ انچ اور چوڑائی سات انچ ہے - ہر صفحے میں گیارہ سطریں ہیں اور ہر سطر کی لمبائی پانچ انچ ہے - برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرق کے کتب خانے کی فہرست مخطوطات میں اس کا نمبر Additional 24046 ہے ۱ -

خیال یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اس دلچسپ داستان کا صرف یہی ایک قلمی نسخہ ہے - کریم الدین نے یہ معلومات ضرور فراہم کی ہے کہ اس کا قلمی نسخہ فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں منتقل کردیا گیا -۲ لیکن اب یہ نسخہ نایاب ہے - رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں - ہوسکتا ہے کلکتہ میں رہ گیا ہو لیکن اب یہ نسخہ ظاہر ہے کہ ہماری دسترس سے باہر ہے -

---

۱ - بلوم ھارٹ - فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن

۲ - کریم الدین : طبقات شعرائے ہند : ص ۳۱۱

بینی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے ایک اہم لکھنے والے تھے ۔ لیکن ان کی اہمیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ ادبی مورخوں نے اپنی تاریخوں میں ان کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایک اعلی درجے کے مصنف کا جس طرح جائزہ لینا چاہئیے، اس طرح ان کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ان کی ادبی تصانیف کو نہیں دیکھا ہے ۔ اور ان تصانیف کو نہ دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ان کو اشاعت سے ہمکنار ہونا نصیب نہیں ہوا ہے ۔ ان کے قلمی نسخے ابھی سات سمندر پار انگلستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اور ان تک رسائی کوئی آسان بات نہیں ہے ۔

یہ بات بظاہر تو عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بینی نارائن فورٹ ولیم کالج میں ملازم رہے ۔ وہاں انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا لیکن ان کی تصانیف کالج کی طرف سے شائع نہیں کی گئیں ۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات ایسی کچھ عجیب نظر نہیں آتی ۔ دراصل بات یہ ہے کہ بینی‌نارائن جہاں کو تاخیر سے فورٹ ولیم کالج کے ساتھ منسلک ہونے کا موقع ملا ۔ جس وقت وہ کالج کے باقاعدہ ملازم ہوئے ہیں، اس وقت اس کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا ۔ پہلے دور کی سی بات اب باقی نہیں رہی تھی ۔ ڈاکٹر گل کرسٹ، عرصہ ہوا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان جا چکے تھے اور انہوں نے کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس سے ارباب اختیار کو اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی ۔ کالج میں لکھنے والے تو اب بھی موجود تھے، ان کے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن ان کی کتابوں کی

اشاعت بند ہو گئی تھی ۔ بینی نارائن جہاں کو بھی ان حالات کا شکار ہونا پڑا ۔ اور ان کی کتابیں بھی شائع نہ ہو سکیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ادبی کارنامے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور انہیں خاطر خواہ شہرت نصیب نہیں ہوئی ۔

بینی نارائن جہاں بنیادی طور پر ایک نثر نگار تھے ۔ انہوں نے ماحول کے اثر سے شاعری ضرور کی لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نے اس زمانے میں کوئی خاص مقام پیدا نہیں کیا تھا ۔ انہوں نے اپنے تذکرے دیوان جہاں کے شروع میں اپنے حالات نظم میں لکھے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر تھے ۔ لیکن ان کا کلام کہیں اور نہیں ملتا ۔ ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ سید حیدر بخش حیدری ان کے محسن تھے لیکن ان کے تذکرے میں بینی نارائن جہاں کا ذکر نہیں ہے ۔ مرزا علی لطف نے بھی اپنے تذکرے گلشن ہند میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ نساخ کا تذکرہ سخن شعراء بھی ان کے ذکر سے خالی ہے ۔ صرف کریم الدین ایک ایسے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے تذکرے طبقات شعرائے ہند میں بینی نارائن جہاں کا ذکر کیا ہے، اور کسی قدر تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں ۔ اس کے علاوہ کسی اور تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ملتا ۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں ان کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ان کے حالات کی تفصیل ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کتاب میں پیش نہیں کی ہے ۔ سکسینہ نے ''تاریخ ادب اردو میں،، سید محمد

نے ''ارباب نثر اردو،، میں اور حامد حسن قادری نے ''داستان تاریخ اردو،، میں ان کے حالات سے متعلق معمولی سی معلومات فراہم کی ہے۔

سکسینہ نے صرف اتنا لکھا ہے :

''بینی نارائن متخلص بہ جہان ''دیوان جہان،، کے مصنف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندوستانی شعراء کا بھی شامل ہے۱ جو کپتان روبک صاحب سیکریٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش پر ۱۸۱۲ء میں لکھا گیا اور انہیں کے نام معنون بھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ ''چار گلشن،، کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۱۸۱ء میں منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے اس کو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اس کی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کرا دی۔ گارساں دی تاسی کی تحقیق ہے کہ انہوں نے شاہ رفیع‌الدین صاحب کی تنبیہہ‌الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا، وہ بھی لکھتے ہیں کہ بینی نارائن مسلمان ہو گئے تھے، اور مولانا سید احمد صاحب سے

۱۔ سکسینہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دیوان جہان کو انہوں نے بینی نارائن کا دیوان سمجھ لیا ہے اور یہ قیاس کیا ہے کہ اس دیوان میں شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے، حالانکہ دیوان جہان تذکرے کا نام ہے۔ تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) ص ۱۴

بیعت بھی کر لی تھی''۱ -

سید محمد نے ارباب نثر اردو ''میں ان کے حالات کی صرف اتنی تفصیل بہم پہنچائی ہے :-

''بینی نارابن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے - ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارابن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے کھیم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے - ان کا تخلص رند تھا - بینی نارابن نے اپنی کتابوں کے دیباچوں وغیرہ میں اپنا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے - ان کی پیدائش اور تعلیم لاہور ہی میں ہوئی - گردش زمانہ سے وہ بہت تباہ حال اور تنگ دست ہوگئے اور چند ہی روز میں آسمانی و سلطانی آفتوں نے امارت و تمول سے محروم کرکے تلاش معاش کے لئے آوارہ وطن کردیا - پے در پے پریشانیاں اٹھا کر بالآخر وطن کو خدا حافظ کہا اور آب و دانہ کی تلاش میں کئی سال ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ جا پہنچے - ان کے کلکتہ آنے کا باعث فورٹ ولیم کالج کے قیام اور وہاں اہل قلم کی قدردانی و پرورش کی خبریں تھیں - جس وقت یہ کلکتہ پہنچے فورٹ ولیم کالج کا دور اول گزر چکا تھا - ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو اس کالج کے روح رواں اور مولفوں کے بہت بڑے سرپرست تھے اس کی صدارت سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن کو واپس ہوچکے تھے - کمپنی کے

---

۱ - رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو (نولکشور تیسرا الڈیشن) ص ۱۳ -

ارباب حل و عقد نے کالج کے دائرۂ عمل کو محدود کرنا شروع کردیا تھا اور وہاں نئے اہل قلم کی سرپرستی و اعانت کا کوئی سامان نہ تھا - یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن کلکتہ پہنچتے ہی کوئی عمدہ خدمت حاصل نہ کرسکے اور ان کو نووارد سمجھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی - غرض یہاں بھی بارہ برس کا زمانۂ دراز عسرت و پریشانی میں بسر ہوا - اس عرصہ میں انہوں نے کالج کے مشہور ارباب قلم اور مولفین سے راہ و رسم پیدا کرلی اور خصوصاً سید حیدر بخش حیدری سے ان کا ربط ضبط بڑھ گیا - ان ہی کی سفارش سے بینی نارائن کو کپتان ٹامس روبک کے ہاں باریابی کا موقع ملا - کپتان مذکور نے ان کو کالج کے ارباب قلم میں ملازم رکھ لیا اور تصنیف و تالیف کا کام لینے لگے -

کالج کی سلک ملازمت میں داخل ہوکر بینی نارائن نے دو کتابیں تالیف کی ہیں : (۱) ''چار گلشن،، اور (۲) ''دیوان جہان،، گارسان دی تاسی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب کی فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا بھی ۱۲۳۵ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے - گارسان دی تاسی ہی کا بیان ہے کہ بینی نارئن نے مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور مشہور مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی - اس بیان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں - بینی نارائن کا ترجمہ تنبیہ الغافلین موجود ہے جس سے یہ بیان بالکل مصدقہ ہوجاتا ہے - ان کی تاریخ وفات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا - البتہ گارسان دی تاسی کے مذکورۂ بالا بیان کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ۱۲۳۵ء کے

بعد وفات پائی ہوگی،، - ۱

اور مولانا حامد حسن قادری نے ”داستان تاریخ اردو،، میں صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے :

”بینی نارائن جہان لاہور کے رہنے والے تھے - ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن بڑے رئیس تھے - ان کے بھائی رائے کھیم نرائن عالم و شاعر تھے - رند تخلص کرتے تھے - بینی نرائن روزگار سے تباہ ہوکر کلکتہ پہنچے - اس زمانے میں ڈاکٹر گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہوکر ولایت چلے گئے تھے - بینی نارائن ایک عرصے تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے - پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلے سے کالج میں ملازم ہوئے - ان کی تصانیف یہ ہیں (۱) چارگلشن (۲) دیوان جہان (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین - یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں - برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ان کے مسودے محفوظ ہیں - ۲

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لکھنے والوں کی معلومات بینی نارائن جہان کے بارے میں محدود تھی - اور ان سب نے ان کے بارے میں کم و بیش ایک ہی قسم کا مواد فراہم کیا ہے -

بات یہ ہے کہ بہت سے ماخذ تک ان کی رسائی نہ ہوسکی - اسی لئے ان میں سے کوئی ایک بھی اس سلسلے میں تحقیق کے ساتھ کوئی نئی بات نہ کہہ سکا -

---

۱ - سید محمد : ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۴۹-۲۵۱

۲ - حامد حسن قادری : داستان تاریخ اردو (آگرہ ۱۹۴۱) ص ۱۳۴

بینی نارائن جہان کے حالات پر جن مآخذ سے نئی روشنی پڑتی ہے ان میں ایک تو خود ان کی تحریریں ہیں ۔ دوسرے ان کے بڑے بھائی کھیم نرائن رند کی غیر مطبوعہ داستان ''قصہ جان و دل،، کا وہ دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور اس ماحول کی تصویر بھی پیش کی ہے جس میں خود انھوں نے اور ان کے چھوٹے بھائی بینی نارائن جہان نے زندگی کے دن گزارے تھے ۔ اور تیسرے کریم الدین کے تذکرے طبقات شعرائے ہند اور گارساں دی تاسی کی تاریخ ادب میں لکھے ہوئے وہ حالات ہیں جو بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں ، اور جن سے بینی نارائن جہان کی زندگی اور ادبی کارناموں کے بارے میں بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔

چار گلشن کے شروع میں دیباچے کے طور پر بینی نارائن جہان نے اپنے حالات بیان کئے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

''اب یہ ذرۂ بے مقدار عاصی، گنہگار، بندہ بینی نارائن ابن رائے شودرشٹ نارائن نبیرہ مہاراجہ لچھمی نارائن مرحوم، قوم کھتری سہتہ، ساکن دارالسلطنت لاہور، جو بیچ سال بارہ سو پندرہ ہجری (۱۲۱۵) کے عہد میں نواب معلی القاب مارکویس وازلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب دام اقبالہ کے، کہ بہ عہد وکالت وزیر الملک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہ کے، بیچ شہر لطافت بھر کلکتہ کے آئے تھے، وارد ہوا ۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا ہوگا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے اور

اب کہ سنہ ایک ہزار اور دو سو پچیس (۱۲۲۵) ہجری میں، عہد دولت میں نواب مستطاب، گردون رکاب، مہر سپہر دولت و بختیاری، ماہ تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز، مشیر خاص الخاص، بادشاہ کیوان بارگاہ انگلستان زبدۂ نوئینان عظیم الشان، گورنر جنرل اشرف الامراء لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک دن اس کہانی کو، کہ بہت دنوں سے اس گنہگار کو یاد تھی، برسبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان، معدن لطف و احسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا ۔

منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بہ ضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا کہ، اس قصہ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لائیے ۔ اور زبان ہندی میں اوپر صفحۂ کاغذ کے لکھیئے ۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقبت یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولتہ کے گذارئیے کہ اگر ان کو جان سخن کہئیے تو بجا ہے بلکہ جان سخن کہنا سزا ہے ۔ اس کے سننے سے وہ جناب محظوظ ہوویں اور بہ سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے ۔

سو اس عاصی نے موجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو کہ عقل ناقص میں آیا، قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا ۔ امید حضور فیض گنجور سے اس جناب کی کہ قدر دان اہل سخن و فیض رسان زمین و زمن ہیں، یہ ہے کہ اس نذر حقیر کو نظر قبول سے سرفراز فرماویں ۔ اور چشم داشت سامعان

روزگار اور منشیان عالی وقار سے یہ ہے کہ جو کوئی سہو اور خطا، کیا عبارت میں اور کیا بیچ کتابت کے، اس کہانی کے نظر آوے، از روئے اپنی بزرگی کے قلم اصلاح سے قصور نہ کریں - اور بہ سبب اس قصۂ رنگین کے اس مور ضعیف کو بھی یاد فرماویں''۱ -

اور دیوان جہان کے شروع میں اپنے حالات اس طرح نظم کئے ہیں :

کر آغاز سخن حمد خدا سے
پھر اس کے بعد نعت مصطفیٰ سے

خدا خالق ہے ہم ہیں آفریدہ
نبی جتنے ہیں سب ہیں برگزیدہ

محمد پر ہوئی ختم رسالت
علی ہے مالک ملک ولایت

ہمیشہ یاد تو ان کی کیا کر
انہیں کا ساغر الفت پیا کر

الہی تیرے بندے جتنے ہیں خاص
جناب ان کی میں رکھتا ہوں میں اخلاص

---

۱ - بینی نارائن جہان - چار گلشن (قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن) ورق ۱—۲

مجھے تو اس وسیلے سے شب و روز
غموں پر رکھ مظفر اور نیروز

فلک پر چمکے یوں میرا ستارا
کریں رنج و الم جس سے کنارا

سبب تالیف

کروں ہوں اب میں ظاہر اپنا احوال
مجھے غم نے کیا از بسکہ پامال

رہا ہندوستاں میں با دل شاد
بفضل حق تھا گھر میرا بھی آباد

کیا کرتا تھا میں نت سیر گلزار
نہ تھا غم سے کبھی مجھ کو سروکار

حسد پر چرخ جو آیا یکایک
تو جوں خورشید دل میرا گیا پک

جو گردش نے مجھے واں سے اٹھایا
نصیبوں نے یہ کلکتہ دکھایا

چھٹا مجھ سے جو ہندوستان کا گلشن
کیا میں ملک بنگالہ میں مسکن

جو میرے کیں میں تھا یہ چرخ دوّار
ھا بارہ برس میں یاں بھی بیکار

جو تھی آٹھوں پہر فکر خور و پوش
ہمیشہ غم سے رہتا تھا ہم آغوش

ہے حیدر بخش نام نامی جن کا
ہیں فن شعر میں جوں در یکتا

انھوں نے میرے گھر تشریف لاکر
میری حالت کو دیکھ افسوس کھا کر

یہ فرمایا مجھے از راہ الفت
نکال اب دل سے تو اندوہ و کلفت

یہ کئی بیتیں جناب فیض مآب دستگیر بیکساں و حامی در ماندگان مسٹر ٹامس روبک صاحب بہادر دام اقبالہ کی تعریف میں ۔

تو کیوں حاضر نہیں ہوتا ہے اس جا
کہ جس کے فیض کا ہے جگ میں شہرا

وہ ہے ٹامس ربک صاحب بہادر
ہے جس کے جود و بخشش سے جہاں پر

جو کوئی التجا اس پاس لے جائے
وہ اس کے فیض سے لعل و گہر پائے

ہیں اس کے فیض سے سب جزو کل شاد
رکھے اس جگ میں حق نت اس کو آباد

پناہ بیکساں ہے ذات اس کی
سدا حق خوش رکھے اوقات اس کی

صفت اس کی کروں جو کچھ بجا ہے
خدا نے اس کو سب لائق کیا ہے

الہی ہو زیادہ اس کا اقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال

گیا میں سر قدم کر کے جو اس پاس
مرے دل کا گیا سب رنج و وسواس

ستایش کیا کروں اس کے مکاں کی
زباں کو اب نہیں طاقت بیاں کی

ہوا میں دیکھ اس کو بس کہ دل شاد
پڑا واں یاد مجھ کو شعر استاد

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمین است و ہمین است و ہمیں است

خداوندا تو رکھ دل شاد اس کو
جہاں میں روز و شب آباد اس کو

کیا ارشاد یوں اس نے کرم سے
تجھے جو لطف کی ہے چشم ہم سے

تو کر شعر و غزل کتنے فراہم
کریں اس کے صلہ کا فکر تاہم

ہوا یہ بات سنتے ہی میں دل شاد
بجا لایا کیا تھا جو کچھ ارشاد

تلاش و سعی تب کرکے فراواں
جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں

انہوں کے جمع کر اشعار یکسر
سوا ان کے جو تھے نامی سخنور

انہوں کی بھی غزل اور شعر لکھے
بہ ترتیب و بہ آئیں جمع کرکے

خدا کے فضل سے دے اس کو انجام
میں دیوان جہاں اس کا رکھا نام

کیا تھا چار گلشن پہلے تحریر
صلے سے اس کے پائی میں نے توقیر

یہ چند اشعار دیباچہ کے مانند
کئے ہیں اس مولف نے قلم بند

دعا پر ختم کر بینی نارائن
کہ مستحسن سخنور کو ہے یہ فن

رہے جب تک کہ طرز نظم یارب
پسند اس کو کریں اہل جہاں سب۱

کھیم نرائن رند، بینی نارائن جہان کے بڑے بھائی تھے اور جہان کی پرورش انھی کے زیر سایہ ہوئی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تذکرے 'دیوان جہان' میں رند کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ لکھا ہے ۔

''رند تخلص، نام رائے کھیم نارائن، مہاراجہ لچھمی نارائن کے پوتے ۔ عمدہ روزگار رہے ۔ دلی کے رہنے والے اور اب ہگلی میں تشریف رکھتے ہیں ۔ اور یہ خاکسار بھی چھوٹا بھائی انہیں کا ہے۲'' ۔

یہ رائے کھیم نارائن شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ۔ نثر میں انہوں نے قیام ہگلی کے زمانے میں ایک داستان قصۂ جان و دل کے نام سے لکھی تھی ۔ یہ داستان کبھی شائع نہیں ہوئی ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۸۳۸ء کا لکھا ہوا کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اس کے دیباچے میں رند نے اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں ۔ ان حالات سے بینی نارائن جہان کے

۱ - بینی نارائن جہان : دیوان جہان قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ورق ۱—۳ -
۲ - ایضاً ورق ۶۶ -

خاندانی حالات اور ماحول کا علم بھی ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :

''سامعان انصاف پیشہ و منشیان فصاحت اندیشہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ رتبہ نام نامی و اسم سامی کا میرے بزرگوں کے اگرچہ اس سے بلند ہے کہ محتاج اظہار کا ہو اور گم نامی و ہیچ مدانی اس گنہگار کی بھی بایں درجہ واقع ہوئی ہے کہ اس کے بھی اظہار کی حاجت نہیں ۔ مگر خود زبان کو صانع حقیقی نے واسطے بولنے پیدا کیا ۔ پس لازم ہوا کہ بہ قدر اپنی عقل کچھ بولا چاہئے ۔ اسی سبب چند سطریں متضمن اپنی سرگذشت کے اور باعث تحریر اس کتابہ کا لکھتا ہوں ۔

واضح ہو جیو کہ لقب اسی عاصی کا کھیم نارائن اور تخلص رند ہے ۔ اگرچہ وطن اصلی لاہور تھا مگر پانچ پشت سے رزاق مطلق نے بلاد خجستہ بنیاد شاہجہان آباد پر تنخواہ لکھا ۔ چنانچہ جب کہ سلطان بحر و بر محمد فرخ سیر صوبۂ عظیم آباد سے نہضت کر کے معزالدین بادشاہ پر فتح یاب ہوا اور دارالخلافت شاہجہان آباد نے اوس کے قدم میمنت لزوم سے رونق بہشت برین پائی، جد پنجم اس خاکسار کے کہ دیوان آتما رام جن کا نام تھا بموجب حکم بادشاہ، واسطے نظم و نسق صوبۂ اکبرآباد کے، ہمراہ نواب گنج علی خاں سرفراز ہوئے ۔ بعد چند روز شطرنج باز فلک نے عجب بازی کھیلی کہ عبداللہ خاں وزیر مانند فرزین کج خرام ہوا ۔ اور حسین علی خان میر بخشی نے سب سوار و پیادہ و اسپ و فیل اختیار میں کر کے بادشاہ کی خدمت سے رخ پھیرا ۔ تب بادشاہ بے گناہ دیوانہ وار نہایت زچ ہو کر آخر وزیر کی کشت سے مات ہوا ۔ بعد اس ہنگامۂ قیامت آشوب کے جب

سوائے بادشاہ فرخ سیر اور چار شاہزادے نے بھی سلطنت کی رسم سے بدنام ہوکر عبداللہ خاں و حسین علی خاں کے پھیر سے کہ فی الحقیقت میں اصل تھی، پیالہ شراب مرگ کا پیا۔ دو ایک مہینے میں مانند ماہ نو غرۂ اقبال اون کا سلخ کو پہنچا۔ تب اورنگ سلطنت و افسر خلافت نے وجود باجود صاحب قرآن ثانی محمد شاہ بادشاہ غازی سے رونق پائی اور چند روز میں عبداللہ خاں و حسین علی خاں قصاص کفران نعمت میں گرفتار ہوئے۔ بادشاہ فلک بارگاہ نے نواب سعادت خاں بہادر کو کہ نیشا پور سے تازہ وارد ہندوستان ہوکر جنگ عبداللہ خاں میں مصدر کارہائے نمایاں ہوئے تھے، بہ خطاب برہان الملک و خدمت صوبہ داری اکبر آباد و صوبۂ اودھ سرفراز فرمایا۔ و دیوان آتما رام کو از راہ نوازش بادشاہی ہمراہ نواب برہان الملک بہ‌علاقۂ دیوانی صوبہ‌جات مسطورہ رخصت کیا۔ رائے لچھمی نرائن نبیرۂ دیوان آتما رام بعہدۂ وکالت برہان الملک حضور اقدس میں حاضر رہے۔ اور نبض مزاج کو دستیاری، تدبیر سے ایسا ہاتھ میں لائے کہ رفتہ رفتہ خطاب مہاراجگی و جاگیر بست و دو لاکھ روپیہ سالیانہ و علم طوغ و نوبت و نقارہ پاکر امرائے ہفت ہزاری کے ساتھ نوبت ہمسری کی بجائی۔ غرض اس عہد سے تا بوقت خلافت شاہ عالم بادشاہ، اقتدار مہاراجہ موصوف کا ترقی میں رہا۔ اخیر عمر شہر الہ آباد میں خدمت نیابت نواب شجاع الدولہ وزیر الممالک بہادر کو بخوبی سرانجام کیا۔ اور بادشاہ نے جو از راہ قدر شناسی اپنا وکیل مطلق مہاراجہ مذبور کو مقرر فرمایا تھا، اس کام کو بھی بہ آئین شائستہ حسن انجام دیا۔ چونکہ رسم زمانے کی یہ ہے کہ فلک کج خرام ہمیشہ سنگ حوادث ہاتھ میں لئے، جہاں چندیں صاحبدل آئینہ باطن

یک جا ہوتے ہیں ، فی‌الفور چوٹ کرتا ہے ۔ مہاراجہ لچھمی ناراِئن نے اس خاکدان جہان فانی سے بہشت بریں میں منزل کی ۔ اور مہاراجہ کشن نرائن خلف الصدق مہاراجہ مرحوم بہ عطائے منصب و جاکرت جاگیر بدستور سرفراز ہوئے ۔ و جب کہ شاہ عالم بادشاہ طرف شاہجہان آباد راہی ہوئے و بعد چند سال نواب شجاع الدولہ کے طائر روح ۔ قفس سے پرواز کر کے شاخ سدرہ پر آشیاں کیا، تب نواب گردون جناب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر نے مہاراجہ کشن ناراِئن کو حضرت شاہ عالم کے حضور کو رخصت فرمایا ۔ بعد سختی کے فلک نیرنگ باز نے خاک سی راقم حروف کے سر پر ڈالی ۔ یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ سودرشت ناراِئن جن کا نام تھا، گلگشت جنت کا عزم کیا ۔ بعد اس سانحۂ ناگزیر کے جد بزرگوار نے تربیت میں اس ہیچ مداں کی نہایت شفقت و کوشش مبذول فرمائی ۔ چنانچہ تھوڑے ایام مین مطالعۂ کتب ضروری سے فراغت کر کے محسود اقران ہوا ۔ طبیعت کو استادوں کے کلام کی سیر سے جب قوت پیدا ہوئی و صاحب سخنوں کی بزم صحبت میں چرچا شعر و سخن کا رہنے لگا ، اس ہیچ مداں کو بھی شوق شعر کہنے و نثر لکھنے کا گریبان گیر خاطر ہوا ۔ صاحب سخن شہر کے جب غزل تازہ طرح کرتے تھے یہ عاصی بھی موافق عقل ناقص کچھ کہتا اور آفرین سنتا ۔ جب کہ ساقی اجل نے مولوی فخرالدین صاحب و مرزا جان جانان و خواجہ میر درد صاحب علیہ الرحمۃ و الغفران کو شربت مرگ سے سیراب کیا، جدائی سے ان بزرگوں کی اس سرمست نشۂ سخن کی شراب زندگی تلخ ہوئی ۔ تب لاچار خدمت جد بزرگوار سے رخصت ہو کر عزم شہر لکھنؤ کا کیا و سولہ برس حضور

نواب آصف الدوله بہادر میں بہ عیش و عشرت بسر ہوئی۔ مرزا محمد رفیع تخلص سودا و میر محمد تقی صاحب کہ رفقائے قدیم جد مرحوم تھے ، ہمیشہ اس خاکسار کے کلبۂ احزان کو نور قدوم سے منور رکھتے اور بلبل زبان کو زمزمہ سنجی اشعار آبدار سے مترنم رکھ کر چمنستان سخن کو رشک گلزار بہشت کرتے تھے۔ ان دنوں اس عاصی کو شوق شعر فارسی کا گریبان گیر تھا۔ چنانچہ دو سال کے عرصے میں قصۂ چہار درویش، و افسانۂ حسن و عشق، عشق ہیر و رانجھا و ایک مثنوی مسمابہ 'باغ و بہار، اور دوسری 'گوہر شہوار، و ایک دیوان متضمن ہر قسم کے شعر کا تصنیف کیا۔ و نثر میں بھی دو رسالہ معنی حسن آداب و اخلاق کے لکھے۔ گاہ گاہے میرزا محمد رفیع و مخمس (؟ کذا) کی بزبان ریختہ کر لیتے تو وہ بھی اتفاق کسی کا ہوتا تھا۔ جب کہ نواب آصف‌الدولہ بہادر نے بھی عزم گلگشت جنت کا فرمایا اور چار مہینے میں وزیر علی خاں مانند حباب نگاہ حسرت آلود دریائے دولت پر کھول کے گرداب ادبار میں گم ہو گیا، نواب یمین الدولہ نظم الملک سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ سفارش سے ان کی مسند نشین ایوان وزارت ہوئے۔ جس وقت کہ نواب مستطاب معلی القاب گورنرجنرل مار کویس‌لارڈ مارنگٹین ولزلی صاحب بہادر نے شہر کلکتہ سے طرف لکھنؤ کے نہضت فرمائی، نواب وزیر الممالک سعادت علی خاں بہادر نے بوقت رخصت اس خاکسار کے حقوق قدامت کو منظور فرمایا کہ بہ عہدۂ سفارت حضور گورنر بہادر میں مامور کیا۔ اگرچہ چار برس لوازم دولت خواہی میں کچھ قصور نہ ہوا مگر بہ سبب نحوست گذر اوقات مشکل دیکھ کے نوکری سے استعفا دیا و باشندگی شہر کلکتہ کو اختیار کیا۔

چنانچہ تین سال گذرے کہ یہ عاصی اس شہر لطافت بہر میں مقیم ہے ۔ اگر اس شہر کی رونق آبادی و لطافت مکانات کے وصف کو معمار خرد چاہے کہ احاطۂ تحریر میں لاوے انداز و قیاس سے زیادہ ہے ۔ مگر قطع نظر اور کیفیتوں کے جو امتحان جوہر قابلیت اور چرچا شعر و سخن کا اس شہر میں ہے، بالفعل کسی دیار میں نہیں ۔ حق یہ ہے کہ حق تعالے نے صاحبان عالیشان انگریز بہادر کو جو ممالک وسیع کا مالک کیا عین حکمت الٰہی ہے ۔ کس واسطے کہ نوکر پروری و قدر دانی ارباب فضل و نزد عدوتہ (؟ کذا) مقرری کو بے منت دینا و لشکر کو آسودہ و خوشدل رکھنا اور اس کے سوا بہت سی باتیں کہ لازمۂ ریاست و ادارت و مملکت ستانی ہیں صاحبان عالیشان کی ذات مصدر حساب میں حقیقی اللہ اپنے فضل و کرم سے جمع کئے ہیں ۔ اگر نظر انصاف گزین سے دیکھئیے تو علم و ہنر، کہ بہ اقتضائے زمانہ بالکل جہان سے مفقود ہو گیا تھا، اس عہد دولت ابد مدت میں از سر نو تازہ ہوا ۔ علی الخصوص نواب مستطاب گورنر جنرل اشرف الاشراف مار کوئس لارڈ مارنگٹن ولزلی بہادر نے جب سے مدرسۂ جدید کہ بہ اسم کالج مشہور ہے مقرر فرمایا، فی الحقیقت گویا علم مردہ کو جلایا و احسان عظیم گردن پر ایک عالم کی ثابت کیا ۔ کس واسطے کہ صاحبان عالیشان کو تحصیل علم سے فواید کثیر متصور ہیں ۔ اور بہت سے شرفا و نجبا علاقۂ منشی گری و معلمی سے سرفراز ہو کر وجہ قوت لایموت سے مطمئن رہے ہیں ۔ اگرچہ راقم حروف کو کچھ علاقہ کالج سے نہیں مگر جب دریافت ہوا کہ اس شہر میں ارباب سخن کے قدردان ہیں اور صاحبان قدردان زر کامل نظم و نثر کو محک امتحان پر کھینچ کر درج اعتبار میں رکھتے ہیں، خصوصاً

صاحب والا مناقب کثیر المواهب عالی قدر والا همم ڈاکٹر صاحب مسیحادم ڈاکٹر هنٹر صاحب سلمه الله الواهب که شخص سخن کی نبض سبابۂ حکمت سے ملاحظه فرما کر اپنی دارالشفائی عقل کامل سے نسخۂ صحت لکھ کے سقم کو مٹا دیتے یعنی بیماران خسته جگر افلاس کو شربت دینار سے صحت بخشتے هیں اور جس سقیم الوجود زبوں کو که رنج افلاس قابض روح هو رها هے اپنی نوازش سے فلوس عطا کرتے هیں - سوائے اس کے حکمت الہی یه هے که جس طرح سے صاحبان عالی شان انگریز بہادر خدمات عمده پر سرفراز هیں اور بندوبست ضلعات ممالک محروسه سرکار کمپنی انگریز بہادر کا هر ایک صاحب کی رائے صائب پر تفویض هیں، بالفعل حضور فیض معمور نواب گردوں جناب مشیر خاص بادشاه کیوان بارگاه انگلستان زبدۂ نوئینان عظیم‌الشان اشرف الاشراف سالار افواج کمپنی انگریز بہادر گورنر جنرل لارڈ منٹو صاحب دام اقباله نظم و نسق اقلیم سخن طرازی، کا کالج جس کا نام هے ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذمے هے - هر خوردنے اس بندۂ عاصی کو کہا که اس عهد میں که بازار سخن پردازی کو رونق تازه هے اور گلستان علم و هنر کو شگفتگی و طراوت بے اندازه - خاموش بیٹھنا اور غنچۂ خاطر کو سموم غم سے پژمرده رکھنا مناسب نہیں - نظم :

زباں کو ذرا مثل طوطی کے کھول
ترا دل هے آئینه کچھ بات بول

سنا جب که میں نے یه اوس کا کلام
بھرا بادۂ عیش سے دل کا جام

زبان کو مری تازہ طاقت ہوئی
تحیر کے غم سے افاقت ہوئی

تب سر زانوئے فکر پر رکھ کر دل میں سوچا کہ پیشتر چند رسالۂ نظم و نثر زبان فارسی میں تصنیف کر چکا ہوں ۔ اور اس شہر میں بالفعل زبان اردو نہایت پسند طبائع ہے ۔ کوئی حکایت رنگین زبان اردو میں لکھئیے ۔ جب یہ ارادہ مصمم ہوا تب افسانۂ 'جان و دل'، کہ نہایت لطیف و دلچسپ تھا سنہ بارہ سو تئیس (۱۲۲۳) ہجری میں موافق سنہ اٹھارہ سو آٹھ عیسوی کے تحریر کیا[۱]''۔

کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقات شعرائے ہند میں بینی نرائن جہاں کا ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل پیش کی ہے، لکھتے ہیں :

''مہاراجہ لکشمی نرائن کا فرزند اور بھائی رائے کھیم نرائن رند کا ۔ یہ شخص عالم آدمی تھا ۔ درمیان لاہور کے رہتا تھا ۔ اس نے ایک کتاب بنام 'دیوان جہاں' کے تصنیف کی ہے جس میں اچھے اچھے شعر اکثر انتخاب اشعار شعراء اردو گو کے جن کے اس کو بہم آئے، لکھے ہیں ۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف اس کتاب کا بیان کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں خوشی اور آرام سے رہتا تھا ۔ جب تک کہ اس کی قسمت نے اس سے رشک کھا کر اس کی خوش حالی کو مبدل کیا ۔ پھر وہ مجبور ہو کر

---

۱ - کھیم نرائن رند : قصۂ جان و دل قلمی نسخہ کیمبرج ورق ۳ ۔

کلکتہ کو گیا۔ وہاں بھی اس کی قسمت بد نے اس کی سختی سے پیروی کی ۔ وہ بارہ برس بے روزگار اور بہت تنگدستی میں رہا ۔ آخرش حیدر بخش قابل اور مشہور شاعر نے اس کے حال پر رحم کیا اور اس کو آرام دیا ۔ بلکہ اس نے روبک صاحب سے جو مشہور ہندوستانی زبان داں تھا، اس کی ملاقات کروا دی ۔ اس صاحب نے اسے اپنی خدمت میں لیا اور اس کی تنگدستی کو بخشش و عزت سے دور کیا ۔ اس صاحب کی خواہش سے اس نے بیچ ۱۸۱۳ء کے کتاب دیوان جہاں مذکور تصنیف کی تھی ۔ اس کتاب میں تین چیزیں ہیں: اول مناجات اور دیباچہ نظم میں ۔ دوسرے مختلف اشعار منتخب ۔ تیسرے چند شعر خود مصنف کے ۔ ایک اور کتاب جو بینی نارائن نے لکھی ہے وہ قصہ شاہ و درویش کا ہے، جس کا مضمون وہی ہے جو فارسی قصہ نظم ہلالی میں ہے اور اس کا بھی نام یہی ہے ولسن صاحب کے پاس ایک قلمی جلد نستعلیق حروف چوورقی جلد میں ہے ۔ یہ کتاب اردو زبان میں بینی نارائن کی پہلی ہے ۔ تصنیف فارسی میں ہے ۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے بنام چہار گلشن کے ۔ اس کتاب کا ذکر روبک صاحب نے فورٹ ولیم کے مدرسہ کی رپورٹ میں درمیان صفحہ (۳۳۹) کے لکھا ہے ۔ اس کتاب کی قلمی جلد فورٹ ولیم کے مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور حال میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے ۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے،،[۱] ۔

گارساں دی تاسی نے اپنی تاریخ ادب میں کم و بیش اسی قسم کی معلومات فراہم کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

---

۱ - کریم الدین : طبقات شعرائے ہند : ص ۳۱۰ -

بینی نارائن، مہاراجہ لکشمی نارائن کے بیٹے، رائے کھیم نرائن رند کے بھائی، لاہور کے رہنے والے، ہندو مصنف اور شاعر ہیں، جن سے مندرجہ ذیل کتابیں منسوب ہیں :

۱ - دیوان جہاں : مخصوص اردو شاعروں کے کلام کے منتخبات پر مشتمل ایک بیاض ہے ۔ اس بیاض کے دیباچے میں مصنف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سکھ چین کی زندگی گذارتے ہوئے ایک بار تقدیر نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس کا آرام و سکون برباد ہوگیا ۔ لہذا مجبوراً اسے صوبہ بنگال کے شہر کلکتہ کا رخ کرنا پڑا ۔ یہاں بھی کرم کے لچھمن ساتھ رہے، اور اسے بارہ برس عالم غربت میں، بلا کسی روزگار کے، گذران کرنی پڑی ۔ تا آنکہ مشہور شاعر حیدر بخش اس کے حالات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کی دلجوئی کی ۔ علاوہ ازیں ماہر زبان ہندوستان ٹی ۔ روبک صاحب سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جو اس سے بہت متاثر ہوئے اور جنہوں نے اسے معقول آمدنی کی آسامی سے منسلک کر کے اس کی پریشانیوں کو دور کیا ۔ صاحب موصوف کی خواہش کے مطابق ۱۸۱۴ء میں بینی نارائن نے اردو شاعری کی بیاض 'دیوان جہاں، مرتب کی ۔ اس بیاض کی ترتیب یہ ہے :

(۱) پیش لفظ اور دیباچہ ۔

(۲) مختلف شعراء کے کلام سے انتخاب ۔

(۳) اختصار کے ساتھ مصنف کا شعری کلام ۔

۲ - قصۂ شاہ و درویش بھی بینی نارائن کی تصنیف ہے ۔ اس کی ترتیب ہلالی کی فارسی نظم کے مطابق ہے، جس کا عنوان بھی

بھی ہے - ولسن صاحب کے پاس اس کا ایک مسودہ نستعلیق میں لکھا ہوا موجود ہے - شاعر کے اور کلام کی طرح یہ بھی اردو میں ہے - بینی نارائن کی یہ پہلی تصنیف فارسی سے ترجمہ ہے - اس کا ایک نام چار گلشن بھی ہے - فورٹ ولیم کالج کی تاریخ ص ۲۳۹ پر ٹی روبک صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے - کلکتہ کی فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا اور اب وہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں ہے - یہ ایک فارسی ناول ہے کیونکہ اسے ایک دلچسپ قصہ کہا جاتا ہے۱ -

ان ماخذ میں جو حالات و واقعات ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں، ان کو ایک لڑی میں پرو کر صحت اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ یک جا کیا جائے تو بینی نارائن جہان کے حالات اور شخصیت کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے -

یہ ماخذ ان حقائق کو واضح کرتے ہیں کہ بینی نارائن جہان لاہور کے رہنے والے تھے - ان کا خاندان مہتہ کھتریوں کا مشہور خاندان تھا - یہ خاندان عرصے تک لاہور میں آباد رہا - لیکن مغلوں کے دور آخر میں بینی نارائن جہان کے بزرگ شاہجہان آباد دلی چلے گئے - فرخ سیر کے زمانے میں بینی نارائن جہان کے جدپنجم دیوان آتما رام بادشاہ کے حکم کے مطابق اکبر آباد کے صوبیدار نواب گنج علی خاں کے ساتھ انتظامی امور میں ہاتھ بٹانے کے کام پر مامور ہوئے - اس کے بعد نواب برہان الملک کی سرکار میں بھی انہیں اعلی منصب ملا - رائے لچھمی نارائن نبیرۂ دیوان آتمارام

۱ - گارسان دی تاسی - تاریخ ادب ہندوستانی - ص ۱۱۵-۱۶

انھی برھان الملک کی سرکار میں بہ عہدۂ وکالت سرفراز رہے۔ انہیں اس سرکار سے مہاراجہ کا خطاب بھی ملا۔ ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی گئی اور ان کا منصب ھفت ھزاری تک پہنچ گیا۔ رائے لچھمی نارائن کے بیٹے مہاراجہ شودرشٹ نارائن تھے جو شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی سرکار میں اعلی عہدوں پر فائز تھے۔ بینی نارائن جہاں کے والد راجہ شودرشٹ نارائن، مہاراجہ لچھمی نارائن کے فرزند تھے۔ ان کا انتقال اپنے والد کی زندگی ھی میں ھوگیا۔ اس لئے ان کے بیٹوں (بینی نارائن جہاں اور کھیم نارائن رند) کی پرورش دادا ھی کے زیر سایہ ھوئی۔ بینی نارائن جہان کے بھائی رائے کھیم نارائن رند بھی سولہ سال تک لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ منسلک رہے اور وھاں ان کا وقت اچھا گزرا۔ غرض بینی نارائن جہاں کے بزرگوں نے اچھے دن دیکھے۔ وہ ایک زمانے تک اعلی عہدوں پر فائز رہے اور اس اعتبار سے ان کے خاندان کو خاصی شہرت اور اھمیت حاصل رھی۔

بینی نارائن جہاں کے والد کا نام رائے شودرشت نارائن تھا۔ انھوں نے خود چارگلشن کے دیباچے میں لکھا ھے:

"اب یہ ذرۂ بے مقدار، عاصی گناہگار بندہ بینی نارائن ابن رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ رائے لچھمی نارائن مرحوم قوم کھتری مہتہ ساکن دارالسطنت لاھور[۱]"۔

اور ان کے بھائی کھیم نارائن رند نے بھی لکھا ھے۔

۱ - بینی نارائن جہاں: چار گلشن: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص ۱ -

''بعد وہاں سختی کے فلک نیرنگ باز نے خاک سی راقم کے سر پر ڈالی - یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ شودرشٹ نارائن جن کا نام تھا، گلگشت جنت کا عزم کیا . . . .''۱ -

سید محمد نے ارباب نثر اردو میں ان کے والد کا نام مہاراجہ لکشمی نارائن بتایا ہے، لکھتے ہیں:

''بینی نارائن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے - ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے کھیم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے ان کا تخلص رند تھا۲ '' -

حامد حسن قادری مرحوم نے سید محمد کے اسی بیان کو داستان تاریخ اردو میں دھرایا ہے - لکھتے ہیں:

''بینی نارائن جہاں لاہور کے رہنے والے تھے - ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن بڑے رئیس تھے - ان کے بھائی رائے کھیم نارائن عالم و شاعر تھے - رند تخلص کرتے تھے۳ '' -

ظاہر ہے کہ سید محمد اور حامد حسن قادری مرحوم دونوں سے غلطی ہوئی ہے - ان دونوں کو بینی نارائن جہاں کے چارگلشن اور کھیم نارائن رند کے قصۂ جان و دل کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا - انھوں نے گارساں دی تاسی اور کریم الدین کے بیان کو تسلیم کر لیا ہے اور ان دونوں سے بھی بڑی غلطی ہوئی ہے کہ وہ بینی نارائن کو لچھمی نارائن کا بیٹا سمجھ بیٹھے ہیں - کریم الدین لکھتے ہیں:

۱ - کھیم نارائن رند - قصۂ جان و دل، قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری - ص ۵ -
۲ - سید محمد، ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۳۹ -
۳ - حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو (آگرہ) ص ۱۳۴ -

''بینی نارائن لکشمی نارائن کا فرزند اور بھائی کھیم نارائن رند۱''۔

اور دی تاسی کا بیان ہے ۔

"Beni Narayan, fIls du Maharaja Lakschmi Narayan ct frere de Rae Khem Narayan Rind, est Un homm de lettres hindov natif de Lahore۲" .

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ ایک غلطی بار بار دھرائی گئی ہے ۔ اور جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ ان لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی بینی نارائن جہاں اور ان کے بھائی کھیم نارائن رند کی غیر مطبوعہ تصانیف کو نہیں دیکھا ۔ اور ان میں جو معلومات موجود ہے اس پر اپنے بیانات کی بنیاد نہیں رکھی ۔

بینی نارائن جہاں کے ابتدائی حالات کی تفصیل ان ماخذ میں بھی موجود نہیں ہے ۔ مثلاً کسی ذریعے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی تاریخ ولادت کیا ہے؟ اس بات کی وضاحت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ وہ لاہور یا دلی میں پیدا ہوئے ہوں گے ۔ ان کا خاصا وقت اپنے والد رائے شودرشٹ نارائن اور بڑے بھائی کھیم نارائن رند کے ساتھ دلی اور لکھنؤ میں گزرا ہوگا ۔ جہاں کے والد کی وفات کے بعد کھیم نارائن رند کی پرورش ان کے دادا مہاراجہ لکشمی نارائن نے کی ۔ بینی نارائن جہاں کی پرورش بھی انہیں کے زیر سایہ ہوئی ہوگی ۔ اور

۱ ۔ کریم الدین، طبقات شعرائے ہند، ص ۳۱۰ ۔

۲ - Carcin de-Tassy. Hitorire De La Literature Hindoui Et Hindoustani p. 115-116.

پھر اس کے بعد خود رند نے ان کی پرورش کا بار اٹھایا ہوگا۔ اگرچہ اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جب رند لکھنؤ سے کلکتہ گئے ہیں تو بینی نارائن جہان بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ ۱۲۱۵ء کے قریب کلکتہ پہنچے۔ اور وہاں دس سال تک بیکار رہے۔

بینی نارائن جہان چار گلشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"بیچ سال ۱۲۱۵ ہجری کے، عہد میں نواب معلی القاب مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے، ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ و خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب دام‌اقبالہ کہ، بہ عہدۂ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہ، کے بیچ شہر لطافت بھر، کلکتہ آئے تھے، وارد ہوا۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے۔ ۱

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ بینی نارائن جہان، کھیم نارائن رند کے ساتھ کلکتہ پہنچے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ لکھنؤ میں بھی وہ ان کے ساتھ رہے ہوں گے اور ان کی پرورش رند ہی کے زیر سایہ ہوئی ہوگی۔

بینی نارائن جہان کی تعلیم کے بارے میں بھی کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن کھیم نارائن رند نے جو کچھ

---

۱ - بینی نارائن جہان - چارگلشن - قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن - ورق ۳

لکھا ہے اس سے اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں علم و ادب کا چرچا تھا اور اس وقت کے علمی اور ادبی ماحول سے انہیں قربت حاصل تھی ۔ ان کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی ۔ اس ماحول کے اثر سے انہوں نے تعلیم کی وہ منزلیں ضرور طے کی ہوں گی جن کو طے کئے بغیر اس زمانے میں انسان کو زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا تھا ۔

کھیم نارائن رند لکھتے ہیں :

''فلک نیرنگ باز نے خاک سی راقم حروف کے سر پر ڈالی ۔ یعنی پدر بزرگوار نے اس خاکسار کے، راجہ محمودرشٹ نارائن جن کا نام تھا گلگشت جنت کا عزم کیا ۔ بعد اس سانحۂ ناگزیر کے جد بزرگوار نے تربیت میں اس ہیچ مدان کی نہایت شفقت و کوشش مبذول فرمائی ۔ چنانچہ تھوڑے ایام میں مطالعہ کتب ضروری سے فراغت کرکے محسود اقران ہوا ۔ طبیعت کو استادوں کے کلام کی سیر سے قوت پیدا ہوئی و صاحب سخنوں کی بزم صحبت میں چرچا شعر و سخن کا رہنے لگا ۔ اس ہیچ مدان کو بھی شوق شعر کہنے و نثر لکھنے کا گریبان گیر خاطر ہوا ۔ صاحب سخن شہر کے جب غزل تازہ طرح کرتے تھے یہ عاصی بھی موافق عقل ناقص کچھ کہتا اور آفرین سنتا ۔ جب کہ ساقیٔ اجل نے مولوی فخر الدین صاحب و مرزا جان جاناں و خواجہ میر درد صاحب علیہ الرحمہ و الغفران کو شربت مرگ سے سیراب کیا، جدائی سے ان بزرگوں کی اس سرمست نشاط سخن کی شراب زندگی تلخ ہوئی تب لاچار خدمت جد بزرگوار سے رخصت ہوکر عزم شہر لکھنؤ کا کیا و سولہ برس حضور نواب آصف الدولہ بہادر میں بہ عیش و عشرت بسر

ہوئی ۔ مرزا محمد رفیع متخلص سودا و میر محمد تقی صاحب کہ رفقائے قدیم جد مرحوم تھے، ہمیشہ اس خاکسار کے کلبۂ احزان کو نور قدوم سے منور رکھتے اور بلبل زبان کو زمزمہ منجی اشعار آبدار سے مترنم رکھ کر چمنستان سخن کو رشک گلزار بہشت کرتے تھے ۔ ان دنوں اس عاصی کو شوق شعر فارسی کا گریبان‌گیر تھا ۔ چنانچہ دو سال کے عرصے میں قصۂ چہار درویش و افسانۂ حسن و عشق و قصۂ عشق ہیر رانجھا و ایک مثنوی مسمابہ باغ بہار اور دوسری گوہر شہوار و ایک دیوان متضمن ہر قسم کے شعر کا تصنیف کیا ۔ و نثر میں بھی دو رسالہ معنی حسن و آداب و اخلاق کے لکھے“ ۔ ۱

ظاہر ہے کہ جس شخص کے بڑے بھائی نے اس ماحول میں زندگی کے دن گذارے ہوں گے، اس کے چھوٹے بھائی پر بھی اس کا اثر ہوا ہوگا ۔

غرض بینی نارائن جہاں کی تعلیم و تربیت اچھے ماحول میں ہوئی، اور انہوں نے دلی اور لکھنؤ میں میر اور سودا کے ماحول کو دیکھا ۔ اسی ماحول کے اثر سے انہیں اردو زبان اور ادب کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوا، اور ان کے دل میں تصنیف و تالیف کے جذب و شوق کی شمع فروزاں ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ اس کا سہرا بینی‌نارائن جہاں کے بڑے بھائی کھیم نارائن رند کے سر ہے ۔

---

۱ ۔ کھیم نارائن رند ۔ قصۂ جان و دل ۔ قلمی نسخۂ کیمرج یونیورسٹی لائبریری ۔ ورق ۵-۶

لیکن زمانے نے ان محفلوں کو برہم کر دیا، اور کھیم نارائن رند کو اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ جانا پڑا ۔ رند نے اس کی تفصیل قصۂ جان و دل کے دیباچے میں بیان کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''جب کہ نواب آصف الدولہ بہادر نے بھی عزم گلگشت جنت کا فرمایا ۔ اور چار مہینے میں وزیر علی خان مانند حباب نگاہ حسرت آلود دریائے دولت پرکھول کے گرداب ادبار میں گم ہو گیا ۔ نواب یمین الدولہ ناظم الملک سعادت علی خان بہادر مبارز جنگ سفارش سے ان کی مسند نشین ایوان وزارت ہوئے ۔ جس وقت کہ نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنریل مارکویس لارڈ مارنکٹین ولزلی صاحب بہادر نے شہر کلکتہ سے طرف لکھنؤ کے نہضت فرمائی نواب وزیر الممالک سعادت علی خان بہادر نے بوقت رخصت اس خاکسار کے حقوق قدامت کو منظور نظر فرمایا کہ بہ عہدۂ سفارت حضور گورنر بہادر میں مامور کیا ۔ اگرچہ چار برس لوازم دولت خواہی میں کچھ قصور نہ ہوا مگر بہ سبب نحوست ایام گذر اوقات مشکل دیکھ کے نوکری سے استعفا دیا و باشندگی شہر کلکتہ کو اختیار کیا ۔ چنانچہ تین سال گذرے کہ یہ عاصی اس شہر لطافت بہر میں مقیم ہے ۔ '' ۱

رند کی یہ داستان قصۂ جان و دل ۱۲۲۳ ہجری یعنی ۱۸۰۸ء

۱ ۔ کھیم نارائن رند ۔ قصۂ جان و دل قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی ۔ ورق ٦-۷

میں لکھی گئی - اس کا مطلب یہ ہے کہ بینی نارائن جہاں اپنے بھائی کھیم نارائن رند کے ساتھ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے قریب کلکتہ پہنچے - جہاں نے چار گلشن کے دیباچے میں اپنے جو حالات بیان کئے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے - ۱

یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی - ڈاکٹر گلکرسٹ نے وہاں اردو کے لکھنے والوں کو کالج میں جمع کر لیا تھا، اور تصنیف و تالیف کے منصوبے بنائے جارہے تھے - میر امن دھلوی، سید حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، خلیل علی خان اشک، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی خان ولا وغیرہ کالج میں ملازم ہو چکے تھے اور انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا تھا -

اس ماحول میں بینی نارائن جہاں کہیں نظر نہیں آتے - بلکہ یہ زمانہ ان کی بیکاری اور عسرت کا زمانہ ہے - دس سال انہوں نے اس بیکاری اور عسرت کے عالم میں گذارے - بالآخر ۱۲۲۵ھ کے قریب سید حیدر بخش حیدری کی سفارش پر انہیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت ملی - انہوں نے خود لکھا ہے کہ کلکتہ میں جب ان کی زبوں حالی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور وہ فکر خور و نوش کے باعث ہر لمحہ غم سے ہم آغوش رہتے تھے، تو ایک دن سید حیدر بخش حیدری جو فن شعر میں دریکتا تھے ان

---

۱ - بینی نارائن جہان - چار گلشن قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن - ورق ۲

کے مکان پر تشریف لائے، اور ان کی زبوں حالی پر ترس کھایا اور افسوس ظاہر کیا اور ٹامس روبک۱ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بینی نارائن جہاں ان سے ملے۔ انہوں نے ان سے اردو شعراء کے حالات لکھنے

۱۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اردو اہل قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ وہ ابتدآء فوج میں ملازم ہوئے اور لفٹنٹ اور پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی۔ ان کو اردو زبان اور اس کے ادب سے خاص شغف تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے فیض صحبت سے ان میں اردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ پہلے فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے جب ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی صدارت اور اردو کی پروفیسری سے سبکدوش ہوگئے تو یہی ان کی جگہ مامور ہوئے۔ مصنفین و مؤلفین کی سرپرستی کر کے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے مصنفین اور اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی ترغیب دی اور متعدد کتابیں شائع کرائیں۔ ان میں سے ایک منشی بینی نارائن جہاں ہیں جو کپتان روبک ہی کی بدولت مصنف بنے۔ کپتان روبک کو عام نثری کتابوں کے علاوہ اردو شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن جہاں سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھوایا۔ مرزا جان طپش نے جو کلکتہ کے مشہور شاعر اور فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے، اپنی مثنوی بہار دانش میں ان کی تعریف عجب پر لطف انداز میں کی ہے۔

پھر آگے کہاں وہ زبان و بیان
ادا ہو جو کپتان صاحب کی شان
شریف النسب اور گرامی شکوہ
حکیم و خردمند و دانش پژوہ

کی فرمائش کی اور وہ اس کام میں مصروف ہوئے ۔ لیکن اس سے قبل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۲

امارت میں شوکت میں عالی طریق
بہ تسخیر دلہا شفیق و خلیق

ہنر سنج و دقاق و معنی شناس
سخن کے سخنداں کا ہے جس کو پاس

شرف جس سے تدریس کو ہے ملا
دیا جس نے تعلیم کر مرتبا

ز بس ہے سب آگاہ علم و کمال
دقایق میں ہے ریختے کے مثال

کہیں کیوں نہ ہم اس کو طوطی مقال
کہ ہندی زبان کا ہے صاحب کمال

حق اس کے تئیں نت سلامت رکھے
سلامت رکھے با کرامت رکھے

کپتان روبک ''ہندوستانی لغت،، کی تدوین میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح ممد و معاون تھے ۔ بطور خود بھی انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں ۔ ان میں ایک ''لغت جہاز رانی،، ہے ۔ اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو میں جمع کئے گئے ہیں اور ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی ذخیرہ کثیر ہے جو انگریز کمانڈروں کو میدان جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کارآمد ہو سکتے ہیں ۔ پھر اردو کی قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی اس کے ساتھ میں بطور ضمیمہ شریک کیا ۔ اس مفید لغت کی پہلی اشاعت کلکتہ سے ۱۸۱۱ء میں ہوئی ؛

وہ چار گلشن لکھ چکے تھے - اور اس کا ایک نسخہ انہوں نے کپتان ٹیلر ۱ کو پیش کیا تھا - ہو سکتا ہے اسی تالیف کی وجہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۳

دو سال بعد دوسرا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا - کپتان روبک کی دوسری کتاب ''ترجمان ہندوستانی'' (ہندوستانی انٹرپریٹر) ہے - اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل مندرج ہیں - یہ کتاب پہلے لندن سے ۱۸۲۴ء میں اور پھر پیرس و لندن سے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی تھیں - اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے - کپتان روبک نے ان کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی ایک مبسوط تاریخ بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے - (سید محمد ارباب نثر اردو لاہور ص ۳۴ - ۳۶)

۱ - کپتان جوزف ٹیلر بھی اردو زبان کے دلدادہ اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے پروفیسر تھے - انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ اور کپتان روبک کی طرح ایک بسیط اردو انگریزی لغت مرتب کی ہے - ابتداًء اپنے ذاتی استعمال کے لئے بطور فرہنگ تیار کی تھی - پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ایم، ڈی کی مدد سے اس کو باظابطہ مرتب و شائع کیا - ڈاکٹر ہنٹر بھی کالج میں ملازم اور اردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے - طپش نے ان کی بھی مدح کی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں :

چل اے خامہ کالج کی توصیف کر
ہوئے مجتمع جس میں اہل ہنر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۵ پر

سے انھیں کالج میں ملازمت ملی ہو ۔ اس بات کا صحیح علم نہیں ہوتا کہ بینی نارائن کب تک فورٹ ولیم کالج میں رہے اور کب ان کا انتقال ہوا ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۳

فصاحت بلاغت کا ہے جو مقام
جو ہے تربیت گاہ ہر خاص و عام

رہے ڈاکٹر ہنٹر اس میں سدا
ہر اک اہل حاجت کا حاجت روا

تنعم، تمکن، ترحم، کرم
عیاں اس کے سیما پہ ہے دمبدم

ہے وابستہ اس سے ہر اہل سخن
کہاں ایسے ہوتے ہیں آگاہ فن

شرف اس نے ہندی زباں کو دیا
دیا نظم اردو کو یہ مرتبا

ترقی سب اس کی اسی سے ہوئی
ہوئی قدر اس سے تصانیف کی

کپتان ٹیلر کی لغت بھی نہایت کارآمد ہے ۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع ہوا تھا ۔ پھر ولیم کارمیکائیل اسمتھ نے اس کی نظر ثانی کر کے ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۲۰ء میں شائع کیا تھا ۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر دونوں نے اردو نثر نویسوں کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ ان ہی اردو پسند انگریزوں کی بدولت فورٹ ولیم کالج قائم رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتا رہا (سید محمد ۔ ارباب نثر اردو ۔ صفحہ ۳۶-۳۷)

بینی نارائن جہان مندرجہ ذیل تین کتابوں کے مؤلف ہیں :

(۱) چار گلشن

(۲) دیوان جہان

(۳) تنبیہ الغافلین

چار گلشن بینی نارائن جہان کی پہلی ادبی تالیف ہے ۔ یہ کتاب انہوں نے کلکتہ کے دوران قیام میں لکھی ۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۱ء ہے ۔ یہ کہانی ان کے حافظے میں عرصے سے محفوظ تھی ۔ ایک دن انہوں نے اس کو منشی امام بخش صاحب کے سامنے بیان کیا ۔ منشی صاحب نے اس کو قلم بند کرنے کی طرف توجہ دلائی ۔ چنانچہ بینی نارائن جہان نے ان کے اصرار پر اس کو اردو زبان کا جامہ پہنایا ۔ اور انہیں کی فرمائش پر اس کا ایک نسخہ کپتان ٹیلر کو پیش کیا ۔ اس کی تفصیل بینی نارائن نے خود اس کتاب کے شروع میں بیان کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''اب یہ ذرۂ بےمقدار، عاصی، گنہ‌گار، بندہ بینی نارائن ابن رائے شودرشٹ نارائن نبیرۂ مہاراجہ لچھی نارائن مرحوم قوم کھتری مہتہ، ساکن دارالسطنت لاہور جو بیچ سال ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری کے عہد میں نواب معلی القاب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر کے ہمراہ رکاب برادر صاحب و قبلہ خداوند نعمت رائے کھیم نارائن صاحب دام اقبالہ کے، کہ بہ عہدۂ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی خان بہادر دام اقبالہ کے بیچ شہر لطافت بھر کلکتہ کے آئے تھے، وارد ہوا ۔ اس بات کو دس برس کا عرصہ ہوا ہو گا کہ حالت بیکاری میں گرفتار ہے اور

اب که سنه ایک هزار اور دو سو پچیس هجری هیں، عهد دولت میں نواب مستطاب، گردوں رکاب، مہر سپہر دولت و بختیاری، ماه تابان اوج حشمت و کامگاری، دوست پرور، دشمن گداز، ظالم سوز، غریب نواز، مشیر خاص الخاص بادشاه کیواں بارگاه انگستان، زبدۂ نوئینان عظیم الشان، گورنر جنرل اشرف الامراء لارڈ منٹو صاحب بہادر دام اقباله کے ایک دن اس کہانی کو، که بہت دنوں سے اس گنہگار کو یاد تھی، برسبیل مذکور کے روبرو منشی صاحب مہربان معدن لطف و احسان منشی امام بخش صاحب کے بیان کیا ۔

منشی صاحب ممدوح اس کہانی کے سننے سے نہایت محظوظ ہوئے اور بضد ہو کے اس عاصی کو فرمایا که ”اس قصۂ لطیف اور کہانی نادر کو قلم زبان سے زبان قلم میں لائیے“ اور زبان هندی میں اوپر صفحۂ کاغذ کے لکھئیے ۔ اور جناب مستطاب میں صاحب والا مناقب یعنی کپتان ٹیلر صاحب دام دولته کے گذرانیے که اگر ان کو جان سخن کہئیے تو بجا ہے بلکه جان سخن کہنا سزا ہے ۔ اس کے سننے سے وه جناب محظوظ هوویں ۔ اور به سبب اس قصے کے نام آپ کا بھی ورد زبان رہے“

سو اس عاصی نے بموجب فرمانے منشی صاحب موصوف کے، جو که عقل ناقص میں آیا، قلم زبان سے زبان قلم میں حوالے کیا ۔ امید حضور فیض گنجور سے اس جناب کے، که قدردان اهل سخن و فیض رساں زمین و زمن ہے، یه ہے که اس نذر حقیر کو، نظر قبول سے سرفراز فرماویں، اور چشمداشت سامعان روزگار اور منشیان عالی وقار سے یه ہے که جو کوئی سہو اور خطا، کیا عبارت میں اور کیا بیچ کتابت کے، اس کہانی کے نظر آوے، از روئے اپنی

بزرگی کے قلم اصلاح سے قصور نہ کریں ۔ اور بہ سبب اس قصۂ رنگین کے اس مور ضعیف کو بھی یاد فرماویں۱،، ۔

روبک کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو پسند کیا گیا ۔ یہ کتاب کالج کے کتب خانے میں داخل کی گئی اور بینی نارائن جہاں کو اس پر انعام بھی ملا۲ ۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہی کتاب فورٹ ولیم کالج میں ان کی ملازمت کا وسیلہ بنی ہو ۔

بینی نارائن نے اس کہانی کو نہایت محنت سے، اس اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ ضرور پسند کی جائے گی، اور جو شخص بھی اس کو سنے یا پڑھے گا اس کی داد ضرور دے گا ۔ کتاب کے آخر میں چند اشعار کی ایک نظم ہے جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے، لکھتے ہیں ۔

کہانی جو فرخندہ کی میں لکھی
غلط سمجھیو مت یہ ہے سب سہی (۳)

بہت خون دل اس میں کھایا ہے میں
مزہ خوب سا اس میں پایا ہے میں

رکھا چار گلشن جو میں اس کا نام
رہے گی خزاں دور اس سے مدام

سنے جو کوئی اس کو کیجو یقین
کرے گا مصنف کو بس آفرین

---

۱ - بینی نارائن جہاں ۔ چار گلشن : قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ۔ ورق ۱-۳

۲ - Roebuck : Annals of the College of Fort William - p. 339

بلوم ہارٹ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ۔ ص ۳۱۹

۳ - صحیح

کہانی ہوئی اب یہاں سے تمام
بہ حق محمد علیہ السلام۱

کریم الدین نے اپنے تذکرے میں چار گلشن کی تالیف اور اس کے قلمی نسخوں کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

''ایک اور کتاب جو بینی نارائن نے لکھی ہے وہ قصہ شاہ درویش کا ہے، جس کا مضمون وہی ہے جو فارسی قصۂ نظم ہلالی میں ہے ۲۔ اور اس کا بھی نام یہی ہے۔ ولسن صاحب کے پاس ہے۔ ایک قلمی جلد نستعلیق حرف چو ورق جلد میں ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں بینی نارائن کی پہلی ہے۔ تصنیف فارسی میں ہے۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے بنام چار گلشن کے۔ اس کتاب کا ذکر روبک صاحب نے فورٹ ولیم کے مدرسے کی رپورٹ میں درمیان صفحہ ۳۴۹ کے لکھا ہے۔ اس کتاب کی قلمی جلد فورٹ ولیم کے مدرسے کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور حال میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے۔ یہ کتاب بہت

۱ - بینی نارائن جہاں۔ چار گلشن، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن۔ ورق ۹۰

۲ - گارسان دی تاسی نے بھی چار گلشن کو ہلالی کے قصے سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن بلوم ہارٹ نے یہ لکھا ہے کہ اس داستان کا ہلالی کے فارسی قصے شاہ درویش سے کوئی تعلق نہیں گارسان دی تاس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔
(بلوم ہارٹ۔ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ص ۳۱۹)

دلچسپ ہے،، - ۱

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چار گلشن کی ایک جلد فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں داخل کی گئی تھی اور بعد میں اس کو ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں منتقل کردیا گیا تھا ۔ یہ نسخہ اب نایاب ہے ۔ کیونکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں موجود نہیں ہے ۔ ہوسکتا ہے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں اب بھی موجود ہو ۔ ولسن صاحب کے پاس اس کا جو قلمی نسخہ تھا، وہ کسی طرح ان کے ساتھ لندن پہنچا ۔ برٹش میوزیم لندن نے اس کو مسٹر ولسن سے ۱۲ جنوری ۱۸۶۱ء کو خریدا ۔ اور اب یہ نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرق کے کتب خانے کی زینت ہے ۔ یہ کتاب کبھی شائع نہیں ہوئی ۔ اب یہ پہلی بار شائع کی جارہی ہے ۔

چار گلشن کے ماخذ کا صحیح علم نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے، گارساں دی تاسی اور کریم الدین نے اس داستان کو ہلالی کے فارسی قصے ''شاہ درویش،، سے ماخوذ بتایا ہے ۲، بلوم ہارٹ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ہلالی کے قصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔۳ اور بلوم ہارٹ کا خیال صحیح ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔

---

۱ - کریم الدین ۔ طبقات شعرائے ہند ۔ صفحہ ۳۱۰

۲ - گارساں دی تاسی ۔ تاریخ ادب ہندوستانی ۔ ص ۱۱۶
کریم الدین ۔ طبقات شعرائے ہند ۔ ص ۳۱۰

۳ - بلوم ہارٹ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن ۔ ص ۳۱۹

کہ بینی نارائن جہاں نے اس کہانی کو فارسی کی کسی خاص داستان کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا ۔ کسی فارسی داستان کا ترجمہ بھی نہیں کیا ۔ اس قسم کی کہانیاں اس زمانے میں بہت عام تھیں ۔ بینی نارائن نے اس کہانی کو سنا، اور جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، عرصے تک اپنے حافظے میں محفوظ رکھا ۔ بالآخر منشی امام بخش کی فرمائش پر اس کو قلم بند کیا[۱] ۔

سید محمد نے لکھا ہے :

''بینی نارائن کی یہ تالیف بہ حیثیت قصہ نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک قدیم نثری کتاب ہونے کے ضرور قابل قدر ہے ۔ باغ و بہار باغ اردو، آرائش محفل کی طرح یہ بھی اردو ابتدائی کتب نثر میں ہے، اور تاریخ ادبیات اردو میں اس سلسلے کی کڑی ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے[۲]''

سید محمد کو چار گلشن کے مطالعے کا موقع نہیں ملا ۔ اگر یہ کتاب ان کی نظر سے گذری ہوتی تو یقیناً وہ اس کی کہانی کے بارے میں بھی اچھی رائے قائم کرتے ۔

حقیقت یہ ہے کہ چار گلشن کہانی کی حیثیت سے بھی دلچسپ ہے اور اردو کی قدیم نثری کتاب کی حیثیت سے بھی ایک قابل قدر اور منفرد تالیف ہے ۔

---

۱ - بینی نارائن جہاں۔ دیباچۂ چار گلشن، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ۔ ورق ۲

۲ - سید محمد : ارباب نثر اردو (لاہور) ص۲۵۵

بینی نارائن جہاں کی دوسری کتاب دیوان جہان ہے ۔ یہ کتاب بھی انہوں نے کلکتہ کے دوران قیام میں لکھی ۔ اس کی تالیف کا سبب بینی نارائن نے یہ بیان کیا ہے کہ جب سید حیدر بخش حیدری نے ان کی زبوں حالی پر ترس کھا کر ٹامس روبک سے انہیں ملایا تو انہوں نے جہاں سے اس قسم کا تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ چنانچہ انہوں نے روبک کی فرمائش پر اس کو لکھنا شروع کیا، اور تھوڑے عرصے میں اس کو مکمل کر لیا ۔

کیا ارشاد یوں اس۱ نے کرم سے
تجھے جو لطف کی ہے چشم ہم سے

تو کر شعر و غزل کتنے فراہم
کریں اس کے صلہ کا فکر تاہم

ہوا یہ بات سنتے ہی میں دل شاد
بجا لایا کیا تھا جو کہ ارشاد

تلاش و سعی تب کر کے فراواں
جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں

انہوں کے جمع کر اشعار یکسر
سوا ان کے جو تھے نامی سخنور

انہوں کی بھی غزل اور شعر لکھے
بہ ترتیب و بآئیں جمع کر کے

خدا کے فضل سے دے اس کو انجام
میں دیوان جہاں اس کا رکھا نام۲

۱ - ٹامس روبک

۲ - بینی نارائن جہاں: دیوان جہاں: قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن - ورق ۳

جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہے یہ کتاب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے ۔ اس تذکرے کو بینی نارائن نے ۱۸۱۲ء میں لکھا۔ بلوم ہارٹ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غالباً یہ تذکرہ ۱۸۱۳ء میں لکھا گیا ہوگا۱۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایشیاٹک سوسائیٹی کے کتب خانے میں دیوان جہاں کا جو نسخہ ہے اس کے آخر میں یہ عبارت ملتی ہے :

''تمام شد بتاریخ سی ام ماہ ستمبر ۱۸۱۲ء بہ توفیق اللہ۲''۔

اس عبارت کو دیکھنے کے بعد اس خیال میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ دیوان جہاں ۱۸۱۲ء میں مکمل ہو گیا تھا ۔ اسپرنگر نے بھی اس کا سنہ تالیف یہی لکھا ہے۳ اور یہی صحیح ہے ۔ گارساں دی تاسی نے اس کا سنہ تالیف ۱۸۱۳ء لکھا ہے۴ ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کی تاریخ تالیف ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء بتائی ہے مگر خود مولف تذکرہ نے اس کی تاریخ اختتام ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۳ء لکھی ہے ۔ غالباً اس کی تالیف ۱۲۲۷ھ میں شروع ہوئی۔

---

۱ ۔ بلوم ہارٹ : فہرست مخطوطات برٹش میوزیم لندن۔

۲ ۔ بینی نارائن جہاں ۔ دیوان جہاں قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی (مرتبہ کلیم الدین احمد) ورق ۱۷۸ ۔

۳ ۔ اسپرنگر ۔ فہرست مخطوطات اودھ ص ۱۷۸ ۔

۴ ۔ گارساں دی تاسی : تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی (فرانسیسی) ص ۱۱۶ ۔

اور دو سال میں اتمام کو پہنچی،، - ۱

سید محمد کی نظر سے ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ نہیں گزرا اسی لئے قیاس آرائی میں ان سے یہ غلطی ہوئی - دیوان جہاں ستمبر ۱۸۱۲ء سے قبل ہی مکمل ہو گیا تھا -

دیوان جہاں میں اردو کے ایک سو پچیس شاعروں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے - اور یہ اختصار اس میں اس حد تک پایا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اشعار کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے - اور جیسا کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے اس کی کوئی خاص ادبی اور تاریخی اہمیت نہیں ہے - کیونکہ اس میں شاعروں کے حالات نہ ہونے کے برابر ہیں اور تاریخوں کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا -

اس وقت دنیا میں تذکرۂ دیوان جہاں کے صرف دو قلمی نسخے ہیں - ایک تو برٹش میوزیم لندن کے شعبۂ مشرق کے کتب خانے میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں - میوزیم کا نسخہ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں جلی لکھا ہوا ہے - اس پر تاریخ تالیف اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے - ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا - لیکن کلیم الدین احمد نے اس کو مرتب کر کے پٹنہ سے شائع کر دیا ہے - اس میں قلمی نسخے کے پہلے اور آخری صفحات کی تصویریں بھی دی ہیں - ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا، اور جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا -

---

۱ - سید محمد: ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۵۵ -

گارساں دی تاسی اس تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں :

''تذکرۂ جہاں ان چھ تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے اپنی تاریخ میں کام لیا ہے ۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ان چھ تذکروں میں سے ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے ہیں ۔ اس تالیف کا نام دیوان جہاں ہے جس میں مؤلف کے تخلص کا اشارہ ہے ۔ بعض اوقات جہاں کا لفظ استعارے کے طور پر ہندوستان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ جو کچھ میں پہلے اپنی تاریخ میں اس کتاب کے متعلق جو ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) کی تالیف ہے، نیز اس کے مؤلف کے متعلق لکھ چکا ہوں، اس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا ۔ مولف اگرچہ ہندو ہے جو اس کے نام بینی نارائن سے ظاہر ہے مگر کتاب اس نے مسلمانوں کی زبان میں لکھی ہے ۔ نئی اطلاع مجھے بینی نارائن جہان کے متعلق یہ ملی ہے کہ وہ قوم کا کائستھ تھا اور بقول بعض دہلی کا رہنے والا اور بقول بعض لکھنؤ کا باشندہ تھا ۱ ۔ اس کے باپ کا نام مدرشٹ نرائن اور دادا کا نام لکشمی نارائن تھا ۔ دیوان جہان کو تذکرہ نہیں بلکہ مجموعہ انتخابات کہنا چاہئیے ۔ اس میں کوئی ایک سو پچاس شعراء کا تذکرہ ہے ۔ انتخابات بہت اچھے ہیں مگر اقتباسات بہت طویل ہیں'' ۔ ۲

---

۱ ۔ بینی نارائن جہاں نے خود اپنے آپ کو مہتہ کھتری لکھا ہے ۔ اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے ۔ لیکن یہ لوگ ملازمت کے سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ میں بھی رہے ۔ گرساں کی معلومات صحیح نہیں ہیں ۔

۲ ۔ گارساں دی تاسی : خطبات (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء) ص ۸۹—۹۰ ۔

اور دو سال میں اتمام کو پہنچی،، - ۱

سید محمد کی نظر سے ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ نہیں گزرا اسی لئے قیاس آرائی میں ان سے یہ غلطی ہوئی - دیوان جہاں ستمبر ۱۸۱۲ء سے قبل ہی مکمل ہو گیا تھا -

دیوان جہاں میں اردو کے ایک سو بچیس شاعروں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے - اور یہ اختصار اس میں اس حد تک پایا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اشعار کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے - اور جیسا کہ بلوم ہارٹ نے لکھا ہے اس کی کوئی خاص ادبی اور تاریخی اہمیت نہیں ہے - کیونکہ اس میں شاعروں کے حالات نہ ہونے کے برابر ہیں اور تاریخوں کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا -

اس وقت دنیا میں تذکرۂ دیوان جہاں کے صرف دو قلمی نسخے ہیں - ایک تو برٹش میوزیم لندن کے شعبۂ مشرق کے کتب خانے میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں - میوزیم کا نسخہ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں جلی لکھا ہوا ہے - اس پر تاریخ تالیف اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے - ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا - لیکن کلیم الدین احمد نے اس کو مرتب کر کے پٹنہ سے شائع کر دیا ہے - اس میں قلمی نسخے کے پہلے اور آخری صفحات کی تصویریں بھی دی ہیں - ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے کتب خانے میں تھا، اور جو بعد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا -

۱ - سید محمد : ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۲۵ -

گارساں دی تاسی اس تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں :

''تذکرۂ جہاں ان چھ تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے اپنی تاریخ میں کام لیا ہے - اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ان چھ تذکروں میں سے ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے ہیں - اس تالیف کا نام دیوان جہاں ہے جس میں مؤلف کے تخلص کا اشارہ ہے - بعض اوقات جہاں کا لفظ استعارے کے طور پر ہندوستان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے - جو کچھ میں پہلے اپنی تاریخ میں اس کتاب کے متعلق جو ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) کی تالیف ہے، نیز اس کے مؤلف کے متعلق لکھ چکا ہوں، اس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا- مولف اگرچہ ہندو ہے جو اس کے نام بینی نارائن سے ظاہر ہے مگر کتاب اس نے مسلمانوں کی زبان میں لکھی ہے - نئی اطلاع مجھے بینی نارائن جہاں کے متعلق یہ ملی ہے کہ وہ قوم کا کائستھ تھا اور بقول بعض دہلی کا رہنے والا اور بقول بعض لکھنؤ کا باشندہ تھا[1] - اس کے باپ کا نام مدرشٹ نرائن اور دادا کا نام لکشمی نارائن تھا - دیوان جہان کو تذکرہ نہیں بلکہ مجموعہ انتخابات کہنا چاہئیے - اس میں کوئی ایک سو پچاس شعراء کا تذکرہ ہے - انتخابات بہت اچھے ہیں مگر اقتباسات بہت طویل ہیں'' - ۲

۱ - بینی نارائن جہاں نے خود اپنے آپ کو مہتہ کھتری لکھا ہے - اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کے آبا و اجداد لاہور کے رہنے والے تھے - لیکن یہ لوگ ملازمت کے سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ میں بس گئے - گارساں کی معلومات صحیح نہیں ہیں -

۲ - گارساں دی تاسی : خطبات (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء) ص ۸۹—۹۰ -

اس تذکرے کا انداز مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا:

''آفتاب تخلص، مہر سپہر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ، جنت آرام گاہ ابن عالمگیر ثانی کا۔ یہ تصنیف خاص ہے''۔ ۱

''آبرو تخلص، عرف شاہ مبارک آبرو، نام نجم الدین علی خان محمد غوث گوالیاری کے پوتے تھے۔ یہ ان سے ہے''۔ ۲

''افسوس تخلص، نام میر شیر علی، مظفر خاں کے بیٹے۔ پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح لی۔ بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیراں کے۔ نارنول کے رہنے والے۔ کلکتے میں رحلت کی''۔ ۳

''انشاء تخلص، نام میر انشاء اللہ۔ میر ماشاء اللہ کے بیٹے کہ فن حکمت میں بوعلی سینا۔ اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں''۔ ۴

''حیدری تخلص، میر حیدر بخش، دہلی کے رہنے والے۔ بالفعل مسند حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی ہے۔ اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں''۔ ۵

---

۱ - بینی نارائن جہاں دیوان جہاں: (مرتبہ کلیم الدین احمد) ص ۵ -

۲ - ایضاً ص ۱۳ -

۳ - ایضاً ص ۲۴ -

۴ - ایضاً ص ۳۰ -

۵ - ایضاً ص ۹۹ -

"نام ان کا معلوم نہ ہوا کہ کیا تھا - یہ ان سے ہے"۱

"رند تخلص، نام رائے کھیم نارائن - مہاراجہ لچھمی نارائن کے پوتے - عمدہ روزگار رہے - دہلی کے رہنے والے اور اب ہوگلی تشریف رکھتے ہیں - اور یہ خاکسار بھی چھوٹا بھائی انہیں کا ہے" - ۲

بینی نارائن جہاں کی تیسری تالیف تنبیہ الغافلین ہے - یہ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے - بینی نارائن جہاں نے ۱۲۴۵ بنگلی ۱۸۳۹ء میں اس کو اردو کا جامہ پہنایا - اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں ہے - اس کا نمبر ہے ۳۱۶۳-پی اور یہ ۱۱۸ اوراق پر مشتمل ہے۳ - اس نسخے میں کل بیس باب ہیں - اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے -

"اچھی اچھی صفتیں اور تعریفیں اللہ تعالے کو ثابت ہیں کہ خدا تعالے پیدا کرنے والا اور پالنے والا تمام خلق و عالم کا ہے، اور درود نامحدود اس کے پیغمبر کے اوپر" - ۴ اور اس عبارت پر ختم ہوتا ہے :

"حق تعالے کے فضل و کرم سے آٹھویں تاریخ اگہن مہینے کی سنہ بارہ سو پینتالیس بنگلہ میں سنیچر کے دن دوپہر ایک

---

۱ - بینی نارائن جہاں : دیوان جہاں ص ۱۰۷

۲ ایضاً ص ۱۳۰

۳ - بلوم ہارٹ - فہرست مخطوطات انڈیا آفس اے لندن ص ۷

۴ - بینی نارائن جہاں : تنبیہ الغافلین : قلمی نسخہ انڈیا آفس ورق ۱

گھڑی کے سمنے تمام ہوئی''۔ ۱

میں نے خود تنبیہ الغافلین کے اس قلمی نسخے کو نہیں دیکھا۔ یہ عبارتیں بلوم ھارٹ کی فہرست مخطوطات سے یہاں نقل کی گئی ھیں۔ سید محمد نے اس کا اقتباس اپنی کتاب میں دیا ھے۔ وہ یہاں نقل کیا جاتا ھے:

''بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں ایک بڑا دانا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا 'اے بھائیو! ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی تم دونوں ہی بانٹ لیجو۔ یہ بات سن کے وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ھی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گزران کرنے لگے اور وہ بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو! جیسے ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ھی اب مجھ کو دو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا ھوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کر قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ھے فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ھیں تو نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے'' (تنبیہ الغافلین قلمی نسخہ انڈیا آفس) ۲

---

۱ ۔ ایضاً ۔ ورق ۱۸ : (بحوالہ بلوم ھارٹ)

۲ ۔ سید محمد ۔ ارباب نثر اردو (لاھور) ص ۲۵۹

بینی نارائن جہان کی یہ کتاب طبع نہیں ہوئی۔

یوں تنبیہ الغافلین کے نام سے ایک کتاب بار بار شائع ہوئی ہے لیکن یہ بینی نارائن کی کتاب سے مختلف ہے۔ اس میں پچیس باب ہیں۔ بینی نارائن کی کتاب میں کل بیس باب تھے۔

سید محمد لکھتے ہیں :

''آج کل تنبیہ الغافلین اردو کے جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں وہ یقیناً بینی نارائن کے نہیں ہیں۔ بینی نارائن کے ترجمے میں صرف ۲۰ ابواب ہیں۔ اور موجودہ نسخوں میں ۲۵ ابواب پائے جاتے ہیں۔ مطبوعہ ترجمہ سید محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی متحدہ مساعی کا نتیجہ ہے۔

ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز کی تصحیح سے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی بینی نارائن کے ترجمے کا ذکر نہیں۔ البتہ یہ فقرہ موجود ہے۔ 'اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو، جس میں ۲۰ باب تھے، فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بینی نرائن ہی کا ہے[۱]''۔

۱ - سید محمد : ارباب نثر اردو (لاہور) ص ۲۶۹ -

تنبیہ الغافلین کے مطبوعہ نسخے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''اچھی اچھی تعریفیں اور صفتیں اللہ تعالی کو ثابت ہوں جو پیدا کرنے والا اور پالنے والا تمام خلق اور عالم کا ہے۔ اور صلوۃ اور درود اس کے پیغمبروں پر خصوصاً محمد مصطفی احمد مجتبی، خاتم انبیا، سرور اصفیا، ہدایت کرنے والے گمراہوں کے، بخشانے والے گنہ گاروں کے، صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر اور ان کی اولاد اور یاروں پر اور تمامی پرہیزگاروں اور نیک کاروں پر۔ بعد حمد و نعت کے لکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں اور رسول اللہ کی حدیثوں اور مشائخوں کے اچھے کلاموں سے۔ اور اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے۔ اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے، اس کو جس میں بیس باب تھے، فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں۔ حاجی سید عبداللہ صاحب نے اس کی آیتیں اور حدیثیں صحیح کر کے، بلکہ کچھ اور بھی اپنی طرف سے زیادہ کر کے، عربی خط سے بیس باب میں چھپوایا تھا۔ ان دنوں عاصی سید محمد اور محمد طیب اور امین الدین اور محمد تقی خیر خواہان خلق اللہ نے جب دیکھا کہ لوگوں کی خواہش اس کتاب کی طرف عربی خط کے سبب کم ہے۔ اس واسطے یہ عاصیوں نے اعانت اور تصحیح سے جناب حضرت مولوی عبدالعزیز صاحب اور جناب مولوی امیرالدین صاحب کے، اس کتاب کو جو سبب ہدایت گمراہوں کے اور باعث رہنمائی فاسقوں کی ہے، کچھ اور بھی اپنی طرف سے مسائل زیادہ کر کے پچیس باب اور خاتمہ میں فارسی خط سے

سے واسطے فائدہ عوام کے چھپوایا،، - ۱

اس عبارت کا ابتدائی حصہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کی بنیاد بینی نارائن جہاں ہی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ یہ عبارت قلمی نسخے کی عبارت سے ملتی جلتی ہے - اس میں یقیناً ترمیم و اضافہ ہوتا رہا اور یہ اپنی مقبولیت کے باعث بار بار چھپ کر شائع ہوتی رہی -

گارساں دی تاسی نے اپنے ایک خطبے میں یہ لکھا ہے کہ بینی نارائن جہاں نے ایک کتاب ''قصہ جات،، کے نام سے بھی لکھی تھی - اس میں قصے کہانیاں تھیں - ۲ اس کتاب کا کوئی نسخہ باوجود کوشش کے راقم کو نہیں ملا - فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی لکھی ہوئی بعض مختصر کہانیاں انگلستان کے مختلف کتب خانوں میں ملتی ضرور ہیں لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بینی نارائن کی لکھی ہوئی ہیں - اگر یہ کتاب مل گئی تو یقیناً اردو افسانے کی روایت میں حیدری کی مختصر کہانیوں کی طرح ایک نئی دریافت ہو گی -

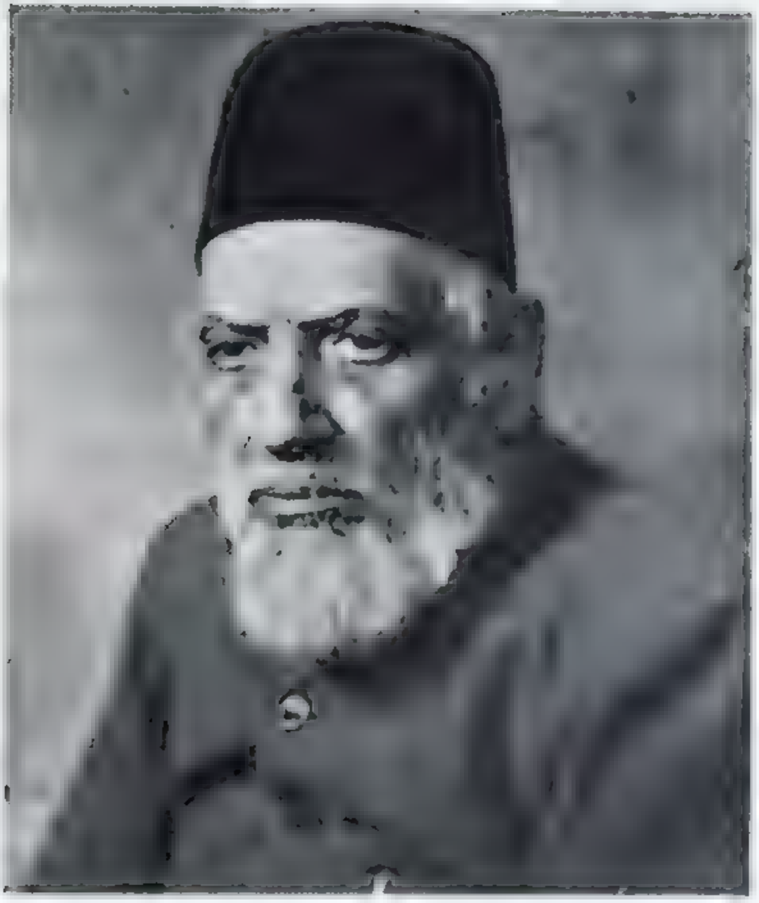
بینی نارائن کی ان تصانیف سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھے خاصے نثرنگار تھے - اور انہوں نے ایک نثرنگار کی حیثیت سے اپنے زمانے ہی میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا - ان کی تمام تالیفات اپنی اپنی جگہ اہم ہیں - لیکن ان میں سے کوئی چار گلشن

۱ - تنبیہ الغافلین (مطبوعہ مطبع دارالسلام دہلی - طبع دوہم ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۸ء) ص ۲-۳

۲ - گارساں دی تاسی : خطبات (انجمن ترقی اردو) ص ۹۰

کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ ان کی یہ کتاب کہانی اور اسلوب دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے ۔ اور اسی کی بدولت اردو نثر کی روایت کے افق پر بینی نارائن جہاں کے نام کا ستارہ ہمیشہ ہمیشہ چمکتا رہے گا ۔

(مئی ۱۹٦۷)



شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

آب حیات اور مولانا حالی

جب حضرت شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے اردو لٹریچر کی مشہور و معروف کتاب ''آب حیات،، پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں شائع فرمائی جو اردو شعراء کا نہایت حسین و جمیل اور بڑا فصیح و بلیغ تذکرہ ہے ۔ مگر اس میں مومن خاں مومن کے حالات نہیں تھے جو اپنے زمانہ کے ایک معروف شاعر تھے اور ان کا ذکر اس تذکرۃ الشعراء میں ضرور ہونا چاہیئے تھا ۔ اس پر ہر طرف سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ آزاد نے مومن کے حالات اس کتاب میں کیوں نہیں لکھے ۔ اور پھر اس پر بڑی بڑی خیال آرائیاں بھی ہونے لگیں ۔ کسی نے اس کی کوئی وجہ لکھی اور کسی نے کوئی ۔ بعض لوگوں نے اس کے متعلق آزاد کو خطوط بھی لکھے کہ ایسا کیوں ہوا اور مومن کا ذکر کیوں قلم انداز کیا گیا ؟

اس شور و غوغا کا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ جب "آب حیات" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں مومن کے حالات موجود تھے ۔ مومن کے حالات شائع کرنے سے پہلے آزاد نے جو تمہید لکھی ہے اس سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں مومن کے حالات کیوں نہیں تھے ۔ اس کے پڑھنے سے ان تمام بدظنیوں اور بدگمانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو پہلے ایڈیشن میں مومن کے حالات شامل نہ ہونے سے لوگوں کے دلوں میں عام طور سے پیدا ہوئی تھیں اور جن کا اظہار وقتاً فوقتاً اخبارات اور رسائل اور خطوط کے ذریعہ ہوتا رہتا تھا ۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں :

"پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا ۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے ترتیب کتاب کے دنوں میں اکثر اہل وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے[1] ۔ وہاں سے جواب صاف آیا ۔ وہ خط بھی موجود ہیں (اسماعیل) مجبوراً ان کا حال قلم‌انداز کیا گیا ۔ (اس پر) دنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب جو چاہا سو کہا ۔ آزاد نے سب کی عنایتوں کو شکریہ کا دامن پھیلا کر لے لیا ۔ ذوق :

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

---

۱ ۔ مولانا آزاد اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے ۔ یہیں سے انہوں نے دھلی کے ادیبوں اور صاحب کمال حضرات کو مومن کے حالات کی فراھمی کے لئے خطوط لکھے تھے ۔ (اسماعیل)

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اشخاص جنہوں نے میرے حال پر عنایت کر کے حالات مذکورہ کی طلب و تلاش میں خطوط لکھے اور سعی ان کی ناکام رہی ، انہوں نے بھی کتاب مذکور پر ریویو لکھا ۔ مگر اصل حال نہ لکھا کچھ کا کچھ اور ہی لکھ دیا۔

میں نے اسی وقت سے دہلی اور اطراف دہلی میں ان اشخاص کو خطوط لکھنے شروع کر دئیے تھے جو خان موصوف (یعنی مومن) کے خیالات سے دل گلزار رکھتے ہیں ۔ اب طبع ثانی سے چند مہینے پہلے (پھر) تاکید و التجا کے نیازناموں کو جولانی دی ۔ (اس پر) ان ہی میں سے ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گذار ہوں بہ اتفاق احباب اور صلاح ہمدگر جزئیات احوال فراہم کر کے چند ورق مرتب کیے اور عین حالت طبع میں کہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے ایک مراسلہ کے عنایت فرمائے بلکہ اس میں کم و بیش کی بھی اجازت دی ۔ میں نے فقط بعض فقرے کم کیئے باقی اصل حال کو بجنسہ لکھ دیا ۔ آپ ہرگز دخل و تصرف نہیں کیا ۔ جو احباب پہلے شاکی تھے، امید ہے کہ اب اس فروگذاشت کو معاف فرماویں گے،، (آب حیات صفحہ ۴۳۰)

حالات زندگی شائع کرنے کے بعد جب مومن کے کلام پر تنقید و تبصرہ کی نوبت آئی تو مولانا آزاد نے اس تمہید کے ساتھ اس کو شروع کیا :

"اپنے شفیق مکرم کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ حالات مرتب کر کے عنایت فرمائے ۔ لیکن (مومن کے) کلام پر رائے نہ لکھی ۔ اور باوجود التجائے مکرر کے انکار کیا ۔ اس لئے بندۂ آزاد اپنے فہم قاصر کے

بموجب لکھتا ہے،، (آب حیات صفحہ ۴۲۹)

مولانا آزاد کی تحریر سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ کیوں مومن کے حالات آب حیت کے پہلے اڈیشن میں درج نہ ہو سکے مگر یہ سوال باقی رہ گیا کہ وہ صاحب کون تھے جن کے الطاف و کرم کی بدولت مومن کے حالات ملے اور جن کے الطاف و کرم کے آزاد شکر گزار ہیں ۔ چونکہ خود آزاد نے ان صاحب کا نام نہیں لکھا تھا اور صرف ان کے الطاف و کرم کا ذکر کیا تھا اور اس کا شکریہ ادا کیا تھا اس لئے اب لوگوں کو اس کی تلاش ہوئی کہ مومن کے حالات لکھنے والے کا نام معلوم کریں جن کا آزاد نے نہیں لکھا تھا اور صرف ان کی طرف اشارہ کر دیا تھا ۔

یہ اہم سوال بھی اس وقت پیدا ہوا کہ آزاد نے ان صاحب کا نام چھپانے میں کیا مصلحت سمجھی اور کیوں اس کا اظہار نہیں کیا؟ مگر اس کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کی ہر معاملہ کے متعلق اپنی اپنی مصلحت ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ شخص اپنی مصلحت کی وجہ بھی بیان کرے ۔

اگرچہ لوگ مولانا آزاد کے اشارہ کنایہ سے سمجھ گئے تھے کہ وہ صاحب کون ہیں اور ان کا نام کیا ہے ؟ مگر تاہم لوگ اس امر کی کھوج میں برابر لگے رہے ۔ اور آپس میں کھچڑی پکتی رہی اور لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا ۔

یہ لاوا اس وقت پھٹا جب میں نے ۱۹۳۵ء میں ''تذکرۂ حالی،، کے نام سے ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا اور اس عقدہ کے

متعلق مولانا الطاف حسین حالی کے عزیز ترین شاگرد علامہ برج موھن کیفی دھلوی کو خط لکھا ۔ ان کا جو خط لاھور سے ۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء کا لکھا ھوا میرے پاس پانی پت آیا ، اس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ ''مومن کے حالات حالی نے ھی آزاد کو بھیجے جو ''آب حیات،، کے دوسرے اڈیشن میں شامل کتاب کئے گئے ۔ ،،

اس نہایت واضح اور مستند بیان کے بعد بھی میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور ''تذکرۂ حالی،، میں اس کا ذکر نہیں کیا ۔

لیکن جب میری یہ ناچیز تالیف چھپ کر شائع ھوئی اور اھل علم کے ھاتھوں میں پہنچی تو ملک کے نہایت مشہور و معروف ادیب اور اردو کے فاضل محقق جناب مالک رام صاحب ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی نے مجھے شملہ سے ایک خط لکھا جو میں بجنسہ یہاں نقل کر رھا ھوں ۔

پولیٹکل ڈپارٹمنٹ آف انڈیا ۔ شملہ

۱۰ - مئی ۱۹۳۷ء

مکرمی جناب شیخ صاحب قبلہ ۔ آداب عرض ھے ۔

میں آپ کا تصنیف کردہ تذکرۂ حالی،، دیکھ رھا تھا جہاں آپ نے حضرت مولانائے حالی مرحوم کی تصنیفات کا ذکر کیا ھے ۔ اس میں ایک چیز کی کمی ھے اور چاھئے کہ اس کا اضافہ کر لیا جائے ۔

آپ کو معلوم ھو گا کہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے

''آب حیات،، طبع اول میں حکیم مومن مرحوم کا تذکرہ نہیں لکھا تھا ۔ جب ہر طرف سے اعتراض ہونے تو اہوں نے (اُن کے اپنے قول کے مطابق) مختلف حضرات سے حکیم صاحب مرحوم کے حالات جمع کرنے کی درخواست کی ۔ آخر انہوں نے جو حال درج کتاب کیا اور جو اب بھی ملتا ہے، وہ انہیں مولانا حالی مرحوم نے لکھ کر دیا تھا ۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے وہی الفاظ رکھے ہیں جو اصل میں لکھنے والے نے لکھے تھے اور کوئی چیز بدلی نہیں ۔ البتہ بعض مقامات سے انہوں نے مضمون حذف کر دیا ہے اور ایسے مقامات پر انہوں نے اشارہ کر دیا ہے ۔ انہوں نے مولانا حالی مرحوم کا نام نہیں لکھا لیکن یہ روایت مجھے حکیم آزاد انصاری مدظلہ نے سنائی جو حضرت مولانا حالی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ آپ چاہیں تو ان سے تصدیق فرما سکتے ہیں ۔

میں نے یہ خط لکھنے کی اس لئے جرأت کی ہے کہ آپ مولانا حالی مرحوم کے تذکرہ نگار ہیں اور آپ سے یہ واقعہ مخفی نہیں رہنا چاہئے اور جب مولانا آزاد مرحوم نے ''آب حیات،، میں لکھ دیا کہ مومن کے حالات ان کے اپنے لکھے ہوئے نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم ان کے اصلی لکھنے والے کی طرف انہیں منسوب نہ کریں اور اس کا اعلان نہ کریں ۔ والسلام بالاکرام ۔

خاکسار

مالک رام

اس واقعے کے متعلق ان دو بیرونی موقر شہادتوں کے علاوہ اندرونی طور پر یہ مضبوط شہادت بھی موجود ہے کہ خود مولانا آزاد اپنی شہرہ آفاق تالیف میں دو مرتبہ'' الطاف و کرم،، کے الفاظ کے ساتھ مولانا حالی کے نام الطاف حسین کی طرف اشارہ فرما چکے ہیں - جس کے بعد اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہئے کہ مومن کے حالات کا اصل مولف کون تھا -

(مئی ۱۹٦۷)

چاپخانہ پنجابی ادبی اکادمی، لاہور